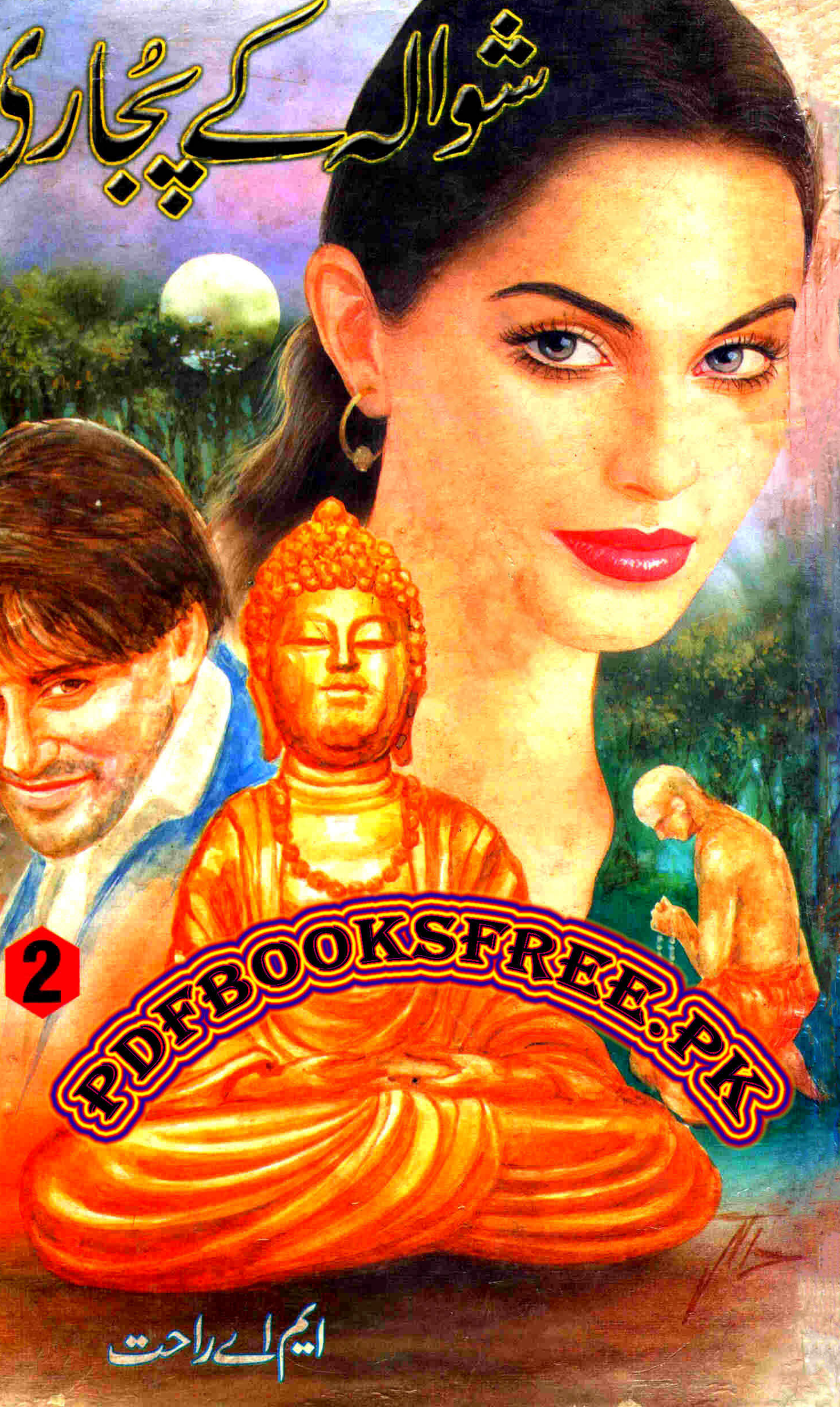

شوالہ کے پجاری
2
PDFBOOKSFREE.PK
ایم اے راحت

کچھ دیر کے بعد میں الحمرا کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ کوئی تعاقب نہیں کر رہا تو صدر دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ اندر پہنچ کر لابی میں ہر طرف نگاہ دوڑائی لیکن امینہ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ لاؤنج کی طرف جانے لگا تو ریسیپشن کاؤنٹر سے مینجر نے غور سے میری طرف دیکھا، اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آیا اور شستہ انگریزی میں کہنے لگا۔

"سر! کیا آپ کا نام مسٹر برک ہے؟"

میں ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگا پھر مسکرا کر کہا۔ "ہاں میرا نام برک ہے۔ ایم کے برک۔"

"ایک خاتون پانچویں منزل پر روم نمبر دو سو بارہ میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

"ٹھیک ہے...... بہت بہت شکریہ۔ حالانکہ میں نے ان کو لابی میں ٹھہرنے کے لئے کہا تھا۔ روم میرے ہی نام پر ہے نا؟"

"جی آپ کے نام پر ہے۔ لیکن آپ کا سامان آنے پر رجسٹرڈ کیا جائے گا۔ آیئے۔"

وہ مجھے ساتھ لے کر لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچا۔ روم نمبر دو سو بارہ کا بزر دبا دیا۔ کی ہول سے ایک آنکھ نظر آئی اور اس کے بعد دروازہ کھل گیا۔ مینجر چلنے لگا تو میں نے اسے روک کر سو ڈالر کے نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

"ممکن ہو تو ہمیں آف دی ریکارڈ ہی رکھئے۔ کوئی وزیٹر بھی نہیں آنا چاہئے۔"

مینجر نے سو ڈالر کا نوٹ دیکھا اور پھر کنپٹی کھجانے لگا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ "نہیں، یہ کسی اکاؤنٹ میں نہیں ہیں۔ ہم پیمنٹ جاتے ہوئے کریں گے۔"

"بے حد شکریہ جناب! آپ اطمینان رکھئے۔" مینجر کا رویہ بدل گیا اور وہ وہاں سے چلا گیا۔ میں دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ امینہ دروازے کے پاس ہی موجود تھی۔ اس نے دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھایا اور دونوں ہاتھ میری گردن میں حمائل کر

دیئے۔

"مائی ڈیئر برک! شکر کرو تم مجھے زندہ دیکھ رہے ہو۔"

"تم زندہ ہی رہو گی۔ شاید تم ہشمان ذکری کو ادھر سے گزرتا دیکھ کر گھبرا گئی ہو گی۔"

"تمہیں معلوم ہے؟"

"ہاں۔"

"کیسے؟"

"میں اس سے مل کر بلکہ اس کے ساتھ کافی پی کر آ رہا ہوں۔"

وہ بے اعتباری سے ہنس پڑی۔ اس نے کہا۔ "ایسا مذاق مت کرو جس پر یقین کرنا حماقت کے سوا اور کچھ نہ ہو۔"

میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "بالکل یہی بات ہے جو میں نے تم سے کہی۔"

"کیا مطلب...... میں سمجھی نہیں؟"

"وہ مجھے ہر طرح کا تعاون پیش کر چکا ہے۔ میری تمام زیادتیوں کو اس نے برداشت کرنے کا اعلان کیا ہے اور مجھے پیشکش کی ہے کہ میں اس کے ساتھ مل کر کام کروں۔"

"ممکن تو نہیں ہے۔ میں اسے جانتی ہوں۔ یا پھر یہ کہنا چاہئے کہ تم پہلے شخص ہو جس کے سامنے وہ جھکا ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، کیا وہ مجھے دھوکا دے کر کوئی جال بچھا رہا ہے میرے لئے؟"

"یقیناً ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ تم مجھے پوری بات بتاؤ۔" وہ بولی اور میں نے مختصر الفاظ میں اسے تمام واقعہ سنا دیا۔ وہ اپنی حیرت پر قابو پا چکی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"بہت بڑی رقم پیش کی ہے اس نے۔"

"مگر ایک بات سوچو ڈیئر! وہ سب کچھ کتنا ہو گا جس کے لئے وہ اتنی بڑی قربانی دے رہا ہے۔ اس کا کچھ تصور کر سکتی ہو؟"

"یقیناً، وہ کوئی بہت بڑا خزانہ ہے۔ لیکن پھر تم نے وعدہ کیوں کیا؟"

"بس پیچھا چھڑانے کے لئے۔ اب وہ مطمئن ہو کر بیٹھ جائے گا اور ہمیں اتنا وقت مل جائے گا کہ تختی محفوظ ہاتھوں میں پہنچ جائے۔"

"محفوظ ہاتھوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"جہاں اور جس کے پاس اسے ہونا چاہئے۔"

"تمہارا مطلب ہے کوئی اور پارٹی؟"

"پارٹی تو نہیں کہا جا سکتا، اپنے ہی تصرف میں سمجھو۔ لیکن میں اس پر سودے بازی نہیں کر سکتا۔"

"کل صبح اگر تم نہ پہنچے تو ہشمان پوری شدت سے تمہاری تلاش میں مصروف ہو جائے گا بلکہ تم سے زیادہ اس تختی کی تلاش میں۔"

"اس وقت تک یہ تختی کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہو گی۔ اور پھر تم مجھے نہیں جانتی ڈیئر! ہشمان ذکری کو اپنی زندگی کے بدترین دور سے گزرنا ہو گا اور اس کا صرف نام باقی رہ جائے گا۔"

ایمنہ غور سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد مجھ پر کچھ غنودگی سی سوار ہوئی اور میں پڑ کر سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو رات کے آٹھ بجے تھے۔ ایمنہ صوفے پر ٹانگیں پھیلائے بیڈ لیمپ کی روشنی میں میرا لایا ہوا رسالہ پڑھ رہی تھی۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور پھر اس نے کمرے کی تمام بتیاں روشن کر دیں۔

"بھوک لگ رہی ہے ایمنہ! کھانا کھلاؤ۔"

"میں روم سروس کو فون کرتی ہوں۔"

"اوکے۔" میں نے کہا اور باتھ روم کی جانب چل پڑا۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے ایمنہ سے کہا۔ "کیا خیال ہے، ہم باہر چلیں؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو...... کیا یہ مناسب ہو گا؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں ہے۔ نکلتے ہیں۔ ساحل سمندر وغیرہ پر چلیں گے۔ خطرہ تو آنے والی صبح کے بعد ہو گا۔"

لیکن ایمنہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئی اور ہم نے فیصلہ کیا کہ ہوٹل ہی میں چہل قدمی کر لیتے ہیں۔ ہم ہوٹل کے ٹیرس میں پہنچ گئے۔ یہاں جابجا گملوں میں پھول دار پودے اور ان کے درمیان بنچوں پر متعدد جوڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہم تھوڑی دیر تک چھت کی دیوار کے پاس کھڑے روشنیوں سے جگمگاتے ہوئے شہر اور بازار کے مناظر دیکھتے رہے۔ ہماری نگاہیں دور دور تک کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر ہم دونوں ایک گوشے میں بنچ پر بیٹھ

گئے۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے لیکن ٹیرس پر رونق کا وہی عالم تھا۔ جگہ جگہ لوگ بنچوں پر بیٹھے مشروبات سے شغل کر رہے تھے۔ بیرے آ جا رہے تھے۔ نوجوان جوڑے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہے تھے۔ رنگ برنگی روشنیوں میں ہر طرف زرق برق ملبوسات کے ساتھ خوشبوؤں کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ الحمراء، اسکندریہ کے حسن و شباب اور دولت مند ماحول کی نمائندگی کر رہا تھا جس میں قہقہے رچے ہوئے تھے۔ خوش باش اور زندگی سے بھرپور قہقہے۔ لیکن بہرحال کچھ دیر کے بعد یہ سب بھی کچھ بے اثر سے ہو گئے اور میں نے بیزاری سے کہا۔

"کیا خیال ہے، اپنے کمرے میں چلیں اینہ؟"

"ہاں...... آؤ، چلتے ہیں۔ میں بھی یہاں کے ماحول سے اکتا گئی ہوں۔"

پھر ہم دونوں اپنی جگہ سے اٹھے اور وہاں سے چل پڑے۔ ویسے اب میرے ذہن میں کچھ اور خیالات گردش کر رہے تھے۔ اسکندریہ میں میرا کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا اور اب اس کا ردعمل شروع ہونے والا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہاں میرے لئے خطرات کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ تختی جس کے حصول کے لئے میں یہاں تک آیا تھا میرے ہاتھ آ گئی تھی۔ چنانچہ مجھے اسکندریہ چھوڑ دینا چاہئے۔ جہاں تک ہیگ کا معاملہ تھا میں اس کی نئی شخصیت سے روشناس ہونے کے بعد حقیقت کی دنیا میں آ گیا تھا اور یہ اندازہ مجھے ہو گیا تھا کہ اس کی شخصیت بہت بڑی ہے۔ وہ تو بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ میں ہشمان ذکری ہی کے جال میں پھنس گیا تھا اور اسی سے مجھے نجات پانا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن بہرحال ایک بہت بڑا کام ہو گیا تھا یعنی تختی مجھے حاصل ہو گئی تھی۔ بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں جنہیں نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ البتہ اب ذرا اور مسئلہ میرے لئے مشکل ہو گیا تھا وہ تھا اینہ کا ساتھ۔ اینہ کی اور میری قربت کچھ اس قدر زیادہ ہو گئی تھی کہ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اینہ کو چھوڑ دینا میرے لئے ممکن نہ ہو اور میں اسے دھوکا دے کر یہاں سے نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے غیر معمولی طور پر خاموش دیکھا تو بولی۔

"کیا بات ہے...... کچھ پریشان ہو؟ چلو اپنے کمرے میں چل کر سوتے ہیں۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

ہم دونوں اس راہداری میں پہنچ گئے جو ہمارے کمرے کی طرف جاتی تھی۔ راہداری سنسان پڑی تھی۔ اس وقت موسم اور ماحول کچھ اس طرح کا تھا کہ زیادہ تر لوگ اپنے

کمرے بند کر کے ٹیرس پر پہنچ گئے تھے یا پھر اگر کوئی اس طرح کا آدمی ہو گا جو سکون سے رہنا چاہتا ہو گا تو وہ اس وقت اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔

آخر کار ہم اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ میں نے جیب سے چابی نکالی اور پھر چابی کو کمرے کے قفل میں گھمایا تھا کہ اچانک چمپا کے پھول کی مخصوص خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور میں چونک پڑا۔ اس وقت کچھ ایسی بے اختیاری ذہن پر سوار ہوئی تھی کہ اینہ کو بھی ایک دم سے کسی انہونی بات کا احساس ہو گیا۔ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

"خیر تو ہے...... کیا ہوا؟"

میں ابھی پوری طرح نہیں سنبھل پایا تھا کہ دور سے مجھے لکڑی کے کھڑاؤں پہن کر چلنے کی کھٹ کھٹ سنائی دینے لگی۔ اور پھر میری نگاہ اس آواز کی سمت اٹھ گئی۔ میں نے دیکھا کہ وردان سادھانی اسی طرف چلا آ رہا ہے...... میں نے بجلی کی سی تیزی سے پلٹ کر دروازے کا ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھول دیا۔ اینہ کمرے میں داخل ہونے لگی۔ پھر بولی۔ "کیا بات ہے...... بتاؤ گے نہیں؟"

"نہیں اینہ، کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میرا ایک پرستار آ رہا ہے۔ ذرا اس سے مل لوں۔"

وردان سادھانی کو دیکھ کر اس نے ہونٹ سکوڑے اور پھر اندر داخل ہو گئی۔ سادھانی آہستہ آہستہ قریب پہنچ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے مخاطب ہو میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اسے اندر لے جاؤں۔ وہ مجھ سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ وردان سادھانی بھی بے تکان اندر آ گیا تھا۔ اس نے اندر آ کر دروازہ بند کیا اور "دھم راج بودھی ستو" کہہ کر میرے قدموں میں آ گیا۔ اینہ اس عجیب و غریب انسان کی اس مضحکہ خیز حرکت کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے جھک کر وردان کا بازو تھاما اور اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"نتھا ستو۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "مہان بدھی ستو! آپ کی سپھلتا پر، آپ کی سیوا میں دھنے واد ارپن کرتا ہوں۔ آپ کی کٹھن پریکشا ختم ہوئی اور اب ہم آپ کو مہان بدھی ستو کے روپ میں دیکھنے کو بے چین ہیں۔"

"سادھانی! یہ اپنی امانت سنبھالو۔" میں نے کہا اور آگے بڑھ کر وہ تختی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ میں نے کہا۔ "سدھارتا خود بھی سمجھ سکتا ہے۔ ابھی میں اس جگہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

"مہان بدھی ستو! آپ کو اس موہ مایہ میں پڑنا نہیں چاہئے تھا۔ یہ بندھن مہا پرشوں کی مہاتما ختم کر دیتے ہیں۔ خیر ہمیں معلوم ہے کہ اس دیوی نے کسی کارن آپ کے لئے بہت بڑا بلیدان دیا ہے اور آپ کے لئے خود اس کو تیاگ کر چل دینا بڑا کٹھن ہے۔"

"کٹھن نہیں، ناممکن کہو وردان سادھانی!"

وہ میرے ان الفاظ پر مسکرا دیا اور سر جھکا کر بولا۔ "نہیں بدھی ستو! سنسار کا تمام روپ، تمام دھن آپ کے چرنوں میں ہے۔ آپ مہان شکتی کے مالک ہیں۔ لیکن شکتی کو پراپت کرنے کے لئے آپ کو گاشر برہم ضرور جانا پڑے گا جہاں مہان بھکشو مندر میں اشمبھ سدھانی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آؤں گا۔ لیکن ابھی نہیں۔ ابھی وہاں آنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ تم ایسا کرو......"

"دھم راج، ضد نہ کیجئے۔ آپ کا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ لیکن اگر آپ وہاں جا کر یہاں واپس آنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو صبح ہونے سے پہلے گاشر برہم اور پھر اس سے یہاں واپس پہنچا سکتا ہوں۔"

ایک لمحے کے لئے ایک عجیب سا احساس مجھے ہوا۔ سری لنکا کہاں اور قاہرہ کہاں لیکن یہ ہو سکتا تھا۔ میرے اب تک کے تجربات مجھے یہی بتاتے تھے۔ میں نے کہا۔

"وردان، آج نہیں، کل۔"

"جو آ گیا بدھی ستو۔ پرنتو ساودھان رہئے۔ آج رات یہاں ایک اکشماد کا سمبھو ہے۔"

میں ہنس دیا۔ اس نے جھک کر میرے پاؤں چھوئے اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا امینہ نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

"کیا باتیں کر رہے تھے تم لوگ؟ میں تو تمہاری زبان سن کر ہی پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ یہ قصہ کیا تھا؟ کیا چیز ہے یہ؟ ٹھہرو ایک منٹ، میں دروازہ بند کر دوں۔" اس نے دروازہ بند کیا اور پلٹتی ہوئی مسہری پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "پر یہ تھا کون؟ مصر میں تو فینسی ڈریس شو بھی نہیں ہوتے اور اس نے عجیب و غریب لباس پہنا ہوا تھا۔"

میں نے گہری سانس لے کر اس کے بازوؤں کو تھامتے ہوئے کہا۔ "تم اس کی پراسرار طاقت سے واقف نہیں ہو۔ یہ تختی جو میں نے اس کے حوالے کی ہے وہ ہندوستان سے اسے لینے آیا تھا۔ اور اب واپس وہاں پہنچ گیا ہو گا۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ سری لنکا کی بات کرتا ہوں میں۔"

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی تو میں نے ہنس کر اسے تکیے پر گرا دیا اور کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ یہ کیا، دنیا کا کوئی بھی فرد میری ان باتوں کو سنتا تو ہنسنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک حسین وجود، ایک مست شباب میری قربت میں موجود تھا۔ لیکن وردان سادھانی نے یہاں آ کر میرے ذہن کو متردّد کر دیا تھا اور میں چوکنا ہو گیا تھا۔

امینہ کے ساتھ میں بہت دیر تک جاگتا رہا اور وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ پھر ہم نیم غنودگی کی کیفیت میں گرفتار ہو گئے۔ رات کا کوئی ڈیڑھ بجا ہو گا کہ اچانک امینہ نے میرے بازو میں چٹکی لے کر سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ چونکہ مکمل طور پر نیند نہیں آئی تھی اس لئے میں نے بھی چونک کر ادھر دیکھا۔ امینہ نے جس طرف اشارہ کیا تھا، وہ کھڑکی تھی اور کھڑکی کا پردہ ہل رہا تھا۔ لیکن بہرحال میں غافل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے کمبل سرکا کر پائنتی کی طرف پھینکا اور تکیے کے نیچے سے ریوالور نکالا۔ پھر میں دبے پاؤں بستر سے اتر کر چلتا ہوا کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ میں کھڑکی کے بالکل سامنے نہیں آیا تھا بلکہ اس کی سائیڈ میں تھا۔ پردے کے پیچھے یقیناً کوئی موجود تھا۔ میری چھٹی حس مجھے اس کا احساس دلا رہی تھی۔

پھر اچانک ہی پردے کے پیچھے سے ایک چہرہ نمودار ہوا۔ میں نے دانت پیس کر پوری طاقت سے پستول کا دستہ اس چہرے پر مارا۔ ایک چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ کھڑکی میں ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی اور دوسرے لمحے سڑک پر کسی وزنی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ امینہ بھی برق رفتاری سے چھلانگ لگا کر میری طرف لپکی۔ میں نے پردے کی آڑ سے کھڑکی سے باہر جھانکا، فٹ پاتھ پر ایک سیاہ پوش آدمی کا جسم بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اتفاق سے پاس ہی کوئی پولیس مین بھی موجود تھا جو تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ میں نے اپنا سر اندر کر لیا۔ کھڑکی کے بائیں جانب تقریباً دو فٹ کے فاصلے پر ایک پائپ

لائن تھی جو چھت تک جا رہی تھی۔ آنے والا شاید اسی کے ذریعے اوپر چڑھ کر آیا تھا۔ میں نے ایمنہ کو کھڑکی سے پیچھے ہٹایا اور اس کا بازو پکڑ کر واپس مسہری پر آ گیا۔ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہشمان ذکری نے ہمیں ڈھونڈ نکالا۔"

میں پُر خیال انداز میں رخسار کھجانے لگا، پھر میں نے مدھم لہجے میں کہا۔ "ایسا ہی لگتا ہے ایمنہ!"

"لیکن میرا ایک اور اندازہ بھی ہے۔" وہ بولی۔ "یقیناً اس نے اس شخص کو ہمیں قتل کرنے کے لئے نہیں بھیجا ہوگا۔"

"تو پھر؟ کیا وہ ہمیں اپنے آپ سے ہوشیار کرنے آیا تھا؟"

ایمنہ نے مسکرا کر میرے سینے پر سر ٹکا دیا۔ میں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر اچانک دس یا پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور ایمنہ سہمی ہوئی نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہ...... یہ کون ہوسکتا ہے؟"

"دیکھتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ دروازہ دوبارہ بجایا گیا۔ اس مرتبہ ذرا زور سے دروازہ بجایا گیا تھا۔ بہرحال میں نے ہمت کر کے دروازہ کھولا۔ کوریڈور میں ہوٹل کا منیجر کھڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"تکلیف دینے کے لئے معذرت چاہتا ہوں مسٹر برک! لیکن حالات کچھ ایسے ہی ہیں کہ......"

"ایک منٹ رکو۔" میں نے کہا اور واپس پلٹ کر گاؤن پہنا اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ "کیا بدتمیزی ہے یہ رات کے اس وقت؟"

"پلیز...... آپ اپنی مسز کو جگائیے۔ اور مہربانی فرما کر میرے ساتھ آئیے۔"

"لیکن کیوں؟"

"آپ کی کھڑکی کے عین نیچے ایک آدمی اوپر چڑھتا ہوا مر گیا ہے۔"

"تو پھر؟"

"دیکھئے، میں نے بے شک آپ کی ہدایت کے مطابق آپ کا نام درج نہیں لیکن اگر پولیس اب اس سلسلے میں مجھے کچھ کہتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ کیا چاہتے ہو مجھ سے؟"

"دیکھئے، مہمانوں کے مفاد کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔ آپ ہم سے تعاون کیجئے۔"

"اوکے، اوکے...... رُکو یہاں۔" میں نے کہا اور واپس آ کر ایمنہ کو سمجھایا۔ اس کے کپڑے اور برقع دیتے ہوئے کہا۔

"ہم دوسرے کمرے میں چل رہے ہیں۔"

ایمنہ کو صورتحال کا صحیح طور پر اندازہ ہو چکا تھا۔ اس نے کوئی تعرض نہ کیا۔ کپڑے پہنے، پرس کندھے پر ڈالا اور ایک لفظ کہے بغیر باہر آ گئی۔ منیجر ہمیں ساتھ لئے ہوئے زینے کے پاس آیا اور ایک کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"یہاں کوئی نہیں آ سکے گا۔ کیونکہ یہ کمرہ ریزرو ہے۔ اور جس شخص کے نام پر یہ کمرہ ریزرو ہے، وہ ایک ہفتے سے پہلے یہاں نہیں آئے گا۔ البتہ آپ اس کا نام ضرور یاد رکھیں، سمجھ رہے ہیں نا آپ۔ آپ اس کمرے میں منتقل ہو جائیں۔ تاکہ اگر پولیس آپ کے کمرے کا جائزہ لے تو ہم اسے خالی قرار دے سکیں۔"

"اوہ، بہت بہت شکریہ منیجر۔"

"میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا نا جناب! کہ مہمانوں کے مفادات کا خیال رکھنا ہماری ذمے داری ہے۔ آپ دروازہ اندر سے بند کر لیجئے۔"

بہرحال ہم نے منیجر کی ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ مسہری پر بیٹھ کر ایمنہ نے آہستہ سے کہا۔ "برک! یہ سب کچھ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کیا منیجر ضرورت سے زیادہ ہمدردی کا مظاہرہ نہیں کر رہا؟ اس نے ایک طرح سے ایک مجرمانہ عمل کیا ہے۔"

"ہاں...... ایسا لگتا ہے جیسے ہماری موجودگی کی اطلاع اسی شخص نے ہشمان ذکری کو دی ہے ورنہ......"

"میری بات سنو...... پہلے تم اس کمرے کا جائزہ لو۔ کہیں ہمیں یہاں چھپا کر کسی کا شکار بنانے کی کوشش نہ کی جا رہی ہو۔"

میں ایک دم اچھل پڑا۔ واقعی بے مثال خیال تھا۔ میں نے جیب سے پستول نکالا اور جھک کر مسہری کے نیچے نظر ڈالی۔ یہاں کچھ نہیں تھا۔ باتھ روم اور کلاتھ روم کھول کر دیکھا، وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ کمرے میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں، ایک کونے میں سنگھار میز رکھا تھا جس میں قد آدم شیشہ لگا ہوا تھا۔ ترچھے زاویئے میں رکھے ہونے کے

باعث اس کے پیچھے کافی جگہ تھی۔ اتنی جگہ کہ آسانی سے دو تین آدمی چھپ سکتے تھے۔ سیٹنگ کے لحاظ سے بھی یہ زاویہ کچھ اسٹائل سے ہٹا ہوا تھا۔ عام طور سے سنگھار میز مسہری کے قریب دیوار سے لگی ہوتی ہے اور اس کے قریب صوفے سیٹ وغیرہ ہوا کرتے ہیں۔ یہ یہاں اتنے فاصلے پر کیوں ہے؟ یہ سوچتا ہوا میں آگے بڑھا اور سنگھار میز کے عقب میں نظر دوڑائی، یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ لیکن میز اور کونے کی دیوار کے درمیان ایک بڑا سا بکس رکھا ہوا تھا جو تقریباً تین فٹ اونچا اور اتنا ہی چوڑا اور پانچ فٹ لمبا تھا۔ اس بکس کی یہاں موجودگی بڑی سنسنی خیز تھی۔ اس میں بھی کچھ افراد چھپ کر بیٹھ سکتے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ بکس یہاں ہونا بے مقصد نہیں ہے۔ بہرحال پستول پر میری گرفت مضبوط تھی۔ میں نے گردن گھما کر اینہ کی طرف دیکھا، وہ بھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملتے ہی اس نے اشارہ کیا اور بولی۔

”کیا ہے......؟“

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی۔ پھر کچھ سوچ کر میں دبے پاؤں اس تک پہنچا، پھر اس کے کان پر منہ رکھ کر کہا۔ ”اس بکس میں مجھے لوگوں کے چھپنے کا شک ہے۔ میں پھر واپس جاتا ہوں۔ تم میرے اشارے پر لائٹ آف کر دینا اور پھر ایک دو منٹ توقف کر کے دوبارہ جلا دینا۔ اندر کوئی ہے تو اندھیرا ہوتے ہی نکلنے کی کوشش کرے گا۔“

اینہ نے گردن ہلائی۔ پھر مسہری سے اٹھ کر سوئچ کے قریب کھڑی ہو گئی۔ میں نے میز کے قریب جا کر اشارہ کیا اور اس نے سوئچ آف کر دیا۔ کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ ہماری نگاہیں ڈھکن پر جمی ہوئی تھیں۔ کھڑکی سے تھوڑی تھوڑی روشنی اندر آ رہی تھی۔ جس میں کمرے کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ ہماری نگاہیں کچھ لمحوں ہی میں اندھیرے سے مانوس ہو گئیں۔ اینہ بھی میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ مجھے اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا پستول دیکھ کر تعجب ہوا۔ چند منٹ اسی تامل میں گزر گئے اور پھر دفعتہً ہمارے دل دھڑکنا بند ہو گئے۔ بکس کا ڈھکن آہستہ آہستہ اوپر اٹھنا شروع ہوا تھا۔ ہم اس کے مزید کھل جانے کا انتظار کرتے رہے اور میں نے اینہ کو اشارہ کیا اور وہ پنجوں کے بل دوڑتی ہوئی سوئچ کے پاس پہنچ گئی ڈھکن آٹھ دس انچ اوپر اٹھا ہو گا کہ کمرے میں ایک دم روشنی ہو گئی۔ ڈھکن آہستہ آہستہ نیچے جانے لگا۔ اس کا رخ دیوار کی طرف تھا اس لئے اس کا چہرہ

تو نظر نہیں آ سکتا تھا۔ لیکن ایک ہاتھ جو ڈھکن تھامے ہوئے تھا، صاف نظر آ رہا تھا۔

ڈھکن بند ہوتے ہی دیوار کی طرف ایک پنسل صندوق میں سے فرش پر گری اور ڈھکن مکمل طور پر بند ہو گیا۔ پھر میں نے آہستہ آہستہ قدم بڑھائے اور صندوق کی کنڈی لگا دی۔ پھر میں نے جھک کر وہ پنسل اٹھائی جو غالباً ڈھکن کے نیچے ہوا کے لئے تھوڑی سی درز کھولنے کے علاوہ صندوق کی کنڈی کو بھی بند ہونے سے روک ہوئے تھی۔ اب جو کوئی بھی اندر تھا، پوری طرح چوہے دان میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے اینہ کو مسہری کی چادر میں سے ایک لمبی دھجی پھاڑ لینے کو کہا اور خود ڈھکن پر بیٹھ کر صندوق کے دوسرے پہلو کا جائزہ لینے لگا۔ اس طرف بھی کوئی سوراخ نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب مکمل طور پر یہ ایئر ٹائٹ ہو چکا تھا اور اس ایئر ٹائٹ قبر میں بند ہو جانے والے بدنصیب ایک دو یا تین جتنے بھی تھے، دس پندرہ منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ اینہ نے کپڑے کی اس دھجی کو بل دے کر بنائی ہوئی پانچ چھ انچ لمبی ڈوری میرے ہاتھ میں تھما دی اور میں نے ڈھکن پر بیٹھے بیٹھے صندوق کی کنڈی کو مضبوطی سے باندھ دیا۔

دو تین منٹ گزرے ہوں گے کہ بکس کے اندر ڈھکن پر ہاتھوں اور سروں سے ضربیں لگائی جانے لگیں۔ صندوق بہت مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اس کے تختے غالباً جہاز کے کیبنوں کے تختوں سے بنائے گئے تھے چنانچہ اس کے ٹوٹنے اور کھلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اندر سے طرح طرح کی بے ربط آوازیں پیدا ہونے لگیں۔ میں نے اینہ سے کہا۔

”اینہ! تم دروازے اور کھڑکیاں بند کر دو۔“

اینہ نے فوراً ہی میری اس ہدایت پر بھی عمل کیا اور میرے پاس آ کر ڈھکن پر بیٹھ گئی۔ صندوق میں تھوڑی ہی دیر بعد دھاکوں اور آوازوں سے ہنگامہ سا برپا ہوتا چلا گیا۔ لیکن پھر یہ ہنگامہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ ہم لوگ آدھے گھنٹے تک صندوق پر بیٹھے رہے اور آدھے گھنٹے میں اندر سے تمام کوششیں ختم ہو گئیں اور سکوت طاری ہو گیا۔ تب میں نے اینہ کو اشارہ کیا اور ہم صندوق سے اتر کر نیچے کھڑے ہو گئے۔ صندوق میں اب کسی کے زندہ ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بہرحال جس نے بھی یہ کوشش کی تھی اس نے ان لوگوں کے لئے اس صندوق کو تابوت ہی بنایا تھا۔

ہم اس منحوس صندوق سے اتر کر صوفوں کے پاس آئے اور گلاس میں پانی انڈیلنے

لگے۔ پانی پیتے پیتے گھٹ کر مرنے والوں کی اذیت ناک موت کے تصور سے مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ اپنے سفاکانہ فعل پر غور کرتے ہوئے رسٹ واچ پر نظر ڈالی تو تین بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔ میں نے امینہ سے کہا۔

"کیا کہتی ہو اب...... یہاں رُکیں یا نکلنے کی کوشش کریں؟"

"دیکھو، جو کچھ ہوا ہے اس میں یہ سوچنا تو بالکل حماقت ہے کہ منیجر اس سازش میں شریک نہیں تھا۔ یہاں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ لیکن بھاگ نکلنے کا کون سا راستہ ہوسکتا ہے؟"

"اگر ایک گھنٹہ اور گزر جائے تو ساڑھے چار بجے نکلنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ لیکن اچانک ہی پھر میرے ذہن میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی۔ میں نے کہا۔ "آؤ...... میرا خیال ہے منیجر سو چکا ہوگا اور کاؤنٹر پر ایک کلرک بیٹھا اونگھ رہا ہوگا۔ اس کو میں اپنی بیماری کا بہانہ کر کے فوراً ہسپتال پہنچانے کا انتظام کرنے کو کہوں گا۔ اس دوران تم مجھے بیماروں کی طرح تھامے رہنا۔ اگر کاؤنٹر کلرک کوئی گڑبڑ کرے تو اسے تھوڑی بہت رقم دے دینا۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے اور اس کے بعد ہم ٹیکسی کر کے قاہرہ کی طرف چل پڑیں گے۔"

"خیال تو اچھا ہے۔ لیکن ایک بات بتاؤ۔"

"ہاں پوچھو؟"

"اگر منیجر سے ملاقات ہوگئی تو پھر؟"

"جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ آؤ چلتے ہیں۔" میں نے کہا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ راہداری زینے کے موڑ تک خالی پڑی ہوئی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ ہم دبے پاؤں چلتے ہوئے زینے کی طرف پہنچے اور خاموشی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے پہلی منزل پر آ گئے۔ امینہ نے آگے بڑھ کر میرا بازو تھام لیا۔ کلرک دونوں بازو میز پر رکھے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے ہوئے آرام سے سو رہا تھا۔ ہم نے اپنے قدموں کی رفتار اور محتاط کر دی اور بغیر آواز پیدا کئے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پورا کاؤنٹر عبور کر گئے۔ کلرک بے خبر سو رہا تھا۔ ہم آگے بڑھے اور گھوم کر دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن دیوار کے قریب ایک پہریدار اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا، سلام کر کے بولا۔

"صاحب! ابھی تو سیر کا وقت نہیں ہوا۔"

"...... انہیں ہسپتال لے جانا چاہتی ہوں

اچھا ہوا تم مل گئے۔ ذرا مہربانی کر کے جلدی سے ٹیکسی لا دو۔"

پہرے دار نے گہری نگاہوں سے میرا جائزہ لیا۔ میں نے اپنے چہرے پر نقاہت کے آثار پیدا کر لئے۔ وہ بولا۔ "افسوس خانم! میں دروازہ نہیں چھوڑ سکتا۔"

"دیکھو، یہ میری مجبوری ہے۔ اور شاید یہ تمہاری مجبوری ہو۔" اس نے ایک ڈالر نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ وہ ایک لمحے کے لئے ہچکچایا تو امینہ بولی۔ "دروازے پر تو ہم کھڑے ہی ہیں۔ جاؤ ذرا جلدی کرو۔"

پہرے دار نے نوٹ جیب میں ڈالا اور جلدی سے سڑک کی طرف لپکا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے دروازے سے نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا اور میدان صاف پا کر امینہ کو اشارہ کیا اور امینہ باہر نکل آئی اور بولی۔

"کیا ٹیکسی کا انتظار نہیں کرو گے؟"

"آ جاؤ......" میں نے سرد لہجے میں کہا اور اس کا بازو تھام کر تیزی سے سڑک عبور کرنے لگا۔ سڑک عبور کر کے ہم سامنے والی عمارتوں کے عقب میں پہنچ گئے اور مخالف سمت چلنے لگے۔ کچھ عمارتیں گزرنے کے بعد ایک اسٹریٹ کے کونے پر پہنچ کر میں نے پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھا، پہریدار ایک ٹیکسی میں بیٹھا ہوا ہوٹل کی طرف آ رہا تھا۔ ہم عمارت کی آڑ میں ہو گئے تو گاڑی ہوٹل میں داخل ہوئی تو پچھلی سیٹ پر بھی ایک آدمی بیٹھا ہوا نظر آیا۔

"دیکھا...... کیا خیال ہے۔ ہم رک گئے ہوتے تو ہمارا کیا حشر ہوتا۔"

"میرے خدا، ایسا لگتا ہے جیسے پورا ہوٹل ہمارے خلاف سازش میں مصروف ہو۔ شاید پہرے دار بھی۔"

"ہاں، لعنت بھیجو اس پر۔ لیکن ہمیں ٹیکسی فوراً ملنی چاہئے۔ کیونکہ انہیں فوراً ہی ہمارے فرار کا احساس ہو جائے گا اور ذرا سی دیر میں وہ ہم تک پہنچ جائیں گے۔ تیزی سے گلی تک پہنچو۔ یہ گلی تو دور تک سیدھی جا رہی ہے اور وہ سڑک سے ہمیں دیکھ سکتے ہیں۔"

ہم نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ دائیں طرف کوئی گلی وغیرہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اگر دوڑتے تو وہ بھی خطرناک تھا۔ کیونکہ کسی بھی گشتی پولیس کے آدمی سے سامنے ہونے کے امکانات تھے۔ اس وقت چار بجے تھے۔ صبح ہونے میں دیر تھی۔ بہرحال ہم تیزی سے آگے بڑھتے رہے۔ اب جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔

کوئی دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے کسی قدر اطمینان ہوا۔ تھوڑی دیر میں سڑک کا دوسرا سرا نظر آنے لگا تھا جو کسی بڑی سڑک سے ملحق تھا۔ ہم نے یہ فاصلہ بھی طے کر لیا اور سڑک پر آ گئے۔

"کیا تم اس علاقے سے واقف ہو؟"

"بالکل نہیں۔ ذرا آہستہ چلو۔ اصولی طور پر ہمیں یہاں ٹیکسی مل جانی چاہئے۔ او ہو، تھوڑا تھوڑا سا پہچان رہی ہوں اس علاقے کو؟ اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو تھوڑے فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ ہونا چاہئے۔"

میں نے گردن ہلائی۔ پستول جیب میں رکھا ہوا تھا اور اس پر میری گرفت قائم تھی۔

آخر کار ہم ٹیکسی اسٹینڈ پر پہنچ گئے اور ہمیں یہاں ٹیکسیاں بھی نظر آ گئیں۔ ڈرائیور پچھلی سیٹوں پر پڑے سو رہے تھے۔ امینہ نے پہلی ٹیکسی کے ڈرائیور کا شانہ ہلایا، اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور بغیر کچھ کہے ٹوپی سر پر رکھ کر باہر نکل آیا۔ ہم پچھلے حصے میں بیٹھ گئے۔ امینہ نے میری طرف دیکھ کر انگریزی میں کہا۔

"بتاؤ، کہاں چلیں؟"

"پورٹ کی طرف۔"

"اوکے۔" امینہ نے ڈرائیور کو راستہ بتایا اور اس نے اسٹیئرنگ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"ڈرائیور! تمہاری ٹیکسی کے ٹینک میں فیول کتنا ہے؟"

"ٹینکی بھری ہوئی ہے میڈم! کہیے، کیا بات ہے؟"

"قاہرہ جا سکتے ہو؟"

"جا تو سکتا ہوں میڈم! لیکن آپ کو دونوں طرف کا کرایہ دینا پڑے گا اور چائے وغیرہ کے لئے ایک گھنٹہ ٹھہرنا پڑے گا۔ ساڑھے پانچ بجے سے پہلے نہیں جا سکتے۔"

"پورٹ پر ناشتہ کریں گے۔ یہ منظور ہے؟" میں نے کہا۔

"جی سر! لیکن کرایہ؟"

"ہاں ہاں، کرایہ تمہیں دے دیں گے۔"

"قصور میرا نہیں ہے جناب! قاہرہ سے سواری ملنا مشکل ہے۔"

"چلو چلو، ٹھیک ہے۔ اوکے......"

یہ مذاکرات ختم ہوئے تو اس نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی اور کوئی پندرہ منٹ کے بعد ہم بندرگاہ میں داخل ہو گئے۔ میرا ذہن برق رفتاری سے گزرے ہوئے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ہماری تلاش میں دوڑتے پھر رہے ہوں گے۔ بہرحال یہ ہنگامہ آرائی تو ہونی ہی تھی۔ وردان سادھانی شاید ہمیں میرا مطلب ہے مجھے اس ہنگامہ آرائی کی خبر دینے ہی آیا تھا۔ بندرگاہ کے سامنے کئی ہوٹل اور ریستوران کھلے ہوئے تھے۔ ایک بڑے سے ریستوران کے سامنے ہم نے گاڑی رکوائی اور ڈرائیور سے کہا۔

"آ جاؤ ڈرائیور! اس وقت تم ہمارے مہمان ہو۔"

ڈرائیور نے نیاز مندی سے گردن ہلا دی تھی۔

پانچ بجے کے قریب چائے ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے چلنے کا فیصلہ کیا اور بل ادا کر کے ٹیکسی سے کچھ فاصلے پر پارکنگ لاٹ پر چھٹی ساتویں گاڑی پر نظر پڑتے ہی میں چونکا۔ یہ وہی ٹیکسی تھی جو ہم نے اس وقت دیکھی تھی جب ہوٹل کا پہرے دار ہمارے لئے لے کر آیا تھا۔ اس میں اس وقت تین آدمی بیٹھے تھے۔ یہ ٹیکسی میری نگاہوں میں آئی تھی، امینہ نے اسے نہیں دیکھا تھا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ چکی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جائیے جناب!"

میں نے صرف ایک لمحے سوچا اور اس کے بعد ڈرائیور سے کہا۔ "چلو۔"

ہماری ٹیکسی بیک ڈور سے نکلتے ہی وہ دوسری ٹیکسی بیک ہوئی۔ امینہ نے مجھے کچھ محتاط انداز میں پیچھے دیکھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "خیریت، کیا بات ہے برک؟"

میں نے فوراً جواب دینے کی بجائے اپنا پستول جیب سے نکال لیا۔ امینہ نے میرے اس عمل کو حیرانی سے دیکھا اور پھر پیچھے بیک کر کے دیکھنے لگی۔ ٹیکسی سڑک پر آتے ہی فراٹے بھرنے لگی تھی۔ اور اس سے کچھ پیچھے وہ دوسری ٹیکسی بھی اسی رفتار سے آ رہی تھی۔

میں نے امینہ کی طرف دیکھا، امینہ کو یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے لیکن وہ گھبرائی نہیں تھی۔

آخر کار ٹیکسی مختلف سگنلوں اور انٹرسیکشنوں سے گزرتی ہوئی بیرونی شہر میں جانے والی شاہراہ پر آئی اور اس کی رفتار کچھ اور تیز ہو گئی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"سنو...... کتنے سال سے گاڑی چلا رہے ہو؟"

''زندگی گزر گئی جناب۔''

''اپنے آپ کو ماہر کہہ سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں۔''

''پھر کتنی رفتار سے گاڑی چلا سکتے ہو؟''

''جتنی رفتار سے آپ کہیں صاحب! لیکن خرچہ کچھ زیادہ ہو جائے گا۔''

ڈرائیور کے اس کمینے پن پر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ لیکن گاڑی اتنی رفتار سے چلانی پڑے گی کہ خرچہ دیتے ہوئے خوشی ہو۔''

''آپ جتنی تیز کہیں صاحب۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ یہ لو۔'' میں نے کہا اور دس ڈالر کا ایک نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''ارے صاحب، کیا آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟''

''بالکل نہیں۔ چلو، دیکھتا ہوں کتنی تیز چلا سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے صاحب!'' ڈرائیور نے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا اور سپیڈومیٹر کی سوئی آگے بڑھنے لگی۔ ایک میل تک جاتے جاتے ٹیکسی نوے اور سو کے درمیان دوڑنے لگی۔ میں ڈرائیور کی تعریف کر رہا تھا۔ وہ بولا۔

''اور صاحب؟''

''ہاں چلو۔'' میں نے کہا اور اس نے رفتار اور بڑھا دی۔ پھر اچانک ہی وہ بولا۔

''صاحب! ایک بات بتائیے؟''

''ہاں پوچھو۔''

''کیا کوئی آپ کا پیچھا کر رہا ہے؟''

''ہاں...... وہ بھی ایک ٹیکسی تھی۔ لیکن اب نظر نہیں آ رہی ہے۔''

ڈرائیور کچھ خاموش سا ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''کیوں، کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں صاحب، ایسے ہی۔''

''دیکھو ڈرائیور! ہر شخص کو اپنی جان عزیز ہوتی ہے اور دوسروں کی جنگ میں کوئی شامل نہیں ہوتا۔ اگر تم اس خیال سے خوفزدہ ہو گئے ہو کہ دوسری ٹیکسی میں میرے دشمن موجود ہیں تو بے فکر رہو اور قریب ترین نخلستان میں ہمیں چھوڑ دو، اپنا کرایہ لو اور واپس لوٹ

جاؤ۔ ہم خود بھی تمہارے لئے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے۔''

میرے ان الفاظ نے ڈرائیور پر اثر کیا اور وہ پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ''نہیں صاحب! ایسی بزدلی تو میں نہیں کر سکتا۔ اور پھر ہر پیشے کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ ہم اتنے بے اصول لوگ نہیں ہوتے۔ آپ کے ساتھ ایک خاتون بھی ہیں۔ ہمیں ان کا خیال تو کرنا ہی پڑے گا۔''

''بہت شکریہ۔ اب ایک ایسا مرحلہ بھی آ رہا ہے کہ میں تمہیں تیز رفتاری کے خطرے میں ڈالے بغیر اپنا کام کر سکوں۔ میں ان کا مقابلہ کروں گا۔''

ڈرائیور نے ایک نظر پچھلے راستے پر ڈالی اور پھر بولا۔ ''صاحب! وہ ٹیکسی کہیں نظر نہیں آ رہی۔ لگتا ہے یا تو ان کا پٹرول ختم ہو گیا ہے یا پھر وہ واپس چلے گئے ہیں۔''

میں نے پلٹ کر شیشے سے دیکھا، حد نظر تک سڑک خالی پڑی تھی۔ صبح ہوتی جا رہی تھی اور ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ میری ہدایت پر ٹیکسی کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ ہم لوگ شہری آبادی سے کافی دور نکل آئے تھے۔ دونوں طرف ویران صحرا کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بہت دور کہیں کہیں کھجور کے درختوں کے جھنڈ نظر آ جاتے اور پیچھے رہ جاتے۔ مشرق کی طرف شفق کا منظر بھی ٹیلوں کے ذرات چمکانے کے سوا اور کچھ نہیں کر رہا تھا۔ چند میل چل کر ایک نخلستان آیا جہاں سو ڈیڑھ سو کھجور کے درختوں کے درمیان سڑک کے قریب چند مکانات نظر آ رہے تھے۔ یہاں ایک چشمہ بھی تھا اور قہوہ خانہ بھی جو دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

''کیا خیال ہے، اس طرف چلیں؟''

''جیسا حکم صاحب!'' اس نے کہا اور میرے اشارے پر اس نے قہوہ خانے کی طرف گاڑی موڑ دی۔ اس وقت قہوہ خانے میں اور کوئی موجود نہیں تھا چنانچہ جب ہم وہاں پہنچ کر گاڑی سے اترے تو قہوہ خانے کا مالک ہمیں دیکھ کر تعظیم کے لئے اٹھ کر باہر آیا۔ ڈرائیور نے عربی میں اس سے کار کھڑی کرنے کی جگہ بتانے کو کہا اور اس نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ ڈرائیور ہمیں اندر جانے کا کہہ کر گاڑی لے کر اس طرف چل پڑا اور میں ایمنہ کے ساتھ اندر داخل ہو گیا یہاں اس وقت صرف دو آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے سامنے ایک میز پر قہوے کے فنجان رکھے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھے اور قہوہ خانے کے مالک کو چند سکے دے کر چل دیئے۔ ہم ایک کونے کی میز پر پہلو بہ پہلو

بیٹھ گئے۔ اینہ نے چند چیزوں کے نام لئے اور قہوہ خانے والا نفی میں سر ہلاتا رہا۔ آخر کار چند اُبلے ہوئے انڈے، بسکٹ اور کافی کا ناشتہ کر کے کوئی آدھے گھنٹے کے بعد ہم قاہرہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس دوران میری نگاہیں باہر کا جائزہ لیتی رہی تھیں لیکن اب اس ٹیکسی کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ مجھے شک ہوا کہ شاید ہمیں گاڑی پہچاننے میں غلطی ہوئی ہو اور ممکن ہے وہ سرے سے ہمارا تعاقب ہی نہیں کر رہے ہوں۔ اینہ سے اس سلسلے میں میں نے کہا تو وہ بولی۔

"نہیں برک! وہ گاڑی وہی تھی جسے وہ پہرے دار لے کر آیا تھا۔ اور ویسے بھی میں نے اس میں ہشمان ذکری کے ایک آدمی کو شناخت کر لیا تھا۔"

"اوہ...... اس کا مطلب ہے کہ پھر میرا خیال غلط ہے۔"

ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ ڈرائیور بھی خاموشی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ قاہرہ اب صرف چند میل رہ گیا تھا اور بلند عمارتیں نظر آنے لگی تھیں۔ ہماری ٹیکسی کوہستانی سلسلے کی اونچی نیچی سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگی اور پھر ایک ہموار میدان کے ایک موڑ پر پہنچ گئی۔ ابھی وہ ایک موڑ مڑی ہی تھی کہ سامنے سے ایک کار سڑک کے بیچ و بیچ تیزی سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ فاصلہ بے شک کافی تھا لیکن وہ جس انداز میں چلا آ رہا تھا وہ بڑا خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ ڈرائیور بار بار ہارن بجانے لگا لیکن وہ کار اسی طرح چلتی رہی۔ ڈرائیور نے رفتار کم کی اور ٹیکسی کو ایکسٹریم لیفٹ پر لے جانا چاہا لیکن سامنے والی کار رفتار کم ہوتے ہی مزید بائیں جانب ہو گئی۔ اور پھر اس کے بریک لگے۔ اس نے راستہ روک لیا تھا۔ ہماری ٹیکسی کے بریک بھی چرچرانے لگے اور پھر ٹیکسی اس کار سے چند فٹ کے فاصلے پر رک گئی۔ ڈرائیور نے سر کھڑکی سے باہر نکال کر کہا۔

"کیا چاہتے ہو پاگل تم؟"

پچھلی سیٹ سے دو آدمی اترنے کے بعد آگے بڑھے۔ اور اب صورتحال کسی قسم کے شک وشبہے سے بالاتر تھی۔ لیکن دوسرے لمحے میں نے پستول نکال کر ٹیکسی کے دائیں طرف آنے والے آدمی کے سینے کا نشانہ لے کر غراتی آواز میں کہا۔

"رُک جاؤ......"

پستول پر نظر پڑتے ہی اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ میں نے پھرتی سے دروازہ کھولا، باہر نکلا اور پستول اس کی طرف کئے اس کی طرف لپکا۔ اسی وقت بائیں جانب والے نے

میری طرف پستول کیا اور چیخ کر بولا۔

"ہینڈز......"

لیکن اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی اینہ نے گولی چلا دی اور وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر گر پڑا۔ اینہ بھی دوسرا دروازہ کھول کر میرے قریب آ گئی۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر سامنے کھڑے آدمی سے پستول چھین کر اینہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ ہتھیار چھنتے ہی اس شخص کے دونوں ہاتھ خودبخود سر سے اونچے اٹھ گئے۔ میں نے اسے کار میں دھکیلا اور پستول کا کندہ کنپٹی پر مار کر گرا دیا۔ ڈرائیور نے رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میں اسے نظر انداز کر کے زخمی کے قریب پہنچا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبائے سڑک پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ اس کا ریوالور کچھ فاصلے پر پڑا تھا۔ میں نے اینہ کو اسے اٹھانے کا اشارہ کیا اور زخمی آدمی کو پکڑ کر کھڑا کیا۔ وہ کراہتا ہوا ایک ہاتھ سے پیٹ دبائے لڑکھڑاتے قدموں سے کار کی طرف چلنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈگمگا کر پھر گرتا، میں نے اسے دھکیل کر کار میں گھسیڑ دیا اور ڈرائیور کی گردن پر ہاتھ مار کر کہا۔

"اس سے پہلے کہ پولیس کی گاڑی آ کر تمہیں سرکاری مہمان خانے میں لے جائے، یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

ڈرائیور نے نیچے اترنے کے بعد اپنے دونوں ساتھیوں کو پچھلی سیٹ پر ڈالا اور اس کے بعد اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ میں نے چلتے چلتے کہا۔

"سنو...... ذکری سے کہنا کہ اتنے گھٹیا آدمیوں کے بھروسے پر تخت حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ بس جاؤ۔"

ڈرائیور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گاڑی بیک کر کے بائیں جانب لی اور اسکندریہ کی جانب دوڑ گیا۔ میں کھڑا دیکھتا رہا۔ گاڑی دور نکل گئی تو میں نے اپنے ڈرائیور کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ہاں دوست! اب یہ بتاؤ کہ اپنی زبان بند رکھنے کے لئے مزید کتنی رقم پیش کروں؟"

"سر! اب آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کا دشمن کون ہے۔ اب مجھے اپنا خادم سمجھئے۔"

"گڈ...... چلو پھر۔" میں نے گاڑی کی طرف چلتے ہوئے کہا۔ "اور سنو، کوشش کرنا کہ اعتماد پر پورے اترو۔"

ڈرائیور نے باہر نکل کر ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میرا وعدہ ہے جناب! کہ میں کبھی بھی زبان نہیں کھولوں گا۔''

میں اس کا شکریہ ادا کر کے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ایک بار پھر ٹیکسی آگے کی طرف چل پڑی۔ میں نے اینہ کی طرف دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ یہ اینہ کی زبردست خوبی تھی۔ ابھی اس نے ایک آدمی کو شدید زخمی کر دیا تھا لیکن وہ بالکل نارمل تھی۔ اصل میں وہ جس ماحول میں گھری ہوئی تھی، وہاں انسانی زندگی کی قیمت ایک کارتوس سے زیادہ نہیں تھی۔ دفعتہً ہی وہ بولی۔

''برک! اب میری سمجھ میں آیا کہ ٹیکسی نے ہمارا پیچھا کیوں نہیں کیا تھا۔''

''ویسے میں آپ کو ایک بات بتاؤں صاحب! اتنی تیز رفتاری سے گاڑی چلانے والے آپ کو یہاں دو چار ہی ملیں گے۔''

''یہ واقعی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ بہت ایکسپرٹ ڈرائیور ہیں۔'' پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''شاید وہ ہماری گاڑی کی تیز رفتاری دیکھ کر اسکندریہ لوٹ گئے اور ذکری نے تار کے ذریعے قاہرہ میں اپنے آدمیوں کو یہ اطلاع دے کر حملہ کرایا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن ذکری کا یہ حملہ کس حد تک کامیاب رہا ہے یہ تم سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔''

وہ ہنس کر خاموش ہو گئی تو ڈرائیور نے پیچھے دیکھ کر کہا۔ ''ایک بات میں بھی کہوں صاحب! میرا خیال ہے اب آپ کا قاہرہ جانا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کے دشمنوں کو یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ آپ قاہرہ جا رہے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں کسی قریے میں آپ کے رہنے کا انتظام کر دوں؟''

''کیا کہتی ہو اینہ؟''

''نہیں، ہم کسی غیر معروف ہوٹل میں ٹھہر جائیں گے۔ تم چلتے رہو۔'' ڈرائیور نے خاموشی سے گردن ہلا دی۔ اس سے زیادہ شاید وہ کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔

☆

دارالخلافہ قاہرہ کی حدود سے ایک میل اس طرف ایک چھوٹے سے قریے میں تیسرے درجے کا دو منزلہ ہوٹل تھا بلکہ اسے ہوٹل کہنا مناسب نہیں تھا، زمانہ قدیم کی کوئی وسیع سرائے معلوم ہوتی تھی جسے از سر نو تعمیر کر کے ہوٹل کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس کے گرد

وسیع چار دیواری تھی۔ چوک میں جگہ جگہ اونٹ، خچر اور گدھے بندھے ہوئے تھے۔ درختوں کے نیچے جابجا دریوں، کمبلوں اور بوریوں پر ڈھیلے ڈھالے لباس والے عرب بیٹھے گپیں لڑا رہے تھے۔ بہرحال خاصی غیر مناسب جگہ تھی۔ ہر طرف متعفن کوڑا کرکٹ، اور غلاظت کے انبار تھے، مکھیوں کی یلغار تھی۔ ایک چبوترے پر ہیئر کٹنگ سیلون کم سرجیکل وارڈ قائم تھا۔ یعنی ٹاٹ کی دو بوریوں میں سے ایک پر ایک حجام ایک ادھیڑ عمر کے دیہاتی کا سر گھٹنے پر رکھے دس انچ لمبے استرے سے اسے آلو کی طرح چھیل رہا تھا۔ چاروں طرف سفید اور سیاہ منڈے ہوئے بالوں کے گچھے بکھرے پڑے تھے اور ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ایک کمبل، تولیوں کا خام سامان اِدھر اُدھر لڑھک لڑھک کر ضائع ہو رہا تھا۔ دوسرے بورے پر ایک لحیم شحیم چالیس سالہ حجام کم جلاد نما جراح ایک چودہ پندرہ سال کے لڑکے کے بائیں ہاتھ کو اپنی دونوں رانوں کے درمیان دبائے کلائی کے پھوڑے میں بھیڑوں کی اون کترنے والی قینچی سے اس کی کھال کو گتے کی طرح گول دائرے میں کتر رہا تھا۔ زخم سے پیپ اور خون کا فوارہ ابل رہا تھا اور لڑکے کی چیخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہ دہاڑ رہا تھا لیکن تڑپ نہیں سکتا تھا کیونکہ پیچھے سے ایک دوسرے آدمی نے دونوں ہاتھوں سے اسے جکڑ رکھا تھا۔ اِدھر اُدھر خون پر مکھیوں کے جھنڈ بھنبھنا رہے تھے۔

میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے رحم طلب نگاہوں سے ڈرائیور کو دیکھ کر کہا۔ ''میرے دوست! ہم سے ایسی کیا خطا ہوئی ہے کہ تم سلطنت رومہ کے اس ایرینہ میں ہمیں لے آئے ہو؟''

ڈرائیور کچھ نہیں سمجھا، مسکرا کر بولا۔ ''یہاں کا ماحول دیہاتی ہے۔ لیکن اندر دارالاقامہ صاف ستھرا ہے۔'' اور پھر اس نے رازداری سے کہا۔ ''اور محفوظ بھی۔''

ٹیکسی کے اردگرد بچے جمع ہوتے دیکھ کر میں خاموشی سے اینہ کو ساتھ لے کر نیچے اترا۔ ڈرائیور نے ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ آگے آگے بڑھتا ہوا اندر داخل ہو گیا تھا۔ پھر وہ لکڑی کے زینے کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ ہمیں اوپر جاتے دیکھ کر ایک شخص ہمارے ساتھ چل پڑا۔ اس نے پہلی منزل پر پہنچ کر اپنی دانست میں بہترین کمرہ کھولا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ یہاں ایک بڑی سی مسہری، ایک قالین، ایک میز، چار کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کمرہ کافی بڑا تھا۔ ہوٹل والے نے کھڑکیاں کھولیں اور کھانے کا آرڈر لے کر چلا گیا۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"یار! ایک بات بتاؤ۔ جب ہمارے درمیان ضرورت سے زیادہ گہرے تعلقات ت
ہو چکے ہیں تو کم از کم ہمیں تمہارا نام تو معلوم ہونا چاہئے۔"

"میرا نام حارث ہے جناب۔"

"تم بہت اچھے انسان ہو حارث! واقعی جس طرح تم نے اس سفر میں ہمارا ساتھ
ہے، ہمیں تمہارا احسان مند ہونا چاہئے۔ بہت بہت شکریہ۔ ویسے میرا نام برک ہے۔"

"ویسے صاحب! آپ یقین کریں، میں خود بھی اپنا نام آپ کو بتانا چاہتا تھا۔ مگر
نے سوچا کہ جب آپ نہیں پوچھ رہے تو میں زبردستی کیوں بتاؤں۔"

"تم دیکھ رہے ہو دوست! ہم کن حالات سے گزر رہے ہیں۔ ایسے میں تو انسان
اپنا نام تک بھول جاتا ہے۔"

"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ یہاں آرام کریں۔ میں اسی لئے آپ کو یہا
لایا ہوں۔ ویسے ایک بات بتاؤں، یہاں آپ جیسی شخصیت کے قیام کے بارے میں کو
سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لحاظ سے یہ جگہ محفوظ بھی ہے۔"

"ہاں، یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ چلو اب کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے بعد دیکھیں گے
آگے کیا کرنا ہے۔"

کھانے سے فراغت ہوئی۔ ڈرائیور نے بھی ہمارے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا۔ پھر
نے اسے چند نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ "حارث! گاڑی میں پٹرول ضرور ہونا چاہئے
نامعلوم کس وقت ضرورت پیش آ جائے۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" اس نے نوٹ لیتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔ "پٹرول یہاں تو نہ
مل سکتا۔ شہر جانا پڑے گا۔ اور یہ میں نہیں چاہتا۔"

"اوہو، ہاں واقعی۔ اچھا ایک کام کرو، کسی گدھے والے کو انعام دینے کا وعدہ کر
شہر بھیجو اور پرچہ لکھ کر قریبی پٹرول پمپ سے چار چار گیلن کے دو جیری کین منگوا
صرف اتنا سمجھا دو کہ اگر اس سے پوچھا جائے تو اس کے سوا کچھ نہ کہے کہ ایک صاح
کی کار کا پٹرول ختم ہو گیا ہے اور وہ جنگل میں رکے ہوئے ہیں۔"

"ترکیب تو اچھی ہے جناب۔ لیکن اگر وہ لوگ تلاش میں ہوئے اور اس علاقے
پہنچ گئے تو گدھے پر جیری کین دیکھ کر اس کا پیچھا کئے بغیر نہیں رہیں گے۔"

"مگر اس کے سوا اور کوئی طریقہ ہے بھی تو نہیں۔ اتنا خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔

"ایک طریقہ ہے صاحب۔" اس نے کہا۔

"کیا؟"

"اگر آپ مجھ پر اعتماد کریں تو میں خود گاڑی لے کر جاتا ہوں۔ اگر ایک گھنٹے میں
واپس نہ لوٹ آؤں تو آپ سمجھ لیں میرا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ میں انہیں چکر میں ڈال کر
آنے کی کوشش کروں گا۔ اگر ایسا نہ ہو سکا صاحب تو......"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تمہاری ترکیب سے اتفاق کرتا ہوں۔ لو، یہ رقم
لو اور اسے اپنے پاس رکھ لو۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو سکے تو پھر تم واپس چلے جانا۔"

"صاحب! آپ بے فکر رہیں، کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔" اس نے کہا اور پھر وہ باہر نکل
گیا۔ امینہ نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور واپس آ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ویسے میرا خیال ہے اتنے پیسے اسے نہیں دینے چاہئیں تھے۔"

"کیوں؟"

"دنیا بہت بری ہے برک۔ ذاتی مفاد ختم ہونے کے بعد وعدے اور معاہدے کوئی
معنی نہیں رکھتے۔"

میں ہنسنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔ "لیکن ہمیں اس وقت تک کسی کو بے ایمان نہیں کہنا
چاہئے جب تک وہ بے ایمان ثابت نہ ہو جائے۔"

"عملی زندگی میں بے اصولی ایک فطری چیز ہوتی ہے۔ یہ باتیں کتابوں میں تو اچھی
لگتی ہیں لیکن باہر کی دنیا میں تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتیں۔ اگر وہ دھوکا دے گیا تو یہ
بتاؤ کیا کرو گے؟"

میں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بس دیکھیں گے۔ جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے وہ
ہو جائے گا۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ میں اٹھ کر باہر آیا اور زینے کی کھڑکی سے ہوٹل کے ملازم کو آواز
دی۔ تھوڑی دیر میں ملازم اندر آ گیا اور بولا۔ "جی سر! حکم دیجئے۔"

"دیکھو ہم یہاں خاموشی سے وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ تم یہ رقم رکھ لو، جس وقت بھی
تم سے کھانا طلب کریں تم ہمیں کھانا پہنچا دیں۔"

ہوٹل کے ملازم نے گردن ہلائی اور باہر نکل گیا۔ اس کے بعد ہم آرام کرنے لیٹ
گئے تھے۔ نجانے کس وقت نیند نے آ دبوچا۔ جاگے تو شام ہو چکی تھی۔ ڈرائیور کا کہیں کوئی

وجود نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہو۔ طبیعت پر ایک گھبراہٹ سی سوار ہو گئی۔ میں نے اینہ سے کہا۔

"آؤ اینہ! باہر چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے باہر ڈرائیور ہمارا منتظر ہو۔"

اینہ نے اپنے آپ کو بنایا سنوارا اور اس کے بعد میرے ساتھ باہر نکلنے کے لئے تیار ہو گئی۔ ہم باہر آ گئے۔ چوک میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا، کہیں کہیں کوٹھڑیوں میں لیمپ اور شمعیں جل رہی تھیں جن کی ہلکی ہلکی روشنی میں اِکا دُکا گدھے بندھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ چوک سے نکل کر ہم محراب دار دروازے سے باہر نکلے اور سڑک پر آ گئے۔ یہاں بھی ہر طرف اندھیرا تھا۔ کھمبوں پر چوکور شیشوں میں جلنے والے تیل کے لیمپ ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر تھے کہ دس قدم کے فاصلے پر بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابھی رات کے آٹھ نہیں بجے تھے لیکن لوگوں کی آمد و رفت برائے نام تھی۔

اینہ نے تاریکی اور ویرانی سے گھبرا کر میرا بازو تھام لیا۔ میں نے سامنے کی طرف نگاہیں دوڑائیں، سڑک کے دونوں طرف ایک منزلہ مکانوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا جن میں کسی کسی دُکان میں روشنی سے پتہ چلتا تھا کہ یہ بازار ہو سکتا ہے۔ اس طرف جانا مناسب نہیں تھا چنانچہ ہم دائیں طرف والی سڑک پر نکل آئے۔ ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک مقبرہ نظر آیا۔ مقبرے کی شکستہ دیوار پر چراغ جل رہا تھا۔ آس پاس کھجوروں کے جھنڈ اور اونچی اونچی پہاڑیاں دور تک چلی گئی تھیں۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا اور عجیب وحشت کا سماں تھا۔ میں یہاں پہنچ کر رکا اور دیوار کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا تو اینہ بولی۔

"اُف میرے خدا! کیسی ہولناک جگہ ہے۔"

"ہاں واقعی۔"

"کیا تم مجھے خوفزدہ کر کے مار ڈالنا چاہتے ہو؟"

"نہیں جانِ من۔ یہ تمہیں زندہ رکھنے کی کوشش ہے۔"

"لیکن یہاں کیوں آئے ہو؟ اس سنسان قبرستان میں کیا کام ہے؟"

"بس میں تھوڑا سا الجھا ہوا ہوں۔ تمہاری موجودگی مجھے سہارا دیتی ہے۔ مجھے حارث کی تلاش ہے۔ ابھی تک اس کا نہ آنا میرے لئے پریشان کن ہے۔ اور یہ بھی اندازہ لگا چاہتا ہوں میں کہ اگر وہ آئے تو ہمیں یہ پتہ چل جائے کہ تنہا ہی آیا ہے یا پھر کوئی اس

پیچھا کر رہا ہے۔"

اینہ خاموش ہو گئی۔ میں نے ذرا سرک کر چراغ کو آڑ میں لے لیا اور راستے پر اندھیرا ہو گیا۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ بائیں طرف سے دو آدمی آتے دکھائی دیئے۔ وہ قریب آئے تو میں نے مقبرے کی دیوار کی طرف پلٹ کر دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھا دیئے۔ اینہ نے بھی فوراً ہی میری تقلید کی تھی۔ قریب سے گزرتے ہوئے انہوں نے ہماری طرف دیکھا اور گھوم کر دارالاقامہ کے دروازے کی طرف چل پڑے۔ کچھ دور جا کر وہ دائیں جانب مڑے اور آبادی میں داخل ہو گئے۔ میں نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی، ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ ہم اس سنسان ماحول میں کھڑے کھڑے اکتا گئے تھے۔ اینہ نے پھر شکایتی انداز میں کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا، یہاں کھڑے رہنے سے کیا فائدہ؟ حارث کو نجانے کیا ہوا۔ اس کا کہیں بھی پتہ نہیں ہے۔"

"وہ یقیناً مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہو گا ورنہ اب تک یہاں پہنچ چکا ہوتا۔" میں نے فکرمندی سے کہا۔

"پتہ نہیں کس خیال میں ہو تم۔ وہ اسکندریہ پہنچ گیا ہو گا اور ہم یہاں کھڑے ہوئے ہیں بلکہ جھوٹی فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ اور جب میرا دم نکل جائے تو سچی فاتحہ پڑھتے ہوئے یہاں سے نکل جانا۔" اس کے انداز پر مجھے ہنسی آ گئی اور اس نے برا سا منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ ابھی چند ہی قدم طے کئے تھے کہ اچانک آبادی کی طرف سے ایک کار دارالاقامہ کی طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ ہم نے اسے فوراً پہچان لیا، یہ حارث کی کار ہی تھی۔ اینہ پیچھے ہٹ کر میرے قریب آ گئی۔ میں نے کہا۔

"حارث ہی تھا نا؟"

"سو فیصدی۔"

"اکیلا تھا؟"

"اندازہ تو یہی ہوتا ہے۔" وہ بولی۔ پھر کہنے لگی۔ "لیکن ہو سکتا ہے کوئی اور بھی ہو۔ کیا آگے چل کر دیکھوں؟"

"نہیں، ممکن ہے اس کے پیچھے کوئی گاڑی ہو۔"

بمشکل تمام چند منٹ گزرے ہوں گے کہ دارالاقامہ کے دروازے سے ٹیکسی باہر نکلتی دکھائی دی۔ میں نے حارث کو دیکھ کر آگے بڑھ کر سیٹی بجائی اور گاڑی جو بائیں طرف ٹرن لے رہی تھی، ایک دم رک گئی۔ پھر حارث دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ میں نے اینہ کو آنے کا اشارہ کیا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔ حارث سلام کر کے بولا۔

''صاحب! پٹرول مل گیا ہے۔ آپ ہوٹل چلیں، مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''ٹھیک ہے......تم چلو، ہم آ رہے ہیں۔'' میں نے کہا اور حارث ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ وہ ٹیکسی میں آگے بڑھ گیا تو ہم دونوں اس کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ پھر ہم ہوٹل کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ حارث گاڑی کھڑی کر کے آ گیا تھا۔

''ہاں حارث! جلدی سے بتاؤ، اتنی دیر کیسے ہوگئی؟''

''صاحب، پٹرول پمپ پر ایک پرانا دوست مل گیا۔ وہ مجھے کھینچ کر ہوٹل لے گیا اور اس کے بعد کمبخت نے اس طرح گھیرا کہ چھوڑا ہی نہیں۔ میں بار بار وہاں سے چلنا چاہتا تھا لیکن وہ مجھے پتہ نہیں کہاں کہاں کے قصے سناتا رہا تھا۔ پھر جب میں یہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ آپ تھوڑی دیر پہلے نکلے ہیں۔''

''اتنا وقت تم نے اس کے ساتھ گزار دیا؟''

''آپ یقین کریں صاحب! کچھ لوگ ایسے ہی بے تکے ہوتے ہیں کہ ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔''

''مجھے صرف یہ بات بتاؤ کہ کوئی مشکوک بات تو نہیں ہوئی؟''

''نہیں، کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ دوست کے جانے کے بعد میں دو تین چکر اِدھر اُدھر کے لگا چکا ہوں، میرا مطلب ہے سواریاں لے کر۔ لیکن اصل مقصد میرا ان سواریوں کے ذریعے رقم کمانا نہیں تھا بلکہ میں یہ جائزہ لینا چاہتا تھا کہ کوئی میرا پیچھا تو نہیں کر رہا۔''

اینہ بے اختیار مسکرا دی۔ لیکن حارث اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھ سکا تھا۔ اینہ کی مسکراہٹ کا مقصد کچھ اور تھا لیکن حارث اگر اس مسکراہٹ کو دیکھ کر اس کا مطلب سمجھ جاتا تو یقیناً برا مان جاتا۔ بہرحال وہ بولا۔

''آپ بے فکر رہیں صاحب۔ کچھ ہوا نہیں ہے۔''

''میں بے فکر ہوں۔ اب ایسا کرتے ہیں کہ آرام کریں گے۔ کھانا وغیرہ کھا لو۔ میں ہوٹل کے ملازم کو رقم دے چکا ہوں۔ کھانے سے فراغت حاصل کر کے تم برابر والے

کمرے میں سو جاؤ۔ صبح کو چائے پی کر چلیں گے۔ اس کے بعد تم اسکندریہ لوٹ جانا۔''

''کمرہ لینے کی ضرورت نہیں ہے صاحب! میں گاڑی میں سو جاؤں گا۔ اصل میں گاڑی اکیلی چھوڑنا نہیں چاہتا۔ آپ بے فکر رہیں، میں کھانا بھی کھا لوں گا۔ اچھا شب بخیر۔'' وہ چل دیا اور ہم اسے باہر جاتے دیکھتے رہے۔

دس بجے کھانے سے فراغت ہوئی تو اینہ نے دروازہ بند کر کے مسہری کی طرف چلتے ہوئے کہا۔ ''کل ساری رات جاگتے ہوئے گزری ہے۔ چلو گہری نیند سو جائیں۔''

''نہیں اینہ، تم آرام کرو۔ مجھے ابھی جاگنا ہے۔ اس کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔''

''کس کے؟'' اینہ نے حیرت بھری آواز میں پوچھا۔

''جسے کل تم نے دیکھا تھا۔ بھول گئیں اس کو؟ تم نے کہا تھا کہ مصر میں تو کوئی فیشن شو بھی نہیں ہو رہا۔''

''اوہو......اچھا وہ......وہ ننگا جادوگر؟''

''نہیں اینہ، ایسا مت کہو۔''

''ایک بات بتاؤ......میں تمہارے انداز میں ذرا سی الجھن، ذرا سی تبدیلی محسوس کر رہی ہوں مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم کوئی خطرہ محسوس کر رہے ہو۔ ویسے اس وقت بھی میں نے یہ اندازہ لگایا تھا جب تم ڈرائیور سے باتیں کر رہے تھے۔''

''کیسا اندازہ؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ کہ جیسے تمہیں اس کی باتوں پر یقین نہ آیا ہو۔''

میں نے گہری نگاہوں سے اینہ کو دیکھا اور کہا۔ ''ہاں اینہ، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس کا جواب مجھے مطمئن نہیں کر سکا تھا۔''

''تو پھر اب کیا کرو گے؟''

''انتظار۔''

''کس کا؟''

''وردان سادھانی کا۔''

''وردان سادھانی؟''

''وہی جسے تم نے ننگا جادوگر کہہ کر پکارا ہے۔''

''اس کا نام وردان سادھانی ہے؟''

"ہاں۔"

"ہے کیا چیز؟"

"بدھسٹ ہے۔"

"اوہو...... میں نے بدھوں کے بارے میں پڑھا ہے۔ واقعی تم ٹھیک کہتے ہو۔ د
دلائی لامہ وغیرہ۔"

"ہاں۔"

"مگر اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"نہیں، میرا مطلب ہے تعلق تو ہے اس سے میرا۔ یہ سارا چکر اسی سلسلے میں تو چل رہا ہے۔ وہ تختی جس کی مختلف شکلیں میرے سامنے آئی ہیں، اب اسی کے پاس ہے۔"

"اس کے آنے سے تمہیں کوئی فائدہ ہوگا؟"

"ہاں۔"

"ایک بات میرے دل میں آ رہی ہے بار بار۔"

"ہاں بولو؟"

"کیوں نہ یہاں سے نکل چلیں۔"

"میں تمہیں ایک بات بتاؤں، میری چھٹی حس مجھے کچھ اور احساس دلا رہی ہے۔"

"کیا؟"

"مجھے لگ رہا ہے جیسے ہم گھر چکے ہیں۔ حارث حالانکہ اس نے ہمارا بھرپور ساتھ ہے، لیکن نجانے کیوں اب مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔"

امینہ میری صورت دیکھتی رہی، پھر بولی۔ "میں باہر نکل کر دیکھتی ہوں۔ ہمارا یہاں سے نکل چلنا ہی بہتر ہوگا۔ اگر کوئی شبہ نہ ہوا مجھے تو پھر میں واپس آ جاؤں گی۔ تم ایسا راہداری کی کھڑکی سے دیکھتے رہنا۔"

میں نے ایک لمحے تک کچھ سوچا اور پھر امینہ کو باہر جانے کی اجازت دے دی۔ تے برقع مفلر کی طرح گلے میں ڈالا اور مسہری کی چادر اوڑھ کر آنکھوں کے سوا تمام ڈھک کر باہر نکل آئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے راہداری میں آیا اور کھڑکی سے جھانکنے

وہ نیچے اتر کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی پھاٹک کی طرف بڑھنے لگی۔ دروازے کے قریب پہنچتے پہنچتے میرے اور اس کے درمیان ایک سائبان کا کونا آ گیا اور وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ ابھی وہ بمشکل دروازے تک ہی پہنچی ہوگی کہ دفعتہً اس کی چیخ فضا میں گونجی اور حلق میں گھٹ کر رہ گئی...... بالکل اس طرح جیسے حلق پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا ہو۔

میں نے جیب سے پستول نکالا اور پلٹ کر تیزی سے زینے کی جانب دوڑ پڑا۔ کئی کئی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا میں زینے سے اترا۔ آخری چار سیڑھیوں سے زمین پر چھلانگ لگاتے ہوئے میری ناک میں چمپا کی تیز خوشبو آئی اور ساتھ ہی میری آنکھیں خودبخود بند ہو گئیں...... مجھے یوں لگا جیسے زمین پھٹ گئی ہو اور میں بے وزن ہوا کے جھونکے کی طرح آہستہ آہستہ خلا کی پنہائیوں میں اترتا جا رہا ہوں۔ ایک لمحے کے اندر میرے سارے وجود میں ایک شدید سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ میرے ذہن سے سب کچھ نکل گیا۔ صرف اپنا چھلانگ لگانا یاد تھا۔ لیکن کیوں اور کس لئے؟ یہ سب کچھ ذہن سے فراموش ہو چکا تھا۔ اپنا جسم اتنا ہلکا پھلکا ہو جانے پر غور کرنے کی صلاحیت بھی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ایک خواب کی سی کیفیت طاری تھی اور آنکھیں بند تھیں۔ نجانے کیوں میں انہیں کھولنے سے کچھ خوفزدہ سا ہو رہا تھا۔ اپنی اس وقت کی کیفیت کو میں صحیح انداز میں بیان نہیں کر پا رہا۔

بہرحال آخرکار زمین پر پاؤں ٹکے اور میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ میں ایک سرسبز و شاداب جنگل میں ایک بلند پہاڑ کے سامنے غار کے سامنے کھڑا تھا۔ دفعتہً کسی نے میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور میں آگے کی طرف قدم اٹھاتے اٹھاتے رک گیا۔ میں نے جھک کر دیکھا تو وہ وردان سادھانی تھا۔ نگاہیں اس پر پڑی تھیں۔ اسی نے میرے گھٹنے چھوئے تھے۔

"اوم نموستو......" اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ میرا سارا وجود حیرتوں کا شکار تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"یہ کیا ہوا وردان سادھانی؟"

"سنگل دیپ کی پوتر دھومی دھم راج کا سواگت کرتی ہے۔" اس نے پیچھے کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔ اسی وقت قرب و جوار سے آوازیں ابھرنے لگیں۔

"شبھ آگمن...... شبھ آگمن...... شبھ آگمن۔"

وردان سادھانی آگے بڑھ کر غار کی طرف چل پڑا۔ میرے پاؤں اس غار کی طرف اٹھنے لگے۔ غار کے اندر پہنچ کر مجھے غار کی وسعت کا اندازہ ہوا۔ کوہستانِ گاشر برہم میں یہ غار کسی درے کی طرح سے نظر آتا تھا۔ سوائے اس کے کہ اوپر سے یہ درہ کھلا ہوا نہیں تھا لیکن اس کے بعد میں نے جو منظر دیکھا اس نے مجھے شدتِ حیرت سے دیوانہ کر دیا۔ کچھ ہی قدم کے فاصلے پر سینکڑوں بھکشو قطاریں بنائے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چمپا کے ہار تھے۔ غار میں حدِ نظر تک ایک عجیب قسم کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برسات کی دوپہر میں اُفق تا اُفق کالی گھٹا چھائی ہوئی ہو اور سورج نگاہوں سے دور ہو۔ خواب ناک سیاہی شب پر غالب اور ہلکی ہلکی مدھم روشنی جسے روشنی بھی نہیں کہا جا سکتا تھا، روشنی کے درمیان کی چیز جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا الفاظ کی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا تھا۔ یہ صرف احساس تھا۔ اس روشن تاریکی میں یا تاریک روشنی میں ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ میرے قدم اب جیسے میرے بس میں نہیں تھے۔ میں بالکل آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا اور مجھ سے آگے وردان سادھانی تھا۔ اس غار میں داخل ہوتے ہی شبھ آگمن...... دھم راج...... شبھ آگمن کا شور بلند ہوتے جا رہا تھا۔

دفعتہً ہی مجھے ایک تحریک ہوئی اور میں نے نقا استو کہہ کر اپنا ہاتھ بلند کیا۔ لیکن فوراً ہی مجھے اپنے ہاتھوں میں پستول کا احساس بھی ہوا۔ اس بے ضرر، تارک الدنیا ماحول میں پرستاروں کی موجودگی میں عالمِ خونریزی پر مجھے ایک شرمندگی کا سا شدید احساس ہوا اور میں نے تیزی سے پستول پتلون کی جیب میں سرکا لیا اور دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر استقبال کرنے والوں کا جواب دینے لگا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ ہوٹل کی سیڑھیوں سے چھلانگ لگانے کے بعد میرے دل و دماغ پر تعطل کی کیفیت کیوں طاری ہوئی تھی۔ خیالات کا سلسلہ وہاں سے شروع ہو کر امینہ کی چیخ تک پہنچا تھا کہ ایک بوڑھے بھکشو نے آگے بڑھ کر پھولوں کا ہار میرے گلے میں ڈال دیا اور پھر بڑے احترام سے میری کمر کے پیچھے ہاتھ رکھ کر میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دونوں طرف کھڑے ہوئے بھکشوؤں نے اوم نموستو...... اوم نموستو...... کے جاپ کے ساتھ میرے گلے میں ہار ڈالنے شروع کر دیئے۔ اور جب ہم غار کے اختتام پر پہنچے تو میرا گلا ہاروں سے بھرا ہوا تھا۔ وردان سادھانی بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ دیوار کے ساتھ پتھر کے تراشے ہوئے چبوترے پر ایک کشادہ استھان پر ہیرے کی تراشی ہوئی ایک مورتی رکھی تھی جس سے روشنی کی شعاعیں

نکل رہی تھیں۔ اس کے دائیں بائیں سونے کے برتن میں سلگتے ہوئے مصالحے ہلکی ہلکی خوشبو اور دھواں دے رہے تھے۔ پرشوتما نے مجھے یہاں ایک مجسمے کے پہلو میں بٹھا کر ایک خوشبودار شربت کا گلاس دیا اور جھک کر بولا۔

''اسے پی لیں مہاراج!''

میں تو اس وقت خود اپنے وجود سے دور تھا۔ چنانچہ میں نے اسے پی کر ایک عجیب سا سرور محسوس کیا۔ تبھی وردان سادھانی نے اپنے بھکشوؤں کو طلب کر کے ان دشواریوں کا ذکر کیا جو مجھے تختی حاصل کرنے میں پیش آئی تھیں۔ اور یہ کہ اس پراپتی کے لئے میں نے جو مہا بلیدان دیا وہ ایک یگ کی عبادت کے برابر تھا۔ وردان سادھانی نے کہا۔

''بھگوان کی یہ قیمتی مورتی اسی خزانے سے برآمد ہوئی تھی جو مہتر بدھ کی ملکیت تھا۔ اور ایک بار پھر مہتر بدھ کے ہاتھوں ہی یہ تختی دوبارہ نمودار ہوئی ہے۔''

تمام بھکشوؤں نے بیک آواز بھگوان کو کال کوٹھڑی سے نکالنے پر مبارکباد دی اور اس کے بعد کچھ منتر پڑھے جانے لگے۔ میں تو خاموش کھڑا ہوا تھا لیکن وردان سادھانی مسلسل یہ منتر پڑھ رہا تھا۔ دیر تک یہ آوازیں فضاؤں میں بلند ہوتی رہیں اور اس کے بعد وردان سادھانی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''دھم راج مہاراج! آپ کا بلیدان سویکار ہوا۔ آج سے آپ مہان شکتیوں کے مالک ہیں۔ ہر یدھ میں آپ کا وجے ہو گا۔ کوئی شاستر آپ کے جسم کو سپرش نہ کر پائے گا۔ آپ کی ہر شبھ کامنا پوری ہو گی۔ اوم نموستو بدھی۔'' تین بار یہ الفاظ دہرانے کے بعد اس نے پلٹ کر کہا۔

''کرپا کرم سا پتھ ہوا۔''

آخری جملہ سنتے ہی سب نے جھک کر پرنام کیا اور پھر ایک ایک کر کے وہ سب باہر نکلنے لگے۔ اب اس وقت ماشرہ اور وردان سادھانی میرے پاس بیٹھے۔ ماشرہ وہی بوڑھا آدمی تھا جس نے میری کمر پر ہاتھ رکھا تھا، بعد میں وردان سادھانی نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ مہتر بدھ کا دستِ راست اور غلامِ خاص تھا۔ وہ دونوں میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں نے وردان سادھانی سے کہا۔

''پریا بترا! میں اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان شکتیوں کا بھی جو آپ نے مجھے دی ہیں۔ مثلاً ہر معرکے میں فتح، ہر جگہ میری مدد، تمام ہتھیاروں سے محفوظ اور

میری ہر جائز خواہش کی تکمیل۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حق و صداقت کی شرط بھی ہے۔ تو اب آپ یہ بتائیے کہ مجھ جیسے دنیا دار کے لئے ذاتی مفاد سے ہٹ کر سوچنا ناممکن نہیں ہے کیا؟"

ماشرہ نے مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "خاقان جمشیدی! ہم نے تم پر کوئی پابندی تو نہیں لگائی ہے۔ لیکن سچائی اگر اپنی جگہ ایک بڑی طاقت ہے تو سچائی کے راستوں پر چلنے والوں کے لئے ہی ہے نا۔ اس راستے سے ہٹ کر چلنے والوں کو اس سے کس طرح فائدہ پہنچ سکتا ہے؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ میں بھی جانتا ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ سچائی کا فیصلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ ہر شخص اپنے آپ کو سچا ہی سمجھتا ہے۔"

میرے یہ الفاظ ان لوگوں کے لئے ذریعہ فکر تھے۔ کچھ لمحے خاموشی طاری رہی اور اس کے بعد وردان سادھانی نے کہا۔ "خاقان جمشیدی! مرتبے کے لحاظ سے تم مجھ سے بہت بڑے ہو اور میں تمہیں سمجھانے یا حکم دینے کا مجاز نہیں ہوں۔ لیکن اتنا میں ضرور کہوں گا تم سے کہ حق اور ناحق کے فیصلے انسان نہیں کر سکتا۔ یہ صرف آسمانوں میں ہوتے ہیں اور ہمیشہ آسمانوں ہی میں ہوں گے۔ ماشرہ نے جو کچھ تم سے کہا اس کا مطلب ہے کہ جو طاقتیں تمہیں دی گئی ہیں وہ صرف اسی وقت تمہارا ساتھ دیں گی جب تم حق پر ہو اور سچائی کے لئے لڑ رہے ہو، تمہارے سامنے کوئی عظیم مقصد ہو۔ غلط اقدام یا ذاتی اغراض و مقاصد نہ ہوں۔ لیکن نہیں، یہ نہیں کہنا چاہئے۔ تم بہت بڑے انسان ہوں دھم راج۔ تم سے کسی غلط اقدام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"

اب میرے ہنسنے کی باری تھی۔ میں نے کہا۔ "میں بہت بڑا انسان ہوں۔ لیکن ایک بات میں بھی تمہیں بتا دوں ماشرہ اور وردان سادھانی، عظیم انسان بننے کے لئے تو بہت سے بندھن توڑنے پڑتے ہیں اور میں ابھی انہیں نہیں توڑ پایا اور شاید کبھی نہ توڑ پاؤں کیونکہ ان بندھنوں کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ یہ ایک دوسرے میں اس طرح الجھے ہوئے ہیں کہ انہیں سلجھانا ممکن نہیں ہے اور توڑتے توڑتے انسان خود ٹوٹ جاتا ہے۔ مجھے بتاؤ، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

کچھ لمحات کے لئے ادھر خاموشی طاری ہوگئی اور وہ لوگ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر کچھ دیر کے بعد وردان سادھانی نے گردن اٹھائی اور بولا۔ "تیاگ...... دھم راج،

تیاگ...... تیاگ ایک ہی جھٹکے میں تمام بندھنوں کو توڑ ڈالتا ہے۔"

"تیاگ؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "تیاگ زندگی سے شکست کھا جانے کا نام ہے وردان سادھانی! تیاگ ایک فرار ہے۔ تیاگ ایک صورت ہے، تیاگ سے کوئی بندھن نہیں ٹوٹتا، انسان ٹوٹ جاتا ہے اور خود ٹوٹ جانے کو بندھن ٹوٹ جانا سمجھتا ہے حالانکہ بندھن اپنی جگہ برقرار رہتے ہیں اور ان لوگوں کو توڑنے پڑتے ہیں جن کو وہ بندھنوں میں جکڑا ہوا چھوڑ آیا۔ سمجھ گئے یا اور کھل کر کہوں؟"

"فرمائیے مہاراج، آپ فرمائیے......" وردان سادھانی نے کہا۔

"سنو...... میں خاقان جمشیدی ہوں۔ مجھے ایک بات کا جواب دو، آخر تم نے ایک غیر قوم اور ایک غیر مذہب کو وہ درجہ کیوں دیا ہے جو تمہیں اپنے ہی مذہب کے کسی شخص کو دینا چاہئے تھا؟"

"دین دھرم ساری چیزیں بعد میں آتی ہیں مہاراج! ایک بات مجھے بتائیے، جب آپ کسی گھر میں پیدا ہوتے ہیں تو آپ کا دھرم کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ بات آپ کو معلوم ہوتی ہے کہ آپ کون سے دھرم میں پیدا ہوئے ہیں؟ مہاراج، جو دھرم آپ کے ماتا پتا کا ہوتا ہے وہیں سے آپ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس جہان میں جتنی بڑی آبادی ہے اس میں سے دس فیصد بھی ایسے نہیں ہوں گے جنہوں نے سوچ سمجھ کر کوئی دھرم اپنایا ہو۔ بس جس دھرم میں وہ پلتے ہیں وہی ان کا دھرم بن جاتا ہے۔ تو انسان پہلے، دھرم بعد میں۔ اور ایک انسان بدھا کے چرنوں میں بیٹھا ہوا نظر آتا ہے اور بدھا کا سایہ اس کے سر پر ہوتا ہے تو وہی ہمارے لئے بدھی ستو ہے۔ وہی نموستو وردان ہے۔ مہاراج، ہم نے آپ کو ایسا ہی پایا اور آپ کو کیا پتہ کہ کون سی روشنی آپ پر چمک رہی تھی۔ یہ تو آپ کو اس سے پتہ لگے گا جب آپ مہتر بدھ بن کر دھرم کی روشنی پھیلائیں گے۔ نتھا ستو کہہ کر سنسار واسیوں کے دکھ کا وردان بنیں گے۔ مہاراج، آپ کو یہ مرتبہ ملا ہے۔"

"مگر میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی، میں نیک راستوں کا راہی تھا۔ بے شک میرے والد ایک عیاش طبع آدمی تھے لیکن میں نے جس ماحول میں پرورش پائی اس میں برائیوں کو میں نے اپنے قریب نہیں آنے دیا تھا۔ اور پھر وہ واقعہ ہو گیا جو میرے بچپن میں ہی پیش آیا تھا۔ مجھے یوں لگتا ہے وردان سادھانی، کہ برائی کے راستے میری جانب لپکتے رہے اور تم مجھے نیکیوں کا درس دیتے رہے۔ مجھے برائی کی جانب جانے ہی کیوں دیا

گیا جبکہ ہر جگہ میری نگرانی کی جاتی رہی تھی؟"

"یہ ضروری تھا مہاراج، یہ ضروری تھا۔ نیکیاں کرنے کے لئے برائیوں کو جاننا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔"

"مگر انسان اندر سے تو مر جاتا ہے۔"

"اندر کا جیون ہی تو سب سے بڑا ہوتا ہے اور اس کے اندر نیکی اور برائی کی تمیز ہو جاتی ہے۔"

"تم کہہ رہے ہو جس لڑکی کو میں تنہا اور اکیلا چھوڑ آیا ہوں اس کی تڑپ میرے دل میں ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ سری لنکا کے گاشر برہم اور اس مندر سے وہاں تک کا سفر میرے لئے کیسے ممکن ہوگا۔"

وردان سادھانی ہنسنے لگا، پھر بولا۔ "یہ صرف آپ کا خیال ہے دھرم راج! آپ نہ کہیں گئے نہ آئے، یہ سب موہ مایا کا دھوکا ہے۔ آنکھیں بند کر کے دیکھئے، آپ جن حالات میں گرفتار تھے، انہی میں اب بھی ہیں۔ کون کہتا ہے کہ آپ وہاں سے دور گئے ہیں۔ یہ صرف من کی مایا ہے۔ من کی مایا۔ آپ ذرا ایک منٹ کے لئے آنکھیں بند کیجئے۔ کیجئے آنکھیں بند۔ آنکھیں بند کیجئے۔"

مجھے یوں لگا جیسے میری پلکوں کے پپوٹے جڑے جا رہے ہوں...... صرف ایک لمحے کے لئے، صرف ایک لمحے کے لئے میری آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔

☆

وہ ایک لمحہ ہی بہت کچھ تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں پھر سے بے وزن ہوگیا ہوں...... میرا وجود ہوا میں معلق ہوتا محسوس ہوا۔ دوسرے لمحے میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اسی ہوٹل کے زینے کے سامنے کھڑا ہوا تھا، وہی گرد و پیش تھے، وہی نیم تاریک ماحول۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا اور زمین پر پاؤں ٹکتے ہی ایک لمحے کے اندر میرے حواس جاگ اُٹھے اور میں چھلانگ لگا کر گیٹ کی طرف دوڑا۔

اسی وقت دائیں سمت کی کوٹھڑی سے یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے اور گولیاں میرے کندھے کے قریب سے سنسناتی ہوئی گزر گئیں۔ میں پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ راستے پر ایک کار دھول اڑاتی ہوئی جا رہی تھی۔ موڑ پر پہنچتے ہی مجھے اینہ کی چیخ سنائی دی تو میں تیزی سے اس کے پیچھے دوڑا۔ لیکن جب موڑ پر پہنچا تو کار کافی آگے نکل چکی تھی۔ میں وقت ضائع کئے بغیر پلٹا اور ہوٹل کی طرف دوڑا۔ دروازے پر پہنچ کر مڑتے مقبرے کی طرف سے صرف ایک فائر ہوا لیکن میں اندر داخل ہو چکا تھا۔ فائر خالی گیا اور مجھے اس طرف دھیان دینے کی فرصت نہ مل سکی۔ میں جلد از جلد ٹیکسی تک پہنچنا چاہتا تھا جو بائیں جانب دالان میں کھڑی ہوئی تھی۔ باہر نکل کر جس کوٹھڑی سے مجھے دو فائر کئے گئے تھے، اس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتا ہوا میں جھپٹ کر ٹیکسی کے پاس پہنچا۔ پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ڈرائیور بندھا ہوا پچھلی سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے رومال باندھ دیا گیا تھا۔ میں نے اس کا منہ اور ہاتھ پاؤں کھول کر سیٹ پر بٹھایا۔ اس کے حواس بحال ہونے میں خاصا وقت لگا تھا۔ دوسرے لمحے وہ چیخ کر بولا۔

"صاحب! آپ پر حملہ تو نہیں ہوا؟"

میں نے تیزی سے اگلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "پہلے تم اسٹیئرنگ پر آؤ اور گاڑی نکالو۔ وہ خانم کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

ڈرائیور ایک دم مستعد ہوگیا اور چھلانگ لگا کر باہر نکلا، پھر اگلی سیٹ پر پہنچ گیا۔ گاڑی

اسٹارٹ کر کے باہر نکالتے ہوئے بولا۔

"یہ تو بڑا غضب ہو گیا صاحب! میرے ہاتھ پاؤں صحیح کام نہیں کر رہے۔"

"اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد تمہاری اعصابی کیفیت بہتر ہو جائے گی۔" میں گھوم کر اس کے برابر آ بیٹھا۔ گاڑی بیک ہو کر گیٹ سے نکلنے لگی۔ میں نے کوٹھڑیوں اور دالانوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیسے مردہ لوگ ہیں یہ۔ اتنی دیر سے ہنگامہ برپا ہے اور کسی میں جھانک کر دیکھنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ واقعی انسان جتنا ذلیل اور مفلوک الحال ہوتا اتنا ہی زیادہ زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔"

میرا غصہ عروج کو پہنچا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گاڑی نے بائیں جانب ٹرن لیا، ہوٹل کی دیوار کا فاصلہ طے کیا، پھر بائیں جانب مڑی اور سڑک پر آتے ہی اس کی اسپیڈ تیز ہونے لگی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکالے اور ڈرائیور کی جیب میں سرکاتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہارا پیشگی انعام ہے۔"

اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور جیب سے نوٹ نکالنے لگا۔ "نہیں صاحب! اب بات نوٹوں کی نہیں رہی ہے۔"

"بس بس ٹھیک ہے۔ تمہارے اعصاب کام کرنے لگے ہیں نا، میں یہی دیکھنا چاہتا تھا۔"

"ٹھیک ہے صاحب، لیکن یہ وقت انعام کا نہیں ہے۔ ہمیں پہلے ان سے نمٹنا ہے۔ اور اب تو انہوں نے مجھے بھی اس لڑائی میں گھسیٹ لیا ہے۔"

"صرف گاڑی چلاتے رہو۔ میں اپنا اور تمہارا قرض ان سے وصول کر کے دکھا دوں گا۔"

ڈرائیور نے ایکسیلیٹر پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا اور گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔ پہاڑی سلسلے کے ایک موڑ سے گزرتے ہی اس دوسری گاڑی کا پچھلا حصہ دکھائی دینے لگا۔ میں نے پستول نکالتے ہوئے کہا۔ شاباش...... وہ جا رہی ہے۔ اور اسپیڈ بڑھاؤ۔"

ڈرائیور نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ چار پانچ ہیں صاحب۔"

"تم فکر ہی مت کرو۔ پرواہ نہیں ہے۔ تم اوور ٹیک کر کے سامنے سے روکنے کی

کوشش کرو۔ میں انہیں فائر کرنے کا موقع نہیں دوں گا۔"

ڈرائیور نے اسپیڈ کچھ اور بڑھائی۔ اگلی گاڑی سے ہمارا فاصلہ کم سے کم ہوتا چلا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس خطرناک راستے پر بہت تیز گاڑی دوڑانا بہت دل گردے کا کام تھا جبکہ ہمارا ڈرائیور یہ ظاہر کر چکا تھا کہ وہ ایک اچھا ڈرائیور ہے۔ چنانچہ رفتار اور بڑھی اور فاصلہ کم سے کم ہوتا چلا گیا۔ میں نے ونڈ شیلڈ کو تھوڑا اوپر اٹھا کر گاڑی کے ٹائر کا نشانہ لیا۔ اسی وقت سامنے سے فائر ہوا اور پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ دو فائر تو اوپر سے گزر گئے، ایک بائیں مڈگارڈ پر لگا۔ بند گاڑی ہونے کی وجہ سے وہ دونوں کھڑکیوں ہیں سے فائرنگ کر رہے تھے اس لئے صحیح نشانہ لینا ممکن نہیں تھا، اگر کوئی گولی اتفاقیہ طور پر ہمیں لگ جائے تو اور بات تھی۔

ہمارا درمیانی فاصلہ کم سے کم ہوتا جا رہا تھا اور ادھر سے مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں نے ونڈ شیلڈ تھوڑا سا اور اٹھایا اور ٹائر پر یکے بعد دیگرے کئی فائر کئے۔ چوتھے فائر کے ساتھ ہی ٹائر کے برسٹ ہونے کی آواز بھی سنائی دی۔ ڈرائیور نے ٹائر کا دھماکا سنتے ہی ایکسیلیٹر پر سے پاؤں اٹھا لیا اور کلچ دبانا شروع کر دیا۔ ہماری گاڑی کی رفتار تیزی سے کم ہونے لگی۔ ٹائر پھٹتے ہی دوسری گاڑی ٹیڑھی ہو گئی اور جھٹکے کھا کر لڑکھڑانے لگی۔ اس مسئلے پر ڈرائیور ایکسپرٹ ہوتا تو فوراً گاڑی روکنے کی کوشش کرتا۔ مگر وہ روکنے کی بجائے اسی رفتار پر سنبھالنے کی کوشش کئے جا رہا تھا اور اس کے ساتھی کھڑکیوں میں سے فائر کئے چلے جا رہے تھے۔ یہ سلسلہ کچھ دیر اسی طرح جاری رہا۔ لڑکھڑاتی گاڑی سے فائر کرنا حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ گولیاں ضائع کئے جا رہے تھے۔ گاڑی کی رفتار اس وقت دس میل سے بھی کم تھی۔ میں نے ڈرائیور کو رفتار اور کم کرنے کو کہا اور اسی وقت سامنے والی گاڑی جھٹکا کھا کر بائیں جانب جھک گئی اور اس طرف کی کھڑکی سے فائر کرنے والے کا جسم جھٹکے کے ساتھ آدھے سے زیادہ باہر نکل آیا۔ گاڑی دوبارہ سیدھی ہونے سے پہلے میں نے اس کا نشانہ لے کر فائر کیا اور وہ گاڑی سے پھسل کر باہر گر پڑا۔ اس کے دوسرے ساتھیوں نے شور مچایا اور لڑکھڑاتی ہوئی گاڑی دس قدم پر جا کر رک گئی۔

ہمارے ڈرائیور نے گاڑی روکتے روکتے دونوں وہیل سڑک پر پڑے ہوئے آدمی پر سے گزار دیئے اور دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگا۔ اگلی گاڑی کا دائیں جانب والا دروازہ کھلا اور ایک آدمی نے نیچے کودتے ہوئے ڈرائیور پر فائر کر دیا۔ وہ تیزی سے گھٹنوں کے بل

بیٹھ گیا۔ میں نے تیزی سے دروازہ کھول دیا۔ ٹانگیں باہر نکالیں اور گولی ونڈ اسکرین کو توڑتی ہوئی میرے سر کے پاس سے گزر گئی۔ دوسرے لمحے میں نے فائر کرنے والے کو سڑک پر گرتے دیکھا۔ میں نے باہر نکل کر اپنی گاڑی کے انجن کا کور لے کر سامنے والی گاڑی سے نکلنے والے تیسرے آدمی پر فائر کیا۔ گولی اس کے دائیں بازو پر لگی اور اس کا ریوالور چھوٹ گیا اور وہ بائیں ہاتھ سے بازو کو تھام کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ میں انجن کے سامنے سے گھوم کر دائیں طرف آیا۔ ٹھوکر سے اس کا پستول دور پھینکا۔ اس طرف میرا ڈرائیور دوسرے آدمی کا پستول تھامے اس کے سینے پر سوار تھا۔ میں نے اس کے سر کا نشانہ لیا لیکن وہ دونوں بری طرح الجھے ہوئے تھے اور اتنی تیزی سے الٹ پلٹ ہو رہے تھے کہ گولی چلانے میں اپنے ڈرائیور کو نشانہ بنا دینے کا خطرہ محسوس ہوا۔ میں نے پستول نیچے کر کے پوری طاقت سے اس کے سر پر بوٹ کی ٹھوکر لگائی اور وہ ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ اس کا پستول میرے ڈرائیور کے ہاتھ میں آ گیا اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''زندہ باد'' کہہ کر میں اپنے سامنے والی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس کا ڈرائیور فرار ہو چکا تھا اور امینہ پچھلی سیٹ پر بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے امینہ کو اٹھانے کی کوشش کی تو وہ لاش کی طرح سیٹ سے لڑھک گئی۔ میں نے زخمی بازو والے آدمی کو بھاگنے کی کوشش کرتے دیکھ کر اس کی کمر کا نشانہ لیا۔ وہ دھماکے کے ساتھ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ میں نے اپنے ڈرائیور کو پکارا اور پھر امینہ کی طرف متوجہ ہوا۔ امینہ کی نبض ساکت ہو چکی تھی لیکن دل کی حرکت بہتر تھی۔ میرا ڈرائیور آواز سن کر دوڑتا ہوا آیا اور ہانپتا ہوا کہنے لگا۔

''نکل گیا صاحب...... ڈرائیور نکل گیا۔''

''کوئی بات نہیں، اسے بھی دیکھ لیں گے۔ اسے سنبھالو۔''

''اچھا۔'' اس نے جھک کر امینہ کے تنفس کا جائزہ لینے کی کوشش کی، پھر بولا۔ ''خانم بے ہوش ہیں صاحب!''

''ہاں، چلو انہیں اپنی گاڑی میں ڈالو۔ اور پانی...... لیکن پانی یہاں کہاں سے آیا۔ خیر ہمیں قاہرہ پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ صبح ہونے والی ہے۔ جلدی کرو۔''

ہم دونوں نے مل کر امینہ کو اٹھایا اور گاڑی میں لا کر پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ ڈرائیور نے فوراً ہی اسٹیئرنگ سنبھال کر گاڑی بیک کی، پھر ٹرن لے کر تیزی سے قاہرہ کی طرف چل پڑا۔ میں بھی پچھلی سیٹ پر ہی بیٹھ گیا تھا اور میں نے امینہ کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔

میں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔ کوئی چند میل کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ ڈرائیور نے کہا۔

''صاحب! قاہرہ جانا مناسب نہیں ہے۔ ہماری گاڑی کا ونڈ اسکرین ٹوٹا ہوا ہے، گاڑی گرد آلود ہو رہی ہے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی گرفتار ہو جائیں گے۔''

''تو پھر کسی قریے میں چلو۔''

''نہیں صاحب! گاڑی کو سڑک سے اتارنا خطرناک ہے۔ کھوجی زمین سونگھ کر بتا دیں گے کہ ہم کس طرف گئے ہیں۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ہم پولیس کے نرغے میں ہوں گے۔''

''تو پھر کیا، کیا جائے؟'' میں نے جھلا کر کہا۔

''بہتر یہی ہے کہ آپ خود پولیس اسٹیشن پہنچ جائیں اور تمام واقعہ بیان کر دیں۔ ہمیں ہوٹل سے گواہ مل جائیں گے۔'' وہ بولتے بولتے رُک کر سوچنے لگا، پھر بولا۔ ''نہیں، شاید کوئی شہادت دینے کو تیار نہ ہو۔ اصل میں ہشمان ذکری بہت خطرناک چیز ہے، اس کا نام آتے ہی لوگ کانپ جائیں گے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا، کیا جائے۔''

''قاہرہ کے مضافات میں تمہارا کوئی دوست وغیرہ نہیں ہے؟''

''ایسا کوئی نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جا سکے۔ اگر روپیہ دے کر ان کے منہ بند کرنے کی کوشش کی جائے تو ان کے منہ پھیلتے جائیں گے اور......''

''میں سمجھ گیا۔ تمہارے خلوص کا بہت بہت شکریہ۔ چلے چلو، شاید کسی نخلستان یا مضافاتی باغ میں پانی مل جائے۔ بس یہ ہوش میں آ جائے تو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔''

ڈرائیور نجانے کیوں سوچ میں ڈوب گیا، پھر آہستہ سے بولا۔ ''اور اگر یہ ہوش میں نہ آئیں تو؟''

''اللہ مالک ہے، دیکھا جائے گا۔'' میں ایک بار پھر امینہ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا لیکن اس پر ہلانے جلانے کا کوئی اثر نہیں تھا۔ میں نے ڈرائیور کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''میری سمجھ میں آتا ہے صاحب! لیکن آپ کی ناراضگی۔''

''میں تم سے ناراض نہیں ہوں گا میرے دوست۔ تم میرے دوست ہو۔''

''جن حالات میں آپ ہیں صاحب، اب تو میں بھی آپ کے ساتھ شامل ہو چکا ہوں، ایک بات کہوں آپ سے۔''

"ہاں بولو۔"

"آپ کے لئے لاش گلے میں ڈال کر پھرنا موت کو دعوت دینا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ......" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

"مگر یہ ابھی زندہ ہے، مری نہیں ہے۔"

"صاحب معافی چاہتا ہوں۔ یہ لاش بے شک ابھی نہیں ہے لیکن ہو جائے گی۔ اور میں یہ جانتا ہوں کہ یہ آپ کی بیوی نہیں، محبوبہ ہے۔ صاحب! یہ تو زندگی کے کھیل ہوتے ہیں، اور بہت سی مل جائیں گی آپ کو۔ اپنی زندگی بچانے کی کوشش کیجئے۔"

نجانے کیوں میرے بدن میں ایک لرزش سی پیدا ہو گئی۔ وہ واقعی غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ میں یہاں جن حالات میں گھرا ہوا تھا ان کو دیکھتے ہوئے اس کا مشورہ بہت بہتر تھا۔ اب اس بیچارے کو کیا معلوم کہ امینہ نے میرے لئے کتنی بڑی قربانی دی ہے یا میں اس کے لئے کس حد تک جا سکتا ہوں۔ ڈرائیور جیسے میرے جواب کا انتظار کرتا رہا، پھر گھڑی کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"چار بجنے والے ہیں صاحب، دو گھنٹے بعد دن نکل آئے گا اور پھر یہ چانس ہاتھ سے نکل جائے گا۔ آپ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اگر شہر میں داخل ہونے کے بعد ڈاکٹر انہیں ہسپتال یا پولیس اسٹیشن جانے کا مشورہ دے تو آپ اس پر عمل کر سکیں۔"

میں نے ایک گہری سانس لی، ڈرائیور کے الفاظ پر میرا دل ڈوبنے لگا۔ ڈرائیور کو جواب دینے کی بجائے میں نے جھک کر امینہ کے منہ پر منہ رکھا اور پوری قوت سے اسے تنفس دینا شروع کر دیا۔ دو تین مرتبہ یہ عمل کیا ہو گا کہ امینہ کے تنفس میں باقاعدگی رونما ہونے لگی۔ میں نے اس کے سینے کا اتار چڑھاؤ دیکھ کر بائیں جانب کان رکھ کر دل کی دھڑکن کا جائزہ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد نبضیں اعتدال پر آنے لگیں اور اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ میں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"امینہ...... امینہ! ہوش میں آؤ۔" امینہ کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں اور پھر اس نے میری کلائی پر گرفت کر لی۔ پھر اس کی کمزور آواز ابھری۔

"اب ٹھیک ہوں میں۔ تم کہاں رک گئے تھے؟ ان ظالموں نے تو میرا......" وہ گ
پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ امینہ میرے کندھے پر سر رکھ کر سسکیاں لینے لگی تو ڈرائیور نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے جناب! کیا حکم ہے؟"

"اسی طرح آہستہ آہستہ چلتے رہو۔ قاہرہ کے مضافات میں ہمیں اتار کر پہلے گاڑی کی مرمت کراؤ اور پھر......"

"یہ خطرناک ہو گا جناب! آپ مقامی زبان نہیں جانتے۔ اور خانم شاید ہی پیدل چل سکیں۔ اگر پھر بے ہوش ہو گئیں تو مصیبت ہو جائے گی۔"

میں نے امینہ کے چہرے کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "اب کیسی ہو امینہ! یہ بتاؤ۔"

"گاڑی سے اترنے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے اسے تفصیل سے وجہ سمجھائی تو وہ بولی۔ "پھر تو بہتر یہی ہے کہ ہم کسی نخلستان میں اتر جائیں۔ ڈرائیور گاڑی لے کر چلا جائے اور شہر میں جا کر شیشے وغیرہ تبدیل کرائے۔ پھر واپس آ کر ہمیں لے جائے۔"

"کیا خیال ہے دوست، سنا تم نے؟"

"جی صاحب، ٹھیک ہے، سن لیا۔ خانم اب ٹھیک ہیں، ایسا ہی کرتے ہیں۔ اگر گاڑی ٹھیک ہونے تک اس واقعے کی اطلاع شہر میں نہ پہنچے تو پھر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں آپ کے لئے کھانے پینے کا سامان بھی لیتا آؤں گا۔ اور پھر قاہرہ یا جہاں آپ کہیں وہاں جائیں۔"

میں نے امینہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "قاہرہ کے سوا اور کہاں جا سکتے ہیں۔"

"ہاں بالکل۔"

"اگر قاہرہ ہی جانا ہے صاحب! تو میرے ذہن میں ایک اور ترکیب آئی ہے۔ قاہرہ کے اس طرف نخلستانی حصے میں ایک ہوٹل ہے۔ میں قاہرہ کو بائیں جانب چھوڑ کر آپ کو اس طرف نکال لے جاتا ہوں۔ اس ہوٹل میں آپ کا قیام کرا کے واپس قاہرہ آ کے گاڑی ٹھیک کرا لوں گا۔"

"یہ تو بہت بہتر ہے۔ گویا تم یہ چاہتے ہو کہ مخالف سمت سے قاہرہ داخل ہونے پر اسکندریہ والی سڑک کے واقعے سے اس گاڑی کا کوئی تعلق ثابت نہ ہو سکے۔"

"بالکل یہی جناب! پانچ میل کا چکر کوئی بڑا چکر نہیں ہے اور صبح ہونے تک وہاں پہنچ جانے پر کسی کو معلوم بھی نہیں ہو سکے گا کہ ہم کس طرف سے آئے ہیں۔"

"پھر ٹھیک ہے۔ چلو۔" اور اس کے بعد ڈرائیور نے گاڑی سنبھال لی۔ اور اس بار

گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ ہم نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر میں مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ ڈرائیور کچھ کہہ رہا تھا لیکن مجھ پر نیند کا غلبہ ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی ہوں ہاں کرتا جا رہا تھا۔ ڈرائیور کی آواز ابھری۔

''صاحب، سوئیے نہیں۔ باتیں کیجئے، مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔ اگر سو گیا تو جانتے ہیں کیا ہوگا؟''

''سو جاؤ یار پھر۔'' میں نے کہا اور ڈرائیور زور سے ہنسا اور بولا۔

''سو جاؤں؟''

''ہاں ہاں، سو جاؤ۔'' میں نے غنودگی کے عالم میں کہا۔

''اور ایکسیڈنٹ میں جو کچھ ہوگا صاحب اس کا آپ کو اندازہ ہے؟''

ایکسیڈنٹ کا نام سن کر میں ایک دم ہوش میں آ گیا اور میں نے کہا۔

''کیا کہہ رہا تھا میں؟''

''آپ مجھے بھی سونے کا مشورہ دے رہے تھے۔''

''نہیں نہیں، سوری۔ چلو باتیں کرو۔''

بہرحال ڈرائیور مجھے وہ واقعات بتانے لگا۔ اس نے بتایا کہ وہ ان لوگوں کو پہچان گیا ہے۔ وہ ذکری ہی کے آدمی تھے۔ انہوں نے ہوٹل میں پہنچ کر اچانک اسے پیچھے سے آ کر خاموش رہنے کے لئے کہا اور پھر باندھ کر ٹیکسی میں ڈال دیا۔ میں خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ بولا۔

''آپ سو گئے کیا؟''

''نہیں، میں جاگ رہا ہوں۔ دراصل میں خاموش اس لئے ہوں کہ مجھ کو خانم کی چیخ سن کر مدد کو پہنچنے میں دیر ہو گئی۔'' یہاں تک پہنچ کر ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ دفعتہ مجھے خیال آیا کہ میں اسے جو کچھ بتاؤں گا وہ اس کے لئے قابل یقین نہیں ہوگا۔ اس نے مجھے خاموش ہوتے دیکھ کر کہا۔

''آپ اس وقت سو رہے تھے صاحب؟''

''نہیں، زینے پر پستول لئے تیار کھڑا تھا۔ بس کچھ لمحوں کی دیر ہو گئی۔''

اس نے گردن گھما کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پھر آپ یقیناً کھڑے کھڑے سو گئے ہوں گے۔ خیر اب نہ سوئیے گا۔ آگے پہاڑی سلسلہ آ رہا ہے۔ راستہ بہت خطرناک ہے

اور میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہوئی جا رہی ہیں۔ کاش ایک پیالی چائے مل جاتی۔''

''تیز چلاؤ۔ تاکہ ہم جلدی ہوٹل پہنچ جائیں۔'' میں نے کہا۔

''زیادہ تیز نہیں چلا سکتا جناب! چڑھائی شروع ہو چکی ہے۔''

میں نے پھر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی اور اینہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اینہ بے خبر سو رہی تھی۔ گاڑی بلندی پر چڑھتی بار بار مڑتی اور گھومتی جا رہی تھی۔ یہ وہ راستہ نہیں تھا جس سے ہم یہاں تک آئے تھے۔ بلندی پر پہنچنے کے ساتھ ہی ہر موڑ پر سڑک کے کنارے کنارے بڑے بڑے پتھروں پر سفید کر کے خبردار لکھا گیا تھا۔ سڑک پر دو طرف ٹریفک گزرنے کے لئے کہیں کہیں چٹانیں کاٹ کر کشادہ کر لی گئی تھیں۔ میں کھڑکی سے جھانک کر نشیب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں بھی سبزے کا نام و نشان نہیں تھا۔ درخت نہ جھاڑیاں، حد نظر تک دشت بے آب و گیاہ۔ کہیں کہیں کھجور کے درختوں کے جھنڈ نظر آتے تھے۔ انتہائی وحشت ناک ماحول تھا۔ ڈرائیور بھی خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ بمشکل ایک منٹ گزرا ہوگا کہ گاڑی کسی چیز سے ٹکرائی اور ایک زبردست جھٹکا لگا۔ ساتھ ہی ڈرائیور کی چیخ سنائی دی۔

''یا اللہ!''

میں نے آنکھیں کھلتے ہی دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ ڈالا۔ دروازہ کھل گیا۔ اسی وقت گاڑی نیچے لڑھکنے لگی...... ایک لمحے میں میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ میں نے باہر چھلانگ لگا دی۔ دوسرے لمحے گاڑی کا پچھلا حصہ پتھروں سے اوپر اٹھا اور گاڑی ڈھلان پر لڑھکنیاں کھاتی ہوئی گہرائیوں میں جانے لگی...... میں نے سڑک کی طرف لڑھک کر آنکھیں بند کر لیں...... آہ، میرا عزیز ترین رفیق سفر اور ایک قابل اعتماد انسان، جو مختصر سے عرصے میں بہترین دوست بن چکا تھا اس طرح موت کے منہ میں جاتے دیکھنے کی تاب مجھ میں نہیں تھی...... اس صدمے نے مجھے بری طرح ہلا کر رکھ دیا تھا۔

کچھ دیر بے حس و حرکت پڑا رہنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اس دوران میں گاڑی کو انتہائی گہرائیوں میں جاتے دیکھتا رہا تھا۔ اور پھر ان گہرائیوں نے گاڑی کو نگل لیا...... نہ کوئی دھماکا ہوا نہ شعلے بھڑکے۔ ہر طرف خاموشی اور اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں کچھ دیر تک دیوانوں کی طرح نیچے دیکھتا رہا۔ دور دور تک پتھروں کی چھوٹی بڑی چٹانیں نظر آ رہی تھیں...... گاڑی اس طرح گم ہو گئی تھی جیسے

اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو! میرے دل پر چوٹ لگی اور آنکھیں بھر آئیں۔ یہ حادثہ اس قدر تیزی سے ہوا تھا کہ بدحواسی میں مجھے امینہ کا خیال تک نہ رہا اور جان بچانے کے فطری جذبے سے مغلوب ہو کر میں نے اندھا دھند چھلانگ لگانے کے سوا اور کچھ نہ سوچا۔

اے کاش! کاش! گاڑی کا دروازہ کھلنے میں ایک لمحے کی دیر ہو جاتی اور میں بھی ان دونوں کے ساتھ ہوتا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ ہینڈل پر ہاتھ پڑتے ہی دروازہ کھل گیا اور میں اس طرح باہر نکل گیا جیسے کسی نادیدہ قوت نے اٹھا کر چٹان پر رکھ دیا ہو۔

میری آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے ٹپک کر رخساروں پر بہہ گئے اور میں انسانی جبلت پر بے اختیار غور کرنے لگا۔ میں خاقان جمشیدی، جو اس وقت تک اختیاری اور غیر اختیاری طور پر حالات سے مجبور ہو کر متعدد قتل کر چکا تھا اور انسانی زندگی کو اب کیڑے مکوڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا تھا، قانون مکافات کا شدت سے قائل ہونے کے باوجود اپنے دو رفیقوں کی الم ناک موت پر رو رہا تھا۔ ذہن کی اس نئی کروٹ سے مجھے اپنا کردار مضحکہ خیز نظر آنے لگا۔ حیات نے ایک اور پلٹا کھایا اور شام سے اس وقت تک گزرے ہوئے تمام واقعات میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے اور میں سحر زدہ ہو کر ان میں ڈوب کر رہ گیا۔ آج کی رات میرے عروج و زوال کی رات تھی۔ کامیابی اور ناکامی کی رات تھی۔ خطرناک دشمنوں پر غالب ہو کر مغلوب ہو جانے کی رات تھی۔ اور ابھی تو یہ رات باقی ہے۔ ابھی نجانے کب اس کی سحر ہو گی۔ پتہ نہیں سحر ہو گی بھی یا نہیں ہو گی۔ ویسے اب مجھے صبح شام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرے لئے کوئی سحر شادمانی یا مسرت کا پیغام لے کر نہیں آ سکتی تھی۔ کاش! اس رات کے اندھیرے مجھے نگل لینے کے بعد دن کے اجالے میں تبدیل ہوں۔ کاش...... کاش......

مجھے بڑے زور کا چکر آیا۔ ٹانگیں کانپنے لگیں اور میں خود کو گرتا ہوا محسوس کر کے ایک پتھر کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ دل شکستہ، مایوس اور افسردہ جسم پر ایک خراش تک نہ آنے کے باوجود زخموں سے چور بیٹھتے ہی نظروں کے سامنے پھر وہ تمام مناظر آنے لگے اور یوں لگا جیسے میرے دماغ میں کوئی چرخی سی چل رہی ہو۔ آنکھوں کے سامنے شدید اندھیرا آیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیفیت کتنی دیر تک رہی۔ لیکن میں جب چونک کر بیدار ہوا تو صبح نہیں ہوئی تھی۔ میرے بیدار ہونے کی وجہ کسی کار کے انجن کی آواز تھی۔ سڑک پر اس کی روشنیاں گردش کر رہی تھیں۔ دوسرے لمحے کار میرے قریب آ کر رک گئی۔ میں آنکھیں

پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اسٹیئرنگ پر ایک شخص عربی لباس میں ملبوس بیٹھا ہوا تھا۔ پچھلی سیٹ پر کوئی عورت تھی جس کا چہرہ مخصوص عربی انداز میں کالے نقاب سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک انتہائی نفیس اور پُرسحر خوشبو اس کے وجود سے اٹھ رہی تھی۔ دفعتہً اس کی آواز ابھری۔

"یہاں مرنے کا ارادہ ہے؟ آؤ، کار میں بیٹھ جاؤ۔"

حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ الفاظ اردو میں ادا کئے گئے تھے اور تلفظ بھی انتہائی نفیس تھا۔ ذہن کے پردے پر ایک لہر سی گزر گئی۔ یہ حسین آنکھیں جو میری نگاہوں کے سامنے ہیں، کہیں دیکھی ہیں میں نے۔ اور یہ آواز، دماغ ہی خراب ہوا ہے شاید۔ صحرائے مصر کے ان پُرخطر راستوں پر اتفاقیہ طور پر ایک گاڑی میں بیٹھی ہوئی ایک عورت بھلا میری شناسا کیسے ہو سکتی ہے؟ اصل میں ہر ایسے وجود کو ہوس کی آنکھ سے دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ ہر عورت جانی پہچانی محسوس ہوتی تھی۔ امینہ تو خیر اپنا سفر پورا کر کے میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ ظاہر ہے اب میں بھٹکنے والوں میں سے تھا۔ ابھی انہی سوچوں میں گم تھا کہ وہی حسین آواز مجھے پھر سنائی دی۔

"دیوانے ہو چکے ہو تم، کیا سماعت سے بھی محروم ہو؟ بینائی تو خیر تمہاری کبھی کی ختم ہو چکی ہے لیکن سماعت بھی ختم ہے۔ میں کہہ رہی ہوں یہ جگہ خطرناک ہے تمہارے لئے۔ یہاں تم کسی بھی مصیبت سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکو گے۔ کار میں بیٹھ جاؤ۔ ڈرائیور! اسے اپنے پاس جگہ دو۔"

عربی ڈرائیور نیچے اتر آیا اور اس نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔ "واقعی، آپ یہاں خطرے میں ہیں جناب۔ آیئے اس طرف بیٹھ جایئے۔" وہ گھما کر مجھے دوسری سمت لایا۔ وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا جسے میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ دروازہ کھول کر اس نے مجھے اندر بٹھایا اور پھر پیچھے دیکھ کر بولا۔

"آگے چلوں عالیہ حضرت؟"

"ہاں چلو۔"

ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں سحر زدہ سا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اردو میں بولی۔

"بھٹکنا انسانی فطرت ہے۔ انسان اور شیطان ازل کے ساتھی ہیں۔ شیطان ہر وہ دروازہ کھولتا ہے جو برائی کی طرف جائے کیونکہ اس کا عمل ہی یہ ہے۔ لیکن بچنے کی تلقین بھی تو بار بار کی گئی ہے۔ کب تک بھٹکتے رہو گے، کہاں کہاں بھٹکتے رہو گے؟ پوچھنا چاہتی

ہوں میں تم سے۔ کیوں بھٹک رہے ہو؟ آغاز جہاں سے کیا تھا، انجام وہیں ہو سکتا تھا۔ بے شک تعلق ایک بڑے گھرانے سے تھا۔ جو بھوکے ہوتے ہیں تو خدا کے قریب ہوتے ہیں، اسے یاد کرتے رہتے ہیں۔ برائی صرف یہ تھی کہ تم پیٹ بھرے تھے۔"

میں حیرت سے اس کی حسین آواز سن رہا تھا اور غور کر رہا تھا کہ کون ہے یہ...... کون ہو سکتی ہے؟ میرے بارے میں اس طرح باتیں کر رہی ہے جیسے مجھے بہت عرصے سے جانتی ہو۔

"ہاں۔ ہم لوگ صرف ایک ہی بات سوچتے ہیں۔ اگر کوئی ہم سے مخاطب ہے تو وہ کون ہے، ہمارا اس سے کیا تعلق ہے۔ جاننا چاہتے ہو میں کون ہوں اور میرا تم سے کیا تعلق ہے؟ کچھ وقت کے لئے ان گندگیوں سے نکل آئے ہو جو تم جان بوجھ کر اپنے سر پر اوڑھ لیا کرتے ہو۔ یہ دیکھو اور پہچانو میں کون ہوں......"

یہ کہہ کر اس نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھا دیا اور میرے دل کی دھڑکنیں جیسے بند ہو گئیں...... وہ کلاڈیا تھی۔ کرنل صغیر کی بیٹی کلاڈیا جس سے میری ملاقات کلکتے میں ہوئی تھی جو اس وقت بھی ایک پراسرار کردار تھی اور اب تو مزید پراسرار ہو گئی تھی۔ اس کے بارے میں مجھے تفصیلات پتہ چل چکی تھیں۔ ایک انگریز ماں کی اولاد تھی۔ کرنل صغیر نے اس عورت کو آخری وقت تک مسلمان نہیں کیا تھا لیکن کلاڈیا یہاں ان حالات میں اور اس انداز میں مجھ سے گفتگو کر رہی تھی جیسے اسے میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو۔ میں شدت حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ بولی۔

"بہت سے اعترافات کرنا پڑتے ہیں۔ تم حیرت کے جن لمحات سے گزر رہے ہو، وہ غیر فطری نہیں ہیں۔ اور میں جن حالات سے گزر رہی ہوں وہ بھی غیر فطری نہیں ہیں۔ یہ کمبخت دل کبھی کبھی ایسے جذبوں سے آشنا کر دیتا ہے جو بے اختیار جذبے ہوتے ہیں۔ میں تم سے محبت کرنے لگی تھی، اسی وقت جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہو گئی تھیں اور میں نے نجانے کتنے خواب تمہیں اپنی آرزوؤں میں بسا کر سوچے تھے۔ لیکن پھر تم ان راستوں پر بہت دور تک نکل گئے جو برائی کے راستے تھے اور میں نے اپنے قدم روک لئے۔ میں نے سوچا کہ کیسے انسان ہو تم جو خود اپنی بہتری کی بھی نہیں سوچتے۔ تم سمجھدار تھے، ہوش و حواس میں تھے لیکن تم سے زیادہ بے حواس کوئی نہیں رہا تھا۔ ارے بیوقوف آدمی! موت کی قوتیں نجانے کیسے کیسے عمل کرتی

ہیں، نجانے کون کون کیسے کیسے راستوں کا راہی ہوتا ہے اور وہ دوسروں کو بھٹکانے کے لئے ہر جدوجہد کرتا ہے۔ برائی کی اسی منزل سے بچنا تو ایمان کا راستہ ہے۔"

"کلاڈیا ہونا تم؟"

"ہاں۔"

"مگر کلاڈیا......"

"کچھ نہیں۔ موقع ہی کہاں دیا تم نے۔ میں نے پہلا ہی خواب دیکھا تھا تمہارے لئے کہ تم نے راستے بدل لئے۔ ایلس فیوری اور دوسری بہت سی لڑکیاں۔ بولو، غلط کہہ رہی ہوں؟ چلو لڑکیوں کو جہنم میں جھونکو، مجھے بھی جہنم میں جھونکو۔ لیکن مجھے ایک بات بتا دو، تمہارا اپنا دین، اپنا ایمان کیا ہے؟ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے؟ کیا یہ غور کیا ہے تم نے کہ تمہارا تعلق کس مذہب سے ہے؟ اور وہ افضل ترین مذہب ہے۔ اور اس کے لئے کچھ جستجو کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو اس کائنات کا اخلاقی مذاق ہے جو تمام مذاہب کی نفاستوں، بڑائیوں اور محبتوں سے بسا ہوا ہے۔ سب اپنے اپنے مذہب کے پیروکار ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ہمیں اپنے مذہب کا کوئی بڑا انسان بنانے کے بارے میں سوچتا ہے تو کیا تم یہ نہیں جانتے ہو یا پھر تمہاری تربیت ہی نہیں کی گئی ہے کہ خود تمہارا تعلق کس مذہب سے ہے۔ اس میں ایک ادنیٰ سا انسان ان بڑی بڑی قوتوں سے زیادہ طاقتور ایمانی قوت رکھتا ہے جو دوسرے مذاہب کی آخری قوتیں ہوتی ہیں۔ وہ لوگ تو ہر طرح سے یہ چاہیں گے کہ تمہیں اپنے آپ میں شامل کر کے اپنا مرتبہ بلند کریں۔ اس کے لئے وہ جادوئی قوتوں کے جال بچھائیں یا کچھ بھی کریں، کم از کم تمہیں تو سوچنا چاہئے کہ تم خود کیا ہو۔"

"کلاڈیا، تم...... تم یہاں......"

"میں ہر جگہ ہوں۔ وہاں بھی تھی میں جب تم وائسرائے کے آفس میں بند ہو گئے تھے۔ ہم تمہاری مدد کے لئے وہاں تیار تھے۔ اور اس کے بعد ہر جگہ، سمندری جہاز پر اور دوسری جگہوں پر تمہارے لئے نجانے کون کون کمربستہ تھا۔ مگر تم تو حسن و جمال کے دیوانے تھے، اپنی زندگی کی حفاظت یا پھر اپنی انا کی تسکین، اپنی ہوس کی تسکین اس کے علاوہ تمہارے پاس اور کیا تھا۔ کبھی وقت کے فاصلوں کو طے کر کے دیکھو، کبھی ان راستوں کی طرف چل کر تو دیکھو جو...... جو......"

اچانک ہی کار کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ رک گئی۔ میں کلاڈیا کی باتوں میں گم تھا۔ ڈرائیور نے سامنے دیکھ کر کہا۔ ''وہ لوگ سامنے راستہ روکے کھڑے ہیں۔''

''ہاں، میں دیکھ رہی ہوں۔''

میری نگاہیں بھی سامنے اٹھ گئیں۔ اور دفعتہً ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دو کاریں اس طرح راستہ روکے کھڑی ہوئی تھیں کہ کار کو راستہ نہیں مل رہا تھا۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا۔ کلاڈیا بھی دوسری طرف سے اتر گئی۔ میرے لئے بھلا اس کے علاوہ چارہ کار کیا تھا کہ میں بھی نیچے اتر جاؤں۔ چنانچہ میں بھی دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ سامنے والی دونوں گاڑیوں کے قریب بہت سے افراد کھڑے ہوئے تھے۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھنے لگا اور چند قدم آگے بڑھ گیا۔ مجھے اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ لیکن میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ یہ ہشمان ذکری کے آدمی ہیں۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

''یہ میرے دشمن ہیں اور یقیناً میری ہی وجہ سے......'' یہ کہہ کر میں نے پیچھے دیکھا۔ لیکن دوسرے لمحے میری کھوپڑی بھک سے اڑ گئی...... وہاں نہ کوئی کار تھی نہ کلاڈیا تھی، نہ اس کا ڈرائیور تھا۔ میں نے دور دور تک نگاہیں دوڑائیں، پھر قرب و جوار میں دیکھا۔ دائیں بائیں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں کسی کار کو پوشیدہ کیا جا سکے۔ یہ کیا قصہ ہے...... آہ، یہ کیا قصہ ہے؟ لیکن قصے پر غور کرنے کی نوعیت نہیں آئی۔ میں نے ہشمان ذکری کو دیکھا جو پستول میری طرف تانے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ میں بے حواس تھا۔ بالکل بے حواس تھا۔ کلاڈیا، کار، ڈرائیور اور اس کی باتیں...... سب نہ کھیل تھا نہ فریب نظر نہ میرا وہم۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں کلاڈیا نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لئے بھی میں نے کبھی اس سے ملنے کے بعد دوبارہ اس کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اس وقت وہ کہاں سے آ گئی اور یہ سارا کھیل کیا ہے؟ میرے تصور میں بھی نہیں آ رہا تھا۔

ہشمان ذکری آہستہ آہستہ میرے پاس پہنچ گیا اور بولا۔ ''ہمارا تمہارا ساتھ نجانے کہاں سے کہاں تک کا ہے میرے دوست۔ تم چاہے کتنی ہی فرار کی کوشش کرو لیکن تمہیں میرے سامنے ہی آنا ہے۔''

''ہشمان ذکری! میری ایک درخواست مان لو گے؟'' میں نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

''بولو، بولو۔''

''میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ مجھے ختم کرنے میں دیر نہ کرو۔''

وہ ہنسنے لگا، پھر بولا۔ ''تمہیں ختم کرنا میری زندگی کا پہلا اور آخری مقصد ہے میری جان! لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ تم اب بھی چال چل رہے ہو۔ ایک بات بتاؤ، کیا تمہارے ریوالور میں گولیاں ختم ہو گئی ہیں؟''

''نہیں، گولیاں ختم نہیں ہوئیں، میں خود مر چکا ہوں۔ آؤ اپنے ہاتھ سے میرا پستول میری جیب سے نکال لو۔'' میں نے کہا۔

''ہوں...... یہ بھی ہو جائے گا۔ چلو دیکھو ذرا۔'' اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور دو آدمی میری طرف بڑھے۔ میں نے ان کے اپنے قریب آنے کا انتظار نہیں کیا، خود ہی میں نے پستول جیب سے نکال کر اس طرف اچھال دیا۔

''یہ لو۔''

اس نے پستول لپک لیا۔ آنے والے دونوں آدمیوں نے بڑھ کر مجھے تھام لیا تھا۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''اس احتیاط کی ضرورت نہیں ہے ذکری! پستول اٹھاؤ اور کھیل ختم کر دو۔''

''کر دوں گا...... کر دوں گا۔ پہلے مجھے یہ تو سمجھنے دو کہ اس وقت تم کیا کھیل کھیلنا چاہتے ہو۔ بہت بڑے کھلاڑی ہو تم اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ ویسے میں تمہیں بتاؤں تم مرنا نہیں چاہتے، بکواس کر رہے ہو بالکل۔''

''تم کچھ بھی سمجھ لو، میں تمہیں اس کا موقع دے رہا ہوں۔ بس یہ سمجھ لو کہ میں اب ہر بازی ہار جانا چاہتا ہوں۔''

''مثلاً......؟'' اس نے اپنا سگریٹ کیس نکال کر اس میں سے ایک سگریٹ منتخب کیا اور اپنے ہونٹوں میں دبا کر بولا۔

''چھوڑو ذکری! بیکار وقت ضائع نہ کرو۔''

''چلو، چلو دیکھتے ہیں۔ اسے گاڑی میں بٹھاؤ...... بٹھاؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور ان دونوں نے مجھے کار میں بٹھا دیا۔ ذکری میرے برابر ہی آ گیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''سنو...... اگر یہ کسی قسم کی گڑبڑ کرے تو فوراً گولی مار دینا۔'' پھر وہ میری طرف مخاطب ہو کر بولا۔ ''ہاں بھئی، شروع ہو جاؤ۔ کیا کہانی ہے تمہاری؟''

"بس میری کہانی تو کافی پیچھے ختم ہو گئی ہے اگر تم نے اس گاڑی کو نیچے گر کر تباہ ہوتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ کیا سمجھے؟ اور سنو، میری بات غور سے سنو ذکری! شاید اس کے بعد تم میری آواز پھر کبھی نہ سن سکو گے۔ تم یقین کرو، میں نے تم سے شکست نہیں کھائی۔ تم یا تمہارا دوست ہیگ مجھے کبھی شکست دے ہی نہیں سکتے تھے۔ لیکن میری روح قرض کے بوجھ تلے دب گئی ہے جو اس وقت تک تمہیں شکست دینے کے نتیجے کے طور پر میرے ساتھ ہو چکا ہے۔"

"بکواس کئے جا رہے ہو۔ تم جیسے چوروں کے ذمے کوئی قرض نہیں ہوتا۔"

"اگر میں واقعی چور ہوں تو۔"

"کیا مطلب؟"

"چور تم ہو ذکری...... چور تم ہو۔"

"کیا بکواس کرتا ہے تو؟" ذکری نے غرا کر کہا۔

"ہاں...... تم سے بڑا چور اور کوئی نہیں ہے۔ میں زر و جواہر یا مال و دولت کے بارے میں نہیں کہہ رہا، میں انسانی خون کے متعلق کہہ رہا ہوں جو مجھے اپنی مدافعت میں بہانا پڑا اور جو میں اپنے خون سے ادا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ میرے اور تمہارے درمیان لین دین کا حساب ہے اور میں حساب اتارنا جانتا ہوں۔"

ذکری خاموشی سے بیٹھا رہا۔ گاڑی متعدد چکر کاٹتی ہوئی پہاڑی کی بلندیوں سے سطح زمین کی ہموار سڑک پر آ گئی۔ میں نے گردن گھما کر اس وادی کی طرف دیکھا۔ وہ جگہ ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے جہاں یہ حادثہ ہوا تھا اور میں پچھلی طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعتہً ہی ذکری میرا شانہ ہلا کر بولا۔

"دل کے پرزے تلاش کر رہے ہو شاید...... لیکن اس وسیع صحرا میں کارواں گم ہو جایا کرتے ہیں، ٹوٹی پھوٹی چیزوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ تم تو روح کی بات کر رہے تھے۔ پھر روح کی بات کرو۔"

"ہاں میں روح کی بات کر رہا ہوں جسے تم نہیں سمجھ سکتے۔"

"بیوقوف ہو خاقان! بیوقوف ہو...... بیوقوف ہو۔ کیا سمجھے؟"

"تم جو کچھ بھی کہہ لو، جو کچھ بھی کہہ لو۔ لیکن بیوقوف میں نہیں، تم ہو۔"

"بہک رہے ہو۔ بہت زیادہ بہک رہے ہو۔ اصولاً مجھے تمہاری لاش اب تک

دریائے نیل کی تہہ میں پہنچا دینی چاہئے تھی۔ لیکن تم خود جان سے بیزار ہو کر مجھے مشتعل کرنے کے لئے پورا زور لگا رہے ہو۔ لگاتے رہو، میں بھی ذرا مختلف قسم کا کھلاڑی ہوں۔ میں ابھی تمہیں اس ذہنی کرب سے نجات دلانے کے لئے تیار نہیں ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔"

"شکریہ۔" میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ "میں تمہارا قرض اتارنا چاہتا ہوں اور صرف اس لئے کہ تمہارے ساتھ تعاون کر کے میں جرائم پیشہ نہیں بن سکتا اور نہ تمہیں اس قابل سمجھتا ہوں کہ تمہارے خلاف محاذ آرائی میں مصروف رہوں اس وقت تک جب تک میں قانون کے محافظ کی حیثیت نہیں اختیار کر لوں۔"

"ذرا ایک منٹ رکو۔" اس نے میرے الفاظ کی تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بولو۔"

"تم میرا قرض اتارنا چاہتے ہو نا، تو اس کے لئے زندگی جیسی بیش قیمت چیز پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا قرض تم اتار سکتے ہو۔"

"ہاں، وہی جاننا چاہتا ہوں میں۔"

"وہ تختی میرے حوالے کر دو۔ میں اپنے آدمیوں کا خون، امینہ کا اغوا سب کچھ معاف کر دوں گا تمہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ دو ملین ڈالر اور دنیا کے کسی بھی ملک میں جہاں تم جانا چاہو تمہیں پہنچانے کے اخراجات اور ذمہ داریاں پوری کروں گا اس تختی کے عوض۔ بولو، کیا کہتے ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ رفتہ رفتہ صبح ہوتی جا رہی تھی۔ ہشمان ذکری نے مجھے آسمان کی طرف دیکھتے پا کر کہا۔ "شکر ادا کرو، ذکری تمہاری طرف صلح کا ہاتھ بڑھا رہا ہے خاقان! ورنہ تم تو صرف اس قابل ہو کہ تمہاری کھال ہی کھنچوا دی جائے۔"

"ہاں، اس میں کیا شک ہے۔ تم سے زیادہ رحم دل جلاد اس سے پہلے کبھی پیدا نہیں ہوا۔"

"خیر ٹھیک ہے۔ بکتے رہو۔ لیکن میرا خیال ہے تمہیں صرف تختی کے بارے میں بات کرنی چاہئے۔"

"وہ میرے پاس نہیں ہے۔ تمہیں خود بھی اس کا اندازہ ہو گا۔"

”جہاں بھی ہے وہ تمہیں وہاں سے مجھے دینی ہے۔ میں تمہیں زیادہ سے زیادہ اڑتالیس گھنٹوں کا وقت دے سکتا ہوں، صرف اڑتالیس گھنٹوں کا۔ سمجھے؟“ اس نے گردن گھما کر اپنے ایک آدمی کی طرف دیکھا اور اس شخص نے میرے منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔ میں نے کوئی مدافعت نہیں کی تھی۔ نجانے اس نئے عمل کا کیا مطلب تھا۔ ذکری نے ہاتھ بڑھا کر دونوں طرف کی کھڑکی کے پردے کھینچ دیئے۔ بہر حال پھر گاڑی ہشمان ذکری کے محل کے پھاٹک سے اندر داخل ہو گئی۔ میں کھلی آنکھوں سے پھر خود کو اسی زندانِ بلا میں گرفتار ہوتے دیکھ رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر گاڑی رکی اور ذکری دروازہ کھول کر باہر نکلا اور مجھے اترنے کا اشارہ کیا۔ میں نے گاڑی سے باہر آ کر اپنے منہ پر چپکائی ہوئی ٹیپ کی طرف اشارہ کیا۔ ذکری نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک سگریٹ کیس نما ٹارچ نکالی اور ٹیپ کے قریب لا کر گرمی پہنچاتا ہوا بولا۔

”ٹیپ کا سرا نوچ لو۔“

میں نے ٹیپ نوچ کر پھینکتے ہوئے کہا۔ ”شکریہ دوست۔“

اس نے میرا بازو تھاما اور ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ کار کے اندر ٹیپ لگانے کا مقصد یہ ہو سکتا تھا کہ آبادی میں داخل ہونے کے بعد میں چیخنے چلانے کی کوشش نہ کروں۔ میں نے ان دونوں آدمیوں کو دیکھا جو میرے پیچھے پستول لئے چل رہے تھے۔ طویل صحن اور راہداریاں طے کرتے ہوئے آخر وہ مجھے اسی دالان میں لے آئے جہاں سے میں فرار ہوا تھا۔ سرخ قالینوں والے کمرے کا دروازہ کھول کر اس نے اینہ کے عشرت کدے میں داخل ہوتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کچھ اشعار پڑھنے لگا۔ اس نے کہا۔

”نغمے کے بعد ذہن میں آواز مرتعش ہوتی ہے۔ پتی مرجھانے کے بعد زیادہ آرام دہ ہوتی ہے اور ان کے جانے کے بعد ان کی یاد۔“

”واہ...... کیا حسین اشعار ہیں۔ واقعی بڑی خوبیوں کے حامل ہو۔“ اس نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا اور میری آواز دب کر رہ گئی۔

”اڑتالیس گھنٹے...... صرف اڑتالیس گھنٹے۔ کیا سمجھے۔ اگر تم نے تختی فراہم نہ کی تو دیکھ لو گے کہ قتل گاہیں کیا ہوتی ہیں۔ کیا سمجھے؟“

بہت دیر تک وہ مجھ سے طرح طرح کی باتیں کرتا رہا۔ اسی دوران اس نے سگریٹ کیس نکالا، لائٹر جیب سے نکال کر پھینکا اور پھر اس کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ کر چل پڑا۔

میں آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ نجانے رات بھر کی جگار تھی یا پھر ذہنی تھکن کی انتہا کہ میں صوفے پر ہی سو گیا اور اس وقت تک سوتا رہا جب کسی نے میرا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا۔ میں چونک کر اٹھ گیا اور ذکری کو اپنے قریب پا کر میں نے نفرت سے منہ پھیرا اور کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھنے لگا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ میں بھوک کی شدید کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ پھر میں نے جماہی لی اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

”میں تو سمجھتا تھا کہ تم نے خودکشی کر لی ہو گی۔“

”تم اس کے سوا اور سوچ بھی کیا سکتے ہو ذکری!“

”اینہ یاد آ رہی ہے؟“ وہ بولا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، زندگی کے کچھ لمحات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا تعلق یادوں سے ہوتا ہے۔“

”ہاں، کیوں نہیں۔ میں نے تمہیں کیٹس کے اشعار سنائے تھے۔“

”ہاں۔ معلوم ہوتا ہے آغازِ شباب میں تم بھی انسانیت کی سرحدوں سے گزرے ہو گے، اس طرح جیسے آدم خور چیتا بھٹک کر کسی آبادی میں آ جاتا ہے اور آدم زاد کی پذیرائی سے خائف ہو کر بھاگ جاتا ہے پھر پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ مائی ڈیئر ہشمان ذکری! انسانیت مسلسل برائیوں سے پرہیز کا نام ہے۔“

”واہ، کیا عمدہ باتیں کر رہے ہو تم۔ تمہارے اندر یہ پارسائی کہاں سے گھر کر آئی؟“

دفعتہً ہی میرے ذہن میں وہ لمحات گزر گئے جب کلاڈیا مجھے میرے دین و مذہب کا احساس دلا رہی تھی۔

خداوند عالم! کہاں بھٹک رہا ہوں میں؟ ایک طرف بدھ مت کے پیروکار مجھے اپنا پیشوا بنانا چاہتے ہیں اور مہتر بدھ کا درجہ دینا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے مجھ پر اپنے پراسرار عمل کے دروازے کھول رکھے ہیں اور دوسری جانب کلاڈیا مجھے میری برائیوں سے روکنا چاہتی ہے۔ تیسری جانب محبت کا یہ شدید احساس جو میرے دل میں اینہ کے لئے ابھی تک موجود ہے میرے حوصلے پست کر رہا ہے۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

”تم سے زیادہ مکار انسان روئے زمین پر کوئی دوسرا نہیں ہو گا ہشمان ذکری!“

"سنو، بہت کچھ کہتے رہے ہو تم۔ میں برداشت کرتا رہا ہوں۔ اور اب بھی میں تمہیں برداشت کروں گا، آخری حد تک کوشش کروں گا کہ تم دوستوں کی طرح مجھ سے گفتگو کرو۔ اور جب دیکھوں گا کہ اس میں ناکام رہا ہوں۔ اوہو، تم بھوکے بھی ہو گے۔ پہلے مجھے تمہارے کھانے کا بندوبست کرنا چاہئے۔"

"رہنے دو ذکری! یہ اڑتالیس گھنٹے بھی گزر ہی جائیں گے۔ میرا خیال ہے بارہ گھنٹے گزر گئے ہیں، چھتیس گھنٹے اور گزر جائیں گے۔ اس کے بعد تو مجھے مرنا ہی ہے۔ کیوں نہ بھوک پیاس سے مر جاؤں۔"

"تم زندہ رہنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

"کیسے کروں؟"

"تختی میرے حوالے کر کے۔"

"کہاں سے لاؤں وہ تختی؟"

"دیکھو، بکواس نہ کرو۔ مجھے غصہ بھی آ سکتا ہے۔" اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تمہیں کچھ بھی آئے، میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"تو پھر ایک بات کان کھول کر سن لو کہ میں تم سے اپنے تین اور چار سات اور سات اور چار گیارہ آدمیوں کے قتل کا بھیانک انتقام لوں گا۔"

میرے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔ "گیارہ ہوئے ہیں اب تک؟"

"تمہیں یاد نہیں؟"

"کون یاد رکھتا ہے۔ لیکن ایک خواہش ضرور ہے دل میں، یہ قتل پورے بارہ ہونے چاہئیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ابھی مجھے ایک اور چوہا مارنا ہے۔"

"دیکھتے رہو..... خواب دیکھتے رہو۔ اصل میں، میں اس وقت اپنی فطرت کے خلاف لڑ رہا ہوں۔ وہ کر رہا ہوں جو میں نے زندگی میں کبھی نہیں کیا۔"

"وہ کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"تمہارے ساتھ رعایت۔ حالانکہ میرا سلوک تمہارے ساتھ وہ نہیں ہونا چاہئے۔"

"یہ خواب نہیں ہے۔ تم یقین کرو، یہ دیکھو میرا ہاتھ دیکھو" میں نے اپنی ہتھیلی پھیلاتے ہوئے کہا۔ "اس ہاتھ سے ابھی ایک قتل اور ہونا ہے ہشمان ذکری! اور وہ قتل

تمہارے سوا کسی اور کا نہیں ہو گا۔"

وہ دانت پیسنے لگا۔ پھر وہ صوفے سے اٹھا اور قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ پہرے دار نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔

ہشمان ذکری کے جانے کے بعد میں دیر تک خاموش بیٹھا مختلف سوچوں میں گم رہا۔ یہاں جس جگہ میں موجود تھا، میری زندگی کے حسین ترین لمحات گزرے تھے۔ اینہ کی موت ناقابل فراموش تھی اور وہ بے چارہ ٹیکسی ڈرائیور جو گھر سے روزی کمانے کے لئے نکلا تھا اس طرح میرے جال میں پھنسا کہ پھر زندہ اپنے گھر نہ جا سکا۔ کیا ہی دردناک اختتام تھا ان دونوں کا۔ اینہ کے لئے میں نے بہت کچھ کیا تھا۔ وہ تھی بھی اتنی دلکش اور دلفریب اور محبت کرنے والی۔ سچی بات یہ ہے کہ اس کی موت نے بری طرح دل توڑ دیا تھا۔ اب اس کے بعد کلاڈیا، یہ ایک نیا کھیل شروع ہوا تھا۔ حیران کن بات تھی، کلاڈیا کے الفاظ میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ ایک انگریز ماں کی اولاد جس کا باپ مسلمان تھا۔

دفعتہً ہی میرے ذہن میں کچھ اور خیالات آئے۔ یہ خیالات میرے لئے بہت حیران کن تھے۔ کلاڈیا نے کہا تھا کہ وہ میری تمام مصروفیات سے واقف ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ کلکتے میں ان لمحات میں جب میں مشکلات میں پھنسا ہوا تھا اور اس کے بعد بمبئی میں جب سلطان چچا اور اپنے دوست کے مسئلے میں مصروف تھا، مجھے کچھ انوکھا احساس ہوتا رہا تھا، بالکل ایسا احساس جیسے کوئی میرے ہمراہ ہو۔ دو آنکھیں مجھے دیکھتی رہی ہوں۔ ایک بار بھی میں نے اس احساس کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن اب مجھے وہ آنکھیں یاد آ رہی تھیں۔ کیونکہ میں نے انہیں نقاب کے پیچھے سے دیکھا تھا۔ اے خدا! یہ کلاڈیا میرا تعاقب کیوں کر رہی ہے؟ اس نے جس انداز میں مجھے سرزنش کی تھی اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ میری اہمیت اس کی نگاہوں میں کچھ اور ہی ہے۔ فیوری اور اس کے بعد عالیہ پھر اینہ اور کب کلاڈیا۔ میرے ہونٹ خشک ہونے لگے۔ شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس کمرے میں پانی یا پینے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ یہاں اس جگہ ساغر و مینا کا ہجوم رہتا تھا۔ مگر اس وقت گلاس تک موجود نہیں تھا۔ آتش دان بند کرا دیا گیا تھا اور کارنس بند پڑا تھا۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جتنا وقت گزرتا جا رہا تھا، پیاس ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک میرا دل ڈوبتا رہا۔ میں نے ٹانگیں اوپر گھسیٹیں اور صوفے پر دراز ہو گیا۔ نقاہت سے میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ اور اب میرا دل و دماغ ایک سکرات کی سی

کیفیت محسوس کر رہا تھا کہ اچانک میرے نتھنوں سے ایک خوشبو ٹکرائی۔ چمپا کی خوشبو...... اور میرا دماغ معطر ہو گیا۔ میں نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں اور چونک کر سیدھا ہو گیا۔ آہ...... وہ میرے سامنے موجود تھا۔ وردان سادھانی میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جیسے ہی میری اس سے نگاہیں ملیں، وہ سر جھکا کر بولا۔

”کیا کھویا، کیا پایا دھن راج!“ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ مایوسیوں کے اندھیروں میں موت کی جانب قدم قدم بڑھتے ہوئے اگر کوئی ایسا روپ نظر آ جائے جس میں زندگی چھپی ہوئی ہو تو انسان فطری طور پر اسی جانب بڑھتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو پھر اسے انسان نہ کہا جائے۔ کیونکہ باقی سب مکر و فریب اور جھوٹ ہوتا ہے۔ میں پرمسرت لہجے میں بولا۔

”مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے وردان سادھانی! کھونے اور پانے کا چکر تو چلتا ہی رہتا ہے۔“

”اوم نموستو“ اس کے منہ سے آواز نکلی اور اس نے کارنس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر ایک پیتل کا گلاس اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دیا جو دودھ کے شربت سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے بدحواسی سے گلاس اس کے ہاتھ سے لیا اور ہونٹوں سے لگا کر پینا شروع کر دیا۔ آہ...... کیا بتاؤں اس کی خوشبو اور لذت الفاظ سے بالاتر ہے۔ میں اس خوشبو اور لذت کو مرتے وقت تک نہیں بھلا سکوں گا۔ میں نے جلدی جلدی گلاس خالی کر کے وردان سادھانی کو دیکھا اور میرے منہ سے آواز نکلی۔

”بہت بہت شکریہ تمہارا۔ واقعی مجھے اس وقت اس کی اشد ضرورت تھی۔“

اس نے گلاس میرے ہاتھ سے لے کر کارنس پر رکھ دیا اور بولا۔ ”اب کیا ارادہ ہے دھم راج؟“

”میرا ارادہ......؟“ میں نے ہنس کر کہا۔

”ہاں۔“

”صحیح بتاؤں؟“

”مجھے پورا یقین ہے کہ آپ جو کچھ بھی مجھے بتائیں گے، صحیح ہی بتائیں گے۔“

”میں ایک اور قتل کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا اور اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے۔ پھر بولا۔

”نہیں دھم راج، زندگیاں لینا اچھا کام نہیں ہوتا۔“

”بس تم نے مجھ سے میری خواہش پوچھی میں نے بیان کر دی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ میری بہت بڑی خواہش ہے۔ بس تم یوں سمجھ لو وردان سادھانی! کہ اپنا اپنا اصول، اپنی اپنی سوچ ہے۔ کوئی ناگ کو دودھ پلاتا ہے، کوئی دیوتا سمجھ کر پوجتا ہے اور کوئی موذی سمجھ کر سر کچلتا ہے۔ اپنا اپنا نظریہ ہے۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ سانپ کا سر کچلنے والا انسانیت کا بھلا کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر دوسروں کو ڈسنے سے بچاتا ہے۔ دودھ پلانے والا اور پوجا کرنے والا دونوں احمق ہیں۔ اور میرے اپنے نظریے کے مطابق انسانیت کے دشمن بھی۔ تم کیا کہتے ہو اس بارے میں؟“

وردان سادھانی سر جھکا کر بولا۔ ”آپ کے وچار کی مخالفت کرنا میرا دھرم نہیں دھم راج۔“

”یہ بھی تمہاری کمزوری ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”اگر میرا خیال غلط ہے تو اس کو غلط ثابت کر کے صحیح راستہ دکھانا بھی تمہارا دھرم نہیں ہے کیا؟“

”وہ تو ہے۔“ وردان سادھانی مسکرا دیا۔

”تو پھر؟“

”آپ ودوان ہیں، شکتی مان ہیں۔ ہم نے برسوں کے گیان اور تپسیا میں جو کچھ پراپت کیا، وہ آپ نے چند دنوں میں اتنا پیچھے چھوڑ دیا کہ ہم جنم جنم کے بلیدان میں بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ اتنا علم کہاں سے لائیں ہم کہ آپ کو غلط ثابت کر سکیں اور اتنی طاقت کہاں سے پائیں کہ سانپ کا سر کچل سکیں۔“

”اچھا دوست! یہی تو میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے تو سانپ کا سر کچلنے دو۔“

”کک...... کیا مطلب؟“

”صرف اتنی مہربانی کر دو اس وقت کہ ایسے چار پانچ گلاس اور رکھتے جاؤ تاکہ میں کل شام تک زندہ رہ سکوں۔“

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”آپ چار پانچ کیا پچاس گلاس پئیں۔ وہ ہے نا آپ کے پاس۔“

”وہ......؟“ میں نے کہا۔

”ہاں۔“

"وہ تو میں پی چکا ہوں۔"

"نہیں مہاراج! وہ تو ساگر ہے۔ ساگر کبھی خالی نہیں ہوتے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میری نگاہیں گلاس کی جانب اٹھ گئیں۔ لیکن پھر میں نے دیکھا کہ گلاس دودھ سے بھرا ہوا ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

"دھم راج! آپ ابھی تک اپنی شکتیوں سے واقف نہیں ہیں۔ آپ نے وہ الفاظ بھلا دیئے ہیں جو ماشرہ نے آپ سے کہے تھے۔ یاد کیجئے اس کے الفاظ۔ اگر آپ اس کے راستے پر چل پڑے ہیں تو پھر بھلا یہ دیواریں آپ کا راستہ کیا روکیں گی۔ یہ ہتھیار آپ کو کیا نقصان پہنچائیں گے۔ مہاراج! آپ بڑے شکتی مان ہیں۔ آپ نے اپنی شکتیوں پر غور نہیں کیا۔ آپ آنکھیں بند کر کے ہر اس جگہ پہنچ سکتے ہیں جہاں جہاں کا تصور کریں۔ آپ نے دوسروں کو خود بڑا بنایا ہے، وہ آپ سے بڑے تو نہیں ہیں۔"

میرے بدن میں ایک دم سرد لہریں دوڑ گئیں۔ ایک لمحے کے لئے میں نے غور کیا تو مجھے احساس ہوا کہ نہیں، یہ قوتیں مجھ میں نہیں تھیں۔ یہ قوتیں شاید مجھے فوری طور پر دی گئی ہیں اور وہ بھی اس لئے کہ کلاڈیا نے مجھے میرے مذہب کی جانب راغب کیا ہے۔ میں ایک لمحے کے لئے میں سوچ میں ڈوب گیا۔ میری نگاہیں گلاس کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ میں آگے بڑھا اور میں نے گلاس دوبارہ اٹھا لیا اور اسے پینے لگا۔ دفعتہً ہی مجھے احساس ہوا کہ میں تنہا رہ گیا ہوں۔ میں نے شربت پیتے پیتے گھوم کر دیکھا، وردان سادھانی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ بہرحال میں نے گلاس پھر خالی کر کے کارنس پر رکھ دیا اور اپنی جگہ پر آ کر لیٹ گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے بدن میں میری اپنی قوتیں ہی نہیں بلکہ کچھ اور پراسرار قوتیں موجود ہوں۔ میں اپنے آپ کو بے پناہ طاقتور محسوس کر رہا تھا۔ بہرحال جسم کو جن لذتوں کا احساس ہوا تھا انہوں نے ایک بار پھر آنکھوں میں نیند جیسی کیفیت پیدا کر دی اور آخر کار میں گرد و پیش سے غافل ہو کر نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ ایسی گہری نیند آئی کہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ہوش و حواس بالکل ہی ختم ہو گئے تھے۔

صبح کو اس وقت میری آنکھ کھلی جب کسی نے زور سے صوفے پر ٹانگ ماری تھی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، روشن دان سے دھوپ نظر آ رہی تھی۔ جس نے میرے صوفے پر ٹھوکر ماری تھی اور اسے ہلا کر رکھ دیا تھا، وہ ایک انتہائی مضبوط تن و توش والا مسلح حبشی تھا۔ میرے منہ سے لاحول نکل گئی اور پھر میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"چائے۔"

اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا۔ "تم نے مجھ پر لاحول پڑھی؟"

"ہاں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے لاحول کی توہین کر ڈالی۔ تم جیسے منحوس شکل کے کالے جانور کو دیکھ کر لاحول پڑھنے کے علاوہ اور کیا، کیا جا سکتا ہے؟"

"ہوں...... ٹھیک۔"

"سنا نہیں تم نے۔ جاؤ، ہشمان ذکری سے کہو مجھے چائے بھجوائے۔"

وہ بری طرح جل بھن گیا۔ لیکن پھر اچانک ہنس پڑا اور بولا۔ "مالک نے مجھے کسی اور ہی کام سے تمہارے پاس بھیجا ہے۔"

"کیا؟" میں نے اسے گھور کر کہا۔

"اس نے کہا تھا کہ اگر تم مر گئے ہو تو ہم مل بانٹ کر تمہیں بھون کر کھا لیں اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر تم زندہ ہو تو تمہیں گھسیٹ کر اس کے پاس لے جائیں۔ چائے پلانے کا کوئی حکم نہیں دیا اس نے۔"

میں نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور فرش پر پیر ٹکاتے ہوئے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تو یہ حکم میں تمہیں دے رہا ہوں۔ جاؤ اور چائے لے کر آؤ اور ہشمان ذکری کو یہاں بھیجو۔"

اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر خوفناک قہقہہ لگایا اور بولا۔ "پاگل ہو چکے ہو۔ اب مجھے آقا کو یہ بات بتانی پڑے گی کہ اس کا قیدی پاگل ہو گیا ہے۔"

"تمہارا آقا خود پاگل ہے۔" میں نے کہا اور کالے حبشی نے منہ اوپر کر کے خوفناک قہقہہ لگایا۔ لیکن یہ قہقہہ بڑا عجیب تھا۔ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس کا چہرہ اونچا ہونے لگا اور سر پیچھے کی طرف ڈھلکنے لگا۔ وہ بھیانک آواز میں ہنسے جا رہا تھا اور اس کا چہرہ اٹھتا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس کا رخ چھت کی طرف ہو گیا۔ گردن ٹیڑھی ہو گئی اور قہقہہ کربناک کراہ میں تبدیل ہو گیا۔ وہ گردن سیدھی کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ہر مرتبہ جھٹکا کھا کر رہ جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی نادیدہ ہاتھ اس کے سر کو پیچھے کی جانب جھکا رہا ہو۔ قہقہہ تو اب ختم ہو گیا تھا لیکن اس کی ہولناک چیخیں فضا کو لرزا رہی تھیں۔ میں حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ دفعتہً ہی اس کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکلی۔

"آقائی......" لیکن اس طرح جیسے کوئی قے کر رہا ہو۔ وہ اتنی زور سے بکرے کی طرح چیخا تھا کہ جیسے کوئی آخری آواز نکال رہا ہو۔ اس کی آواز سن کر دو آدمی دوڑتے ہوئے اندر داخل ہو گئے اور ان دونوں کے پیچھے پیچھے ہشمان ذکری تھا۔ ہشمان ذکری نے آتے ہی دھاڑ کر کہا۔

"کیا ہوا؟" اور پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور اس کے چہرے کے نقوش تبدیل ہونے لگے۔ "وہ کہاں گیا؟"

"پتہ نہیں آقا! یہیں تو تھا۔ اور یہ...... یہ اسے یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا۔ ہشمان ذکری مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا لیکن اس طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا جیسے میں اس کی نگاہوں ہی میں نہ آیا ہوں۔ وردان سادھانی کے الفاظ مجھے یاد آنے لگے۔ وہ جو کچھ کہہ کر گیا تھا وہ صرف ایک کہانی نہیں سمجھی جا سکتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کا کوئی خاص مقصد ہے۔ اور میں ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہوں۔ وہ دونوں پہلے آنے والے حبشی کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"میں پوچھتا ہوں وہ کہاں گیا...... دیکھو کہاں گیا وہ؟"

"معلوم نہیں آقا! یہ تو اکیلا ہی نظر آ رہا ہے۔"

حبشی کی کیفیت تھوڑی سی بہتر ہوئی، اس کے پاؤں جیسے بے جان سے ہو گئے تھے۔ وہ زمین پر بیٹھ کر اپنا گلا سہلانے لگا۔ ہشمان ذکری پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"کتے کے بچے! تو یہاں حلق پھاڑ رہا ہے۔ قیدی کہاں ہے؟"

"یہیں تھا آقا...... یہیں تھا۔ میں...... میں...... مر رہا ہوں۔ میرے حلق میں پھندا۔"

ہشمان ذکری نے شدید طیش کے عالم میں اس کے منہ پر ایک گھونسہ رسید کرتے ہوئے کہا۔ "کالے دیو! اگر تو اس سے بھی شکست کھا گیا تو تیرا یہ بدگوشت کس کام آئے گا۔ میں تجھے کیوں پالوں؟"

حبشی نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو گرتے گرتے بچا۔ وہ اپنے پھٹے ہوئے ہونٹوں سے خون پونچھ رہا تھا۔ ہشمان ذکری نے پلٹ کر دوسرے آدمی سے کہا۔

"تم نے اسے باہر نکلتے ہوئے دیکھا ہے؟"

"نہیں میرے آقا! یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ یہاں سے نکل جائے۔"

"حرام زادے، وہ ایک مرتبہ نکل چکا ہے۔ میرے سوال کا جواب دے۔" ہشمان ذکری غصے سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔

"ہم آپ کو یقین دلا رہے ہیں آقا کہ اس وقت وہ نہیں نکلا اور کم از کم دروازے سے نہیں نکلا۔ چھت پھاڑ کر نکل گیا ہو تو ہمیں پتہ نہیں۔"

"مجھ سے بد زبانی کرتے ہو کتو! تلاش کرو اسے، پکڑ کر لاؤ جہاں بھی ہو۔ ورنہ میں تمہیں چیتوں کے سامنے ڈلوا دوں گا۔ تکا بوٹی کرا دوں گا تمہاری۔ تکا بوٹی کرا دوں گا، سمجھے۔ جاؤ، نکل جاؤ۔ جاؤ، اسے تلاش کرو اگر زندگی چاہتے ہو۔ ورنہ جس موت تم مرو گے وہ تمہارے تصور سے بھی باہر ہو گی۔"

وہ سب باہر نکل گئے۔ ہشمان ذکری کی کیفیت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر اچانک ہی اس کی نظر کارنس پر پڑی۔ اس نے جھپٹ کر گلاس اٹھایا اور بڑبڑانے لگا۔

"یہ کہاں سے آ گیا؟"

اس نے ناک کے قریب لا کر اسے سونگھا اور پاگلوں کی طرح ناچنے لگا۔ "کہاں سے آیا...... ارے یہ کہاں سے آیا؟"

میں نے اس کے سامنے آنے کی خواہش دل میں کی اور اس سے کہا۔ "یہ سری لنکا سے آیا ہے ہشمان ذکری!"

اس نے میری آواز سنی اور اچھل پڑا۔ گلاس سے شربت چھلک گیا۔ اس کے منہ سے خوفزدہ سی آواز نکلی۔ "تم کہاں سے آ گئے؟"

"یہیں تھا میں، تمہارے سامنے۔ اب تم اندھے ہو گئے ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ ہشمان ذکری، جب انسان کی بینائی ختم ہو جاتی ہے تو اسے یہ جان لینا چاہئے کہ اس کا وقت بھی قریب آ گیا ہے۔ تم تو مجھے ختم کر رہے تھے میری جان۔ اڑتالیس گھنٹے پورے ہو گئے ہیں اور جو تم نے میرے ساتھ کیا ہے اس کا تمہیں اندازہ ہے۔ کھانا تو کھانا تم نے مجھے پانی تک نہیں دیا۔ یہ سلوک کسی کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔ اس کے جواب میں تمہارے ساتھ میں کیا کروں؟"

"تت...... تم...... تم کہاں...... تم کہاں غائب تھے میں نہیں سمجھ سکتا...... میں نہیں سمجھ سکتا۔" وہ پاگلوں کی طرح اپنے ہاتھ کو اِدھر سے اُدھر گردش دینے لگا۔ یوں لگ رہا تھا

جیسے اس کی عقل نے اس کا ساتھ دینا چھوڑ دیا ہو۔ پھر اس کے بدن میں تھرتھری دوڑ گئی۔ وہ کبھی شربت کے گلاس کو دیکھتا تھا، کبھی مجھے۔ میں آگے بڑھا اور میں نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر کارنس پر رکھ دیا۔ پھر میں نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

''میری جان! چلو، اڑتالیس گھنٹے پورے ہو چکے ہیں۔ پستول نکالو اور اپنا حساب پورا کر لو مجھ سے۔''

ہشمان ذکری بدستور کانپ رہا تھا۔ غالباً اس کی ٹانگیں اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ چنانچہ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

''نہیں، نہیں...... بہت بڑے آدمی ہو تم ہشمان ذکری۔ یہاں نہیں، ادھر آؤ۔ ادھر آؤ۔ آؤ ذرا۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے تھام کر صوفے پر بٹھا دیا۔

''ہاں، اب تم یہ بتاؤ۔ مگر نہیں، تمہارا ایک احسان ضرور ہے مجھ پر۔ وہ یہ کہ تم نے اپنی بات منوانے کے لئے مجھ پر کوئی تشدد نہیں کیا۔ ورنہ ہشمان ذکری، اس وقت میں تمہیں تمہارے ہی اس محل میں زندہ دفن کر دیتا سمجھے۔ اور میں ایسا کرنے کی قوت رکھتا ہوں۔ کیا تم اس بات کو تسلیم نہیں کرو گے؟''

میرے ان الفاظ پر اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہاں خاقان! میں نے واقعی تمہارے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہیں کیا جس سے تمہیں جسمانی اذیت پہنچتی اور مجھے اس بات کی خوشی ہے۔ ویسے تم یقین کرو میں تمہارا دشمن بھی نہیں ہوں۔ حالانکہ تم نے مجھے زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ میرا مقصد تو صرف......''

''صرف تخت حاصل کرنا تھا، کیوں؟'' میں نے کہا۔

''ہاں واقعی۔''

''تم نے مجھ پر قاتلانہ حملے بھی نہیں کرائے؟''

''کرائے تھے۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ لیکن اس کے لئے تم مجھے معاف کر دو۔''

''ارے تمہارے رویے میں یہ تبدیلی کیسے واقع ہو گئی؟''

''نہیں...... میں یہ بات نہیں جانتا تھا۔''

''کون سی بات؟''

''یہی کہ تم پراسرار قوتوں کے مالک ہو۔ میں تو تمہیں ایک عام سا آدمی سمجھا تھا۔

میرے اور تمہارے درمیان تو بہت ہی معمولی سی لڑائی تھی۔ مجھے تو بس کیا بتاؤں تمہیں، ذاکر قباشی...... ذاکر قباشی نے مجھے تمہاری طرف متوجہ کیا تھا ایک عجیب و غریب کہانی کے ساتھ۔''

''ارے ہاں، تم سے تو مجھے اور بھی بہت سی باتیں معلوم کرنی ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ کیا کہتے ہو تم؟''

''شکست قبول کرتا ہوں اپنی۔ مکمل شکست۔''

''کون سی شکست؟ ہم کون سی سلطنت کے لئے جنگ لڑ رہے ہیں ذکری؟''

''تم یقین کرو، وہ بھی ایک سلطنت تھی خاقان!'' اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو میں نے اشارہ کر کے کہا۔

''نہیں، بیٹھو بیٹھو...... کون سی سلطنت کی بات کرتے ہو تم؟ ایک بات بتاؤں، وہ سلطنت جس کی طرف تمہارا اشارہ ہے میرے پاس نہیں ہے۔ کیا تم میری اس بات پر یقین کرو گے کہ میں آج بھی اسی طرح قلاش ہوں اور مجھے اس کی بالکل پرواہ نہیں ہے۔''

''مجھے اٹھنے دو۔ اب میں تم سے دوسری زبان میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا اور صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''سنو خاقان! میں اپنی آدھی دولت تمہیں پیش کر سکتا ہوں۔ اب تم خود کو امیر آدمی سمجھو۔ یہاں کا مکمل جائزہ لے لیا ہے تم نے۔ میری کنیزوں میں سے جو بھی تمہیں پسند ہو اسے اپنی تحویل میں لے لو۔''

''یہ سب کچھ میرے لئے بے معنی ہے ہشمان ذکری! چونکہ میں تو پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں کہ تمہارا سب کچھ میرا ہی ہے۔ تمہاری اس وقت پیشکش کا مطلب تو یہ ہے کہ تم آدھی دولت بچانا چاہتے ہو۔ رہیں تمہاری کنیزیں، وہ مجھ جیسے خانہ بر انداز شخص کے لئے نہیں، محلوں والوں کے لئے ہوتی ہیں۔ اس لئے تمہاری پیشکش تو ایک مذاق ہے۔''

''سنو...... ایسی باتیں مت کرو۔ میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ میں تمہیں قاہرہ میں ایک ایسا عالی شان محل دوں گا کہ تم تصور بھی نہ کر سکو۔ یا پھر اپنے وطن جا کر کچھ لینا چاہتے ہو تو بمبئی میں تمہارے لئے ایسی رہائش گاہ دوں گا جو وہاں کے رئیسوں کے پاس بھی نہیں ہو گی۔ میرے اختیار اس سے بھی وسیع ہیں، دنیا کے ہر گوشے میں، میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔''

''ہندوستان...... کیا تمہیں اس بات کا علم ہے کہ وہاں بھی مجھ پر قتل کے کئی مقدمے

ہیں۔ کیا سمجھے؟"

"ایسی باتیں مت کرو۔ بھلا تمہارا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ تم نگاہوں سے غائب ہو سکتے ہو، اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں میں۔ اس کے علاوہ تمہارے پاس نجانے کون کون سی قوتیں ہیں، یہ میں نہیں جانتا۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ تم اب تک اس طرح کی کوششیں کیوں کرتے رہے ہو؟ اگر امینہ تمہیں پسند تھی تو تم نے اسے بچانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

میرے ذہن میں ایک بار پھر امینہ کا تصور ابھر آیا۔ دفعتہً ہی وہ چونک کر بولا۔

"ایک بات بتاؤ۔ بتاؤ گے مجھے؟"

"ہاں ہاں، پوچھو۔"

"کیا تمہارے اندر پیدا ہو جانے والی یہ قوتیں اس پراسرار تختی کا کرشمہ تو نہیں ہیں؟ میرے ذہن میں یہی بات آتی ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے تم اس قدر قوتوں کے مالک نہیں تھے۔"

میں خاموش ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک میرے جواب کا انتظار کرتا رہا، پھر میرا ہاتھ تھام کر گھٹنوں کے بل بیٹھتا ہوا بولا۔ "خاقان! معاف کر دو مجھے۔ بس تمہیں خدا کا واسطہ دے سکتا ہوں، معاف کر دو مجھے۔"

میرے دل و دماغ پر اس وقت جو کچھ بیت رہی تھی، میرا دل ہی جانتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ امینہ کی موت میرے لئے ایک گہرے صدمے کا باعث تھی۔ یہ قوت جو مجھے حاصل ہو گئی تھی میں نہیں جانتا تھا کہ کس طرح ہوئی تھی۔ اگر واقعی کچھ وقت پہلے ایسا ہوتا تو شاید امینہ میری زندگی سے دور نہ ہوتی۔ ایک بار پھر کرنل صغیر کی بیٹی کا خیال آ گیا۔ یہ کلاڈیا آخر کیا ہے...... آہ، کیسی کیسی انوکھی قوتیں میرے پیچھے لگی ہوئی ہیں، مجھے کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔"

"کیا سوچ رہے ہو خاقان! کیا سوچ رہے ہو؟" ہشمان ذکری کی آواز پھر ابھری۔

"ہشمان ذکری! میری تم سے دشمنی شاید ختم ہو گئی ہے۔ اگر تم میری جانب اس طرح دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہو تو میں بھی انسان ہی ہوں۔"

ہشمان کے چہرے پر خوشی کی لہریں دوڑ گئیں۔ اس نے اٹھ کر بے اختیار میری پیشانی چومی اور مسکرا کر بولا۔ "آج سے تم میرے مہمان ہو۔ تمہیں میرے ساتھ رہنا ہو گا۔"

"نہیں ہشمان، یہ ممکن نہیں ہے۔ مجھے اب چلنا ہے۔"

"براہ کرم! میرے ساتھ ناشتہ کرو، میں تم سے کچھ اور باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اور دوسری بات یہ کہ آخر جا کہاں رہے ہو۔ تم میرے ساتھ ہی رہو گے۔"

"اس وقت مجھے جانا ہے۔"

"پھر بھی آؤ......"

اس کی ضد پر میں خاموش ہو گیا۔ وہ صحن میں آتے ہوئے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگا۔ برآمدہ عبور کر کے اس کے کمرے کے سامنے پہنچے تو پہریدار نے سلام کیا اور دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اندر داخل ہوتے ہوتے ہشمان نے اس سے کچھ کہا اور دروازہ بند کر کے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"میں پہلے بھی اس کمرے میں آ چکا ہوں۔"

ہشمان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ہاں...... لیکن براہِ کرم ان باتوں کو بھلا دو۔ پہلے ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور اب......"

"ہشمان، ہو سکتا ہے میرا دوست ہونے کے باعث تمہیں نقصان بھی اٹھانا پڑے۔ ویسے ہماری دوستی کے کچھ اصول ہونے چاہئیں۔ مثلاً یہ کہ ہمیں ایک دوسرے کے ذاتی مشاغل سے کوئی سروکار نہیں رکھنا ہو گا۔"

"تم اطمینان رکھو۔ میں تمہارے راستے میں کبھی نہیں آؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بڑی سی الماری کی طرف چلنے لگا۔ میں نے اس پر نگاہ رکھی۔ اس نے الماری سے پستول نکالا تھا اور جب وہ پستول لے کر صوفے کی طرف مڑا تو میں اس کے پیچھے مسہری کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے گھوم کر صوفے کی طرف دیکھا، ایک لمحے کے لئے مجھے نہ پا کر اس کا منہ حیرت سے کھلا اور پھر مجھے اپنے پاس دیکھ کر وہ ہنس دیا۔ پستول اس نے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں...... میں جانتا ہوں خاقان! واقعی اتنی جلدی کسی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمہارا پستول ہے جو میں تمہیں واپس کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے آگے بڑھ کر پستول اٹھایا اور اس کا چیمبر چیک کر کے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میرا نہیں تمہارا ہے۔"

"کبھی تھا، اب نہیں ہے۔ اب تمہارا ہے، اسے جیب میں رکھو۔"

میں نے پستول جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد ہشمان کے اشارے پر ایک بہترین ناشتہ ہمارے سامنے آیا۔ میں ناشتے سے فارغ ہوا اور پھر میں نے کہا۔

"تو ٹھیک ہے ہشمان! اب میں چلتا ہوں۔"

"کہاں جاؤ گے...... مجھے بتاؤ؟"

"پتہ نہیں کہاں جاؤں گا۔ یوں سمجھو کہ آزادی کا جشن منانا ہے۔ اسکندریہ کی سیر کرنی ہے اور بس، میرا خیال ہے اور کچھ نہیں۔"

وہ ہنسنے لگا، پھر بولا۔ "آزادی کا جشن شام کو منائیں گے۔ اس وقت سیر کر آؤ۔ میں تمہیں جانے سے نہ روکوں گا۔ لیکن کچھ دیر تو رکو، میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔"

"کیا......؟"

"جو اب تک تم مجھ سے چھپاتے رہے ہو۔"

"گڈ...... جو میں تم سے چھپاتا رہا ہوں، وہ تم مجھے بتاؤ گے؟" میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا اور سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"میں جو کچھ تمہیں بتانا چاہتا ہوں وہ تمہارے لئے بہت دلکش ہوگا۔ باہر میری کار کھڑی ہے، وہ لے جاؤ اور جس ہسپتال کا تمہیں پتہ بتا رہا ہوں وہاں چلے جاؤ۔ شعبۂ حادثات میں تمہیں میرے ان الفاظ کا جواب مل جائے گا۔"

"تمہاری باتیں پراسرار ہیں۔ غالباً تم مجھے میری پراسرار طاقتوں کا جواب دینا چاہتے ہو۔"

"نہیں میرے دوست! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہسپتال میں دو افراد داخل ہیں۔ ان میں ایک کا نام امینہ ہے اور دوسرا ایک ٹیکسی ڈرائیور۔"

میں اچھل پڑا تھا...... میری نگاہیں بے یقینی کے انداز میں اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر میں نے کہا۔ "کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"کیا خیال ہے، دوستی کے جواب میں یہ ایک اچھا تحفہ نہیں ہے؟"

"مجھے ایک بات بتاؤ ہشمان! کیا یہ مذاق ہے؟"

"نہیں، اب جبکہ میں تمہیں بھائیوں کی مانند سمجھنے لگا ہوں تو ایسی باتیں مذاق میں نہیں کہہ سکتا جن سے تمہارا دلی رابطہ ہے۔"

"کیا وہ دونوں زندہ ہیں؟"

"ہاں، اور اس بات کے امکانات ہیں کہ وہ بچ جائیں۔" خوشی کی ایک لہر میرے سارے وجود میں گردش کرنے لگی اور میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو واقعی یہ میرے لئے سب سے بڑی خوشخبری ہے۔"

"کچھ وقت توقف کر لو، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ بے فکر رہو، میں امینہ کے سامنے نہیں جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہوش میں آ گئی ہو گی۔"

"تب میں تمہارا شکریہ ادا کرنے پر مجبور ہوں ہشمان!"

"ایک منٹ رکو۔" اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک بٹن دبایا اور دوسرے لمحے پہریدار نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ "گاڑی نکالو۔"

"آقا......" پہرے دار نے گردن خم کی اور دروازہ بند کر کے چل دیا۔ ہشمان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا، پھر بولا۔

"اور خاقان! اب میری سمجھ میں آیا۔ تمہارے زندگی سے بیزار ہونے کا سبب امینہ کو حادثہ پیش آ جانا تھا۔ ویسے ایک سوال کروں، کیا تم اس وقت اسی کی تلاش میں جا رہے تھے؟"

"ہاں، میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا۔ میرے دل میں یہ خیال تھا کہ میں جائے حادثہ پر جا کر کم از کم یہ تو دیکھوں کہ ان لوگوں کا حشر کیا ہوا۔ ویسے یہ سچ ہے کہ اس وقت یہاں اسکندریہ میں ان دونوں کے سوا میرا اور کوئی نہیں ہے۔ ویسے مجھے حیرت ہے وہ اتنی گہرائی میں چلے گئے تھے اور ان کا کوئی پتہ نہیں چلا تھا تو پھر وہ بچ کیسے گئے؟"

"خوش قسمت تھے دونوں۔ ٹیکسی سوفٹ نیچے جانے کے بعد ایک درخت کے تنے اور شاخوں میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ کچھ گڈریوں نے اسے دیکھا اور نزدیک کے قریے سے لوگوں کو اکٹھا کر کے ان دونوں کو گاڑی سے نکال لیا۔ وہ دونوں بے ہوش تھے، انہیں زیادہ چوٹیں بھی نہیں آئی ہیں۔ لیکن بہرحال وقت کو ان کی زندگی بچانا مقصود تھی۔ اگر ٹیکسی نیچے چلی جاتی تو بہرحال ان کا قیمہ ہی نکالنا پڑتا۔ درخت میں اڑ جانے کی وجہ سے اس میں آگ بھی نہیں لگی۔ ویسے ایک بات تم مجھے بتاؤ، تم اس سے کس طرح نکل آئے؟"

"بس گاڑی ٹکراتے ہی میں نے چھلانگ لگا دی تھی۔ وہی زندگی کا معاملہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ویسے میرے لئے یہ حیران کن بات ہے۔"

"کیا؟"

"یہی کہ تم نے ایمنہ کو چھوڑ کر بچنے کی خود کوشش کی۔ میرا خیال اس سلسلے میں کچھ اور ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے سوال کیا اور وہ پُر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔ پھر بولا۔

"چلو پھر بتاؤں گا۔ آؤ چلیں، گاڑی آ گئی ہو گی۔ میرا مطلب ہے ڈرائیور نے سامنے لگا دی ہو گی۔ ویسے تو وہ یہیں موجود تھی۔"

میں ایک لمحے کے لئے سوچ میں ڈوب گیا، پھر میں نے کہا۔ "ہشمان، تم میرے ساتھ نہ آؤ تو بہتر ہے۔"

"کیوں؟" اس نے سوال کیا اور پھر اچانک وہ گھوما اور الماری کی جانب چل پڑا۔ میں دروازے کے پاس کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس نے الماری کھول کر نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور پھر میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔

"میں ہر طرح تمہارے ساتھ تعاون کروں گا۔ یہ اپنے پاس رکھ لو اور میرے ڈرائیور کو لے کر چلے جاؤ۔ لیکن شام کو میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"مجھے ان نوٹوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

"نہیں نہیں، پلیز...... کم از کم اس حد تک مجھے خدمت کا موقع دو۔"

"ٹھیک ہے، بہت بہت شکریہ۔" میں نے کہا اور نوٹ اس سے لے لئے۔ اس نے پہریدار کو کچھ ہدایات دے کر میرے ساتھ بھیج دیا۔ ڈیوڑھی سے آگے نکلا تو باوردی ڈرائیور نے آگے بڑھ کر مجھے سلام کیا اور دروازہ کھول دیا پھر اس کے بعد میں گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑا تھا۔

شاندار ہسپتال کے شعبہ حادثات میں ایک خاتون اور اس مرد کے بارے میں معلوم کیا اور ہمیں گائیڈ کیا گیا۔ پھر چند لمحات کے بعد ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ دروازے پر ایک نرس نے ہمیں ریسیو کیا اور جب ہم نے اس کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔

"وہ دونوں زخمی ابھی تک آکسیجن فلیٹ میں ہیں اور ابھی ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"ہم انہیں ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"آئیے۔" نرس ہمیں لے کر اندر آئی اور ایک بیڈ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ "یہ ہے مریض لڑکی۔"

میں نے آگے بڑھ کر دیکھا، ایمنہ ٹرانس پیرنٹ پلاسٹک میں ملبوس تھی، اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی، سانس کے ساتھ سینے کے اتار چڑھاؤ سے باقاعدگی کا احساس ہوتا تھا۔ میں دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ آخر کار ایک ڈاکٹر کے سوال نے مجھے چونکا دیا۔

"سر! کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"ہاں۔"

ڈاکٹر نے نرس کو نوٹ کرنے کو کہا اور وہ میز سے رجسٹر اٹھا لائی۔ ڈاکٹر نے سوالات کرنا شروع کر دیئے اور میں جوابات دیتا رہا۔ نرس لکھتی رہی۔ یہ تمام خانہ پری کرنے کے بعد وہ مجھے ڈرائیور کے بستر کے قریب لے گئے۔ وہ بھی اسی حالت میں تھا۔ میں اس بہترین انسان کو دیکھتا رہا اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر وقت نے میرا ساتھ دیا تو اس اچھے دوست کو تنہا نہیں چھوڑوں گا۔

بہر حال میں نے ڈاکٹر کو تمام تفصیلات نوٹ کرائیں اور اس کے بعد اسے ہدایت دی کہ جیسے ہی یہ دونوں ہوش میں آئیں یا ان میں سے کوئی ایک ہوش میں آئے تو ہشمان ذکری کے نمبر پر فوراً اطلاع دی جائے۔ ڈاکٹر ہشمان ذکری کے نام پر الرٹ ہو گیا تھا۔ اس نے گردن خم کر کے کہا۔

"بہتر جناب۔"

پھر میں وہاں سے واپس چل پڑا۔ بہر حال مجھے اور بھی کچھ کام کرنے تھے۔ دوپہر کو میں نے باہر ہی کھانا کھایا اور پھر اس ٹیکسی سے اندر پہنچ گیا جہاں سے میں نے ڈرائیور کو اپنے ساتھ لیا تھا۔ حارث کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پر مجھے کوئی خاص کامیابی نہیں ہو سکی۔ میں الجھن میں ڈوبا ہوا تھا کہ ڈرائیور نے کہا۔

"سر اصل میں چونکہ آپ عربی سے ناواقف ہیں، لوگ آپ کو غیر ملکی سمجھ کر کچھ گھبرا جاتے ہیں۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر کوئی کچھ جانتا بھی ہے تو آپ کو کچھ بتاتا نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا، کیا جائے؟"

"میں اس سلسلے میں آپ کی کسی نہ کسی طرح مدد کروں گا۔"

بہر حال شام کو پانچ بجے کے قریب میں واپس آ گیا۔ جب میں ذکری کی رہائش گاہ پر پہنچا تو وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"ہسپتال جانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"بس مجھے وہیں جانا ہے۔"

"اگر اجازت دو تو میں بھی چلوں؟"

"ٹھیک ہے، مرضی ہے۔" میں نے اس وقت لاپرواہی سے کہا۔ ہشمان ذکری اب بالکل موم محسوس ہونے لگا تھا۔ ہم دونوں ہسپتال روانہ ہو گئے۔ راستے میں اس نے کہا۔

"اصل میں ہسپتال سے میرا رابطہ قائم ہوا ہے۔ میں نے ڈاکٹروں سے ان کے بارے میں پوچھا تھا۔ پہلے ڈاکٹروں نے مجھے یہ بتایا تھا کہ ان کی چوٹیں شدید نہیں ہیں اور اس بات کے امکانات ہیں کہ وہ بچ جائیں۔ لیکن اب......"

"اب کیا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"اصل میں انہیں مکمل طور سے ہوش نہیں آیا۔ اور ڈاکٹروں کا یہ کہنا ہے کہ مسلسل بے ہوشی کافی خطرناک ہو سکتی ہے۔"

میں نے گہری سانس لی پھر آہستہ سے کہا۔ "میری دلی خواہش ہے کہ وہ دونوں بچ جائیں۔ لیکن بہر حال دیکھ لیں گے۔ کیا، کیا جا سکتا ہے؟"

کچھ دیر کے بعد ہم ہسپتال پہنچ گئے۔ میں نے ڈرائیور کے پاس کسی شخص کو بیٹھے ہوئے دیکھا، یہ شخص حارث کا ہم شکل تھا۔ وہ اٹھ کر ہمارے پاس آ گیا اور بولا۔

"آپ شاید مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے، مجھے ٹیکسی اسٹینڈ سے معلوم ہوا۔ میں حارث کی تلاش میں پریشان پھر رہا تھا کہ مجھے اس طرح کی اطلاع ملی اور پھر آپ کے ڈرائیور نے مجھے اس ہسپتال کے بارے میں بتایا۔"

"اوہ......تم کون ہو؟"

"میں حارث کا بھائی ہوں۔ میں نے تفصیلات معلوم کی ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے آپ کی بیگم چند منٹ کے لئے ہوش میں آئی تھیں۔ ڈاکٹر نے ان سے کہا کہ مسٹر برک آپ کو دیکھنے آئے تھے اور ہم انہیں پھر بلا رہے ہیں۔"

"پھر......؟" میں نے بے تابی سے کہا۔

"وہ تھوڑی دیر کے لئے ہوش میں آئی تھیں، مسکرائیں اور پھر کچھ کہا بھی تھا انہوں نے

لیکن سنا نہ جا سکا۔ اس کے بعد وہ پھر بے ہوش ہو گئیں۔"

"اور حارث...... کیا وہ بالکل ہوش میں نہیں آیا؟"

"ہاں...... وہ ہوش میں نہیں آیا۔" اس کے بھائی نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

"اب تم یہاں آ گئے ہو تو یہیں رکنا اور اس کی نگرانی کرنا۔ اخراجات کی بالکل پرواہ نہ کرو۔ یہ کچھ نوٹ رکھ لو۔" میں نے خاصی بڑی رقم اسے دی اور وہ ممنون نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا تو میں نے کہا۔

"حارث میرا دوست ہے اور میں اس کے لئے جو کچھ کر سکتا ہوں ضرور کروں گا۔ تم یہاں رکو۔" اس کے بعد میں امینہ کے پاس آ گیا۔ جب میں امینہ کے بستر کی طرف جا رہا تھا تو ہشمان ذکری نے کہا۔

"میں اس کے سامنے نہیں جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے وہ ہوش میں آ جائے۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ واپس چلا گیا۔ ڈاکٹر امینہ کی نگرانی کر رہے تھے۔ انہیں اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کا تعلق کسی طرح ہشمان ذکری سے ہے۔ بہت دیر تک میں امینہ کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے چہرے پر زندگی تھی لیکن لگ رہا تھا کہ وہ ابھی ہوش میں نہیں آئے گی۔ اور پھر ہم واپس لوٹ آئے۔

نجانے کیوں میرے دل پر اُداسی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ امید و بیم کی یہ کیفیت کس قدر روح فرسا ہوتی ہے یہ کوئی میرے دل سے پوچھے۔ بہر حال ہشمان ذکری کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے اب وہ میرا غلام بن چکا ہو۔ پتہ نہیں کم بخت واقعی مخلص ہو چکا تھا یا پھر یہ بھی اس کی کوئی چال تھی۔ کیونکہ بہر حال وہ پراسرار تختی اسے دستیاب نہیں ہو سکی تھی جس نے واقعی ایک عجیب و غریب جال پھیلا دیا تھا۔

کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل ہوئی اور پھر اسی رات ساڑھے بارہ بجے ہسپتال سے اطلاع ملی کہ امینہ کا انتقال ہو گیا ہے...... میرے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ بلاوجہ یہ اتنا وقت اس انداز میں گزرا۔ یہ کام پہلے ہی ہو جاتا تو اچھا تھا، اس وقت جب ان دونوں کی گاڑی گہرائیوں میں گری تھی۔

ہشمان ذکری چند آدمیوں کے ساتھ مجھے لے کر ہسپتال پہنچا۔ لاش حاصل کر کے اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اور دوسرے دن گیارہ بجے اسے سپردِ خاک کر دیا گیا۔ پھر اسی شام میں حارث کے گھر پہنچا اور اس کے اہل و عیال کو خاصی رقم دی تا کہ اس کا علاج بھی

ہو سکے اور اس کی دیکھ بھال بھی۔

ہشمان ذکری کے ہاں چار پانچ دن گزارے۔ ہشمان ذکری نے اس دوران م
بڑی خاطر مدارت کی حالانکہ امینہ اس کی محبوبہ تھی، اس کی ملکیت تھی لیکن اب وہ اس ط
مجھ سے تعزیت کرتا تھا جیسے امینہ میری منکوحہ ہو۔ میرے ذہن میں پچاسوں قسم کی سو
تھیں اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ایک بڑی حیران کن بات یہ تھ
جہاز پر میں نے دیکھا تھا کہ ہشمان ذکری بڑی چابک دستی سے ہیگ کا سارا سامان
پر لاد کر لے گیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو اسکندریہ کا میئر بتایا تھا۔ بہت بڑا رسک
تھا اس نے۔ لیکن اس کے بعد ہم دونوں کے درمیان سے ہیگ یا پھر ان لوگوں کے
کے مطابق ذاکر قباشی بالکل ہی اسکرین آؤٹ ہو گیا تھا۔ میں نے بھی اس کے بار
میں ہشمان سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ ابھی تک تختی کا معاملہ بھی زیر بحث تھا اور ہش
نے شاید خود جان بوجھ کر ہیگ یا ذاکر قباشی کے معاملات میں الجھنے کی کوشش نہیں ک
اور اس وقت میرا دوست بنا ہوا تھا۔ جب میں نے اس سے رخصت مانگی تو اس
اس کا پارٹنر بداخشانی بھی موجود تھا۔ بداخشانی سے میری ملاقات ہشمان کے ساتھ
ہوئی تھی۔ اب ہشمان نے اسے میرے بارے میں بتایا تھا۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں تھا
اس وقت جب میں نے اس سے اجازت مانگی تو وہ بولا۔

"کہاں جاؤ گے خاقان جمشیدی؟"

"میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔"

"کیا ہندوستان؟"

"میں نے کہا نا کچھ بھی طے نہیں کیا میں نے ابھی تک۔"

"ایک بات بتاؤ، اگر تم انگلینڈ جانا چاہو تو میں تمہیں بھجوا سکتا ہوں۔"

"کیا میرے کاغذات بن سکتے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"میں موجود ہوں نا۔ کاغذات کی کیا ضرورت ہے۔ تم اسی طرح انگلینڈ بھی جا
ہو جس طرح بمبئی سے یہاں تک آئے ہو۔ پاسپورٹ اور کاغذات وغیرہ کا خیال
سے نکال دو۔ اس میں بہت سی پیچیدگیاں ہیں۔"

میں نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ اب دنیا
کوئی ملک ایسا نہیں رہا جہاں کی شہریت مجھے مل سکے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ ہنس کر بولا۔

"واقعی ہم جیسے لوگوں کے لئے کم از کم یہ پاسپورٹ اور کاغذات وغیرہ بے کار چیزیں
ہیں مسٹر خاقان! یہ ہمارے پاس ہوں یا نہ ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"بڑا فرق پڑتا ہے مائی ڈیئر! جرائم پیشہ لوگوں کو بھی کہیں نہ کہیں کے حقوقِ شہریت
حاصل ہوتے ہیں۔ انسان خانہ بدوش ہو کر زندہ رہ سکتا ہے، بے وطن ہو کر نہیں۔"

"اپنے اپنے نظریات ہیں، بات اصل میں یہ ہے کہ اسی کا گھر ہے تمام دنیا جس کا
دنیا میں کوئی گھر نہیں ہے۔"

"کاغذ پر یہ باتیں بہت خوبصورت لگتی ہیں۔ قیامِ تہذیب اور تشکیل معاشرہ سے
پہلے واقعی گھر کوئی مسئلہ نہیں تھا میرے دوست! اس وقت وطن کا تصور بھی نہیں تھا۔ لیکن
اس وقت جغرافیائی حدود قائم ہو چکی ہیں۔ انسان طبقوں اور علاقوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔
اب زندہ رہنے کے لئے عمر خیام یا غالب کا دیوان نہیں، ڈومیسائل سرٹیفکیٹ چاہئے ہوتا
ہے۔ سرحدیں عبور کرنے کے لئے سقراط کے اقوالِ زریں نہیں، انٹرنیشنل پاسپورٹ درکار
ہوتا ہے۔"

"لیکن ایک بڑی عجیب بات ہے، انسان کو جو ملتا ہے وہ اسے قبول نہیں کرتا۔ آخر ہر
شخص خلاؤں میں دیکھنے کا عادی کیوں ہوتا ہے؟"

"مطلب؟" میں نے سوال کیا۔

"اسکندریہ بھی تو بری جگہ نہیں ہے۔ یہ پورا محل پڑا ہوا ہے۔ اور یہی نہیں، ہر چیز
تمہارے لئے موجود ہے۔ یہاں رہو۔"

میں ہنس دیا۔ میں نے کہا۔ "تم کب تک میری زندگی کا ٹیکس ادا کرتے رہو گے اور
کیوں؟"

"ویسے میں ایک بات بتاؤں مسٹر خاقان جمشیدی! ہشمان ذکری نے جو کچھ تمہارے
رے میں کہا اگر وہ سچ ہے تو تم دنیا کی تمام حکومتوں سے خراج وصول کر سکتے ہو۔ تم
ثمان ذکری جیسے ہزاروں آدمیوں کو نوکر رکھ سکتے ہو۔ مصر بے شک ایک پراسرار زمین
ہے اور اس پراسرار سرزمین پر تم جیسے پراسرار لوگ حکمرانی کر سکتے ہیں۔"

"بات اصل میں یہ ہے میرے دوست بدخشانی! کہ ہشمان ذکری میری طرف سے
ت زیادہ غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے ہیں۔"

"اب ایسا نہ کہو۔ تمہاری بے پناہ طاقت میرے علم میں ہے اور میں اس سے بری طرح مرعوب ہوں۔ ورنہ آج میں تمہیں اپنے بارے میں سچ بتا رہا ہوں کہ زندگی میں کسی سے مرعوب ہونا تو میں نے سیکھا ہی نہیں۔"

"چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔"

"بالکل۔ میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ یوں کرو فی الحال تم کچھ دن کے لئے باہر ہو آؤ۔"

وہ لوگ اس طرح کی باتیں کرتے رہے۔ بدخشانی نے کہا۔ "تم میرے ساتھ چلو خاقان! میں اگلے ہفتے دو تین مہینے کے لئے اسکندریہ سے باہر جا رہا ہوں۔ ویسے تمہاری دعا سے تمہارا یہ دوست بھی بالکل بے دست و پا نہیں ہے۔ جہاں تم کہو گے وہیں میں تمہارے قیام و طعام کا بندوبست کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہیں بتاؤں گا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔" میں نے ذہنی تھکن محسوس کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا کہ میں کہاں جاؤں گا۔ بہرحال یہاں سے کہیں نہ کہیں تو نکلنا ہی تھا۔ یہاں رُک کے رہنے کا کوئی خاص جواز بھی نہیں تھا۔ ادھر ہشمان ذکری نے مخلص دوست کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے میرے لئے بہت سے سوٹ سلوائے۔ ریشمی قمیصیں، ٹائیاں، جوتے اور دوسری ضروری چیزیں، بہت ہی خوبصورت قسم کا ایک بریف کیس اور ہولڈال اور اٹیچی کیس وغیرہ فراہم کئے اور مسلسل میرے لئے خریداری کرتا رہا۔ اس کی ان کوششوں سے مجھے سلطان چچا یاد آ گئے تھے۔ ماضی کی تو ساری کہانی ہی عجیب تھی۔ میرے لئے نجانے کیا کچھ کرنے والے بہت سے لوگ تھے جبکہ میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ میری ذات کسی کے لئے بھی اس طرح فائدہ مند نہیں ہے کہ وہ میرے لئے اتنا کچھ کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

عجیب پراسرار کہانی زندگی سے لپٹ گئی تھی۔ حالانکہ اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو میں بھی سیتا گڑھی کا ایک معزز انسان اور معزز زمیندار ہوتا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ورثے میں چونکہ حسن پرستی ملی تھی اس لئے حسن پرست بھی ہوتا۔ لیکن چونکہ فطری طور پر برے ذہن کا انسان نہیں تھا اس لئے یہ حسن پرستی بے ضرر ہوتی۔ کوئی نہ کوئی زندگی میں شامل ہو جاتا۔ کبھی زندگی میں شامل ہونے والے کا تصور کرتا تو عجیب و غریب شکلیں ذہن میں ناچنے لگتی تھیں۔

بہرحال ہشمان ذکری بڑی مہربانیاں کر رہا تھا اور اس کا انداز دیکھ کر کوئی بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ کچھ ہی دن پہلے ہم ایک دوسرے کے بدترین دشمن تھے۔ میں سب سے زیادہ حیران اس بات پر ہوں کہ ان دنوں ہیگ میرے ذہن سے بالکل نکل گیا تھا۔ حالانکہ یہ ساری کہانی ہیگ ہی کے گرد گھومتی تھی۔ وردان سادھانی تو خیر ایک الگ کردار تھا، سیوک سندھورتی بھی میری زندگی سے بہت دور ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ اور دوسرے بھی بہت سے کردار مثلاً ماشرہ جو ایک انتہائی پراسرار کردار تھا اور بھی بہت سے کردار جن کا تعلق گاشربرم سے تھا۔

بہرحال روانگی کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ اور پھر ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ ہم روانہ ہو رہے ہیں۔ میں نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ ہشمان ذکری نے مجھے بہت سے نوٹ اور ٹریولر چیک دیتے ہوئے انگلینڈ میں مقیم چند دوستوں کے ایڈریس بھی دیئے۔ ایک بار پھر اس نے مجھے پاسپورٹ فراہم نہ کرنے کی معذرت کی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ انگلینڈ اور جرمنی میں ناجائز طریقے سے داخل ہونے والوں کے لئے سب سے زیادہ خطرناک جگہیں ہیں۔ بہرحال میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

اسی رات گیارہ بجے بدخشانی کی کار مجھے لینے آئی اور پھر کسی نامعلوم ساحل پر چھوڑ کر چلی گئی۔ یہاں بدخشانی میرا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑی لانچ لنگر انداز تھی۔ ایک چھوٹی کشتی میں میرا سامان بار کرانے کے بعد وہ مجھے لے کر لانچ کی طرف چل دیا اور ایک بار پھر سمندر میرے ہمرکاب تھا......!

***

رات کے تقریباً ایک بجے لانچ آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر کیپٹن سے باتیں کرنے کے بعد بداخشانی مجھے اپنے کیبن میں لے آیا۔ یہاں دو تین صوفے، ایک ٹیبل اور ایک کیبنٹ، ایک بلٹین شیلف اور کاؤچ وغیرہ تھے۔ فرش پر انتہائی قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ چھت کے درمیان لیمپ سے خوشگوار روشنی اٹھ رہی تھی۔ اس نے مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں دوست! مجھے یہ بتاؤ میں تمہاری اور کیا خدمت کروں؟''

''میں کیا بتاؤں؟'' میں نے کہا اور وہ مسکرا کر اٹھا۔ الماری سے رم کی بوتل اور دو گلاس لے کر واپس آیا۔ ایک گھنٹے تک ہم رم پیتے رہے۔ میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں تو وہ مجھے ہاتھ پکڑ کر اس کیبن میں چھوڑ گیا جہاں میرے سونے کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں نے اپنے سامان پر نگاہ ڈالی اور کاؤچ پر دراز ہو گیا۔ بدخشانی شب بخیر کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔ اور پھر اس نے دروازہ بند کر لیا۔

صبح نو بجے کسی نے کیبن کا دروازہ بجایا۔ میں تھوڑی دیر پہلے جاگا تھا اور منہ ہاتھ دھو کر ٹوائلٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک نوجوان لڑکے نے جو دونوں ہاتھوں میں چائے کی ٹرے لئے ہوئے تھا، مسکرا کر صبح بخیر کہا اور اندر داخل ہو کر ٹرے میز پر رکھ دی۔ میں نے اس کے لہجے سے متاثر ہو کر غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تم ایرانی ہو؟''

وہ چلتے چلتے رک کر بولا۔ ''بلے آغا۔''

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''خوب...... کیا فرصت ملنے پر تم میرے پاس آ سکتے ہو؟''

اس نے جھک کر کہا۔ ''بسر و چشم، قربانت شوم۔''

میں نے چائے انڈیلتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ''ضرور آؤ۔ میں ایران کے متعلق

تم سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ میں اس کے جملے پر غور کرنے لگا۔ آخر کار پہلی بار میری سمجھ میں آیا کہ فارسی زبان کی شیرینی کا راز الفاظ سے زیادہ فارسی بولنے والے لوگوں کے ان پُرخلوص جذبات میں منحصر ہے جن کا وہ اظہار کرتے ہیں۔

''میں تیرے قربان ہوں جاؤں۔'' ہر زبان میں کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کہتا کون ہے، صرف ایرانی۔ ہاں ایرانی ہی الفاظ کا جادو جگانا جانتے ہیں۔ ایک معمولی نیم خانہ نوجوان پہلی ملاقات کے دو جملوں میں مجھے اس قدر متاثر کر کے چلا گیا تھا کہ میں نے اس کے متعلق، اس کی زبان کے متعلق اور پورے معاشرے کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ اسے جادو ہی کہا جا سکتا ہے۔

بہر حال ان خیالات سے پیچھا چھڑا کر میں چائے کی طرف متوجہ ہوا اور پھر ناشتے سے فارغ ہو کر میں صوفے پر دراز ہو گیا۔ پھر اس کے بعد وقت بالکل تنہا ہی گزرا تھا اور ایک طرح سے نیم خوابی کی سی کیفیت طاری رہی تھی مجھ پر۔ دوپہر کو وہی لڑکا کھانا لے کر آیا اور بولا۔

''کھانا کھانے کے بعد آپ کو فرصت ہو گی آغا؟''

''ہاں بالکل۔ بلکہ اس وقت بھی فرصت ہے۔ تم چاہو تو بیٹھ جاؤ۔ میں کھانے کے دوران بھی تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے دروازہ بند کیا اور میرے نزدیک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کھانا کھاتے کھاتے اس کا نام پوچھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

اس نے سر کو خم دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے خادم کو گوہر آفندی کہتے ہیں آغا۔''

میں نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔ ''بداخشانی تمہارے ہم وطن ہیں شاید؟''

''جی، آپ کا خیال بالکل درست ہے آغا۔''

''ویسے یہ بداخشاں میں لعل نکلتا ہے۔ یہ سچ ہے یا محض افسانے؟''

''نہیں آغا، یہ سچ ہے۔ لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''ہاں بتاؤ، کیا کہنا چاہتے ہو تم؟ شاید یہ کہ یہ لعل صرف چند لوگوں کی ملکیت ہوتے ہیں، عوام کو ان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔''

"ہاں بالکل، میں یہی کہنا چاہتا تھا آغا! ہم تو صرف بداخشانی لعلوں کی کہانیاں ہی سنتے ہیں۔"

"صرف بداخشاں ایران ہی نہیں میرے دوست! تمام دنیا ہی ایسی ہے۔ انسان خود غرض ہے۔ چھوڑو، تم یہ بتاؤ لعل، یاقوت اور زمرد کی پہچان کر سکتے ہو یا نہیں؟"

"ہاں، تھوڑا بہت پہچانتا ہوں آغا! لیکن زیادہ نہیں۔"

"ذرا یہ دیکھو" میں نے اپنا بایاں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا اور اس کی نگاہیں میرے ہاتھ پر جم گئیں۔ "میری انگوٹھی میں جو نگینہ ہے وہ دیکھو اصلی ہے یا نقلی؟"

اس نے میری انگوٹھی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آغا، آپ برا تو نہیں مان جائیں گے؟"

میں ہنس دیا۔ پھر اس نے غور سے انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آغا! یہ نقلی یاقوت ہے۔ اس کا تعلق انڈیا سے ہے۔ لیکن کہیں آپ نے اصل کی قیمت پر تو یہ نہیں خریدا؟"

"نہیں، یہ نقلی ہی ہے۔ نقلی ہی کی قیمت پر خریدا ہے۔ صرف معمولی سی قیمت کے عوض۔ واقعی تم جواہرات کی شناخت رکھتے ہو۔"

"شکریہ۔ مجھے نام یاد نہیں ہے ورنہ بتا سکتا ہوں کہ یہ نگینے کہاں تراشے جا سکتے ہیں۔"

"جے پور تو نہیں کہنا چاہتے تم؟"

"ہاں آغا! وہ بھی ایک جگہ ہے جہاں یہ صنعت ہے۔ لیکن آپ کا نگینہ وہاں کا نہیں ہے بلکہ بمبئی کے قریب ایک مسلمان ریاست کا ہے۔"

"کھمبے۔"

"شکریہ آغا! میں نام بھول گیا تھا۔"

"بڑی خوبیوں کے مالک ہو گوہر! اس عمر میں جواہرات کے بارے میں تمہاری معلومات کافی ہیں۔ اچھا ٹھیک ہے، کھانا اٹھاؤ۔ میں ہاتھ دھونے کے بعد تمہیں ایک اور نگینہ دکھاتا ہوں۔ اس کو پرکھ کر بتانا۔"

اس نے تمام پلیٹیں جمع کیں اور پلٹ کر نکل گیا۔ میں نے ٹوائلٹ میں جا کر ہاتھ تولیے سے پونچھے اور بیلٹ کھول کر اس کا زپ کھینچا۔ اپنے اور ذکری کے دیئے ہوئے ڈالر اور ٹریولر چیک نکال کر ایک طرف رکھے اور بیلٹ کے اندرونی پرس کا زپ کھینچا، پرس میں جواہرات کی بجائے چند مڑے تڑے کاغذوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں سناٹے میں آ

گیا...... تمام بیلٹ الٹ پلٹ کر جھک جھک کر دیکھے، جھٹک جھٹک کر دیکھا۔ کسی چیز کا نام و نشان نہیں تھا۔ جواہرات غائب ہو چکے تھے اور اب افسوس کرنے سے بھی کچھ حاصل نہیں تھا۔ میں نے تمام چیزیں بیلٹ میں ڈالیں اور زپ بند کر کے بیلٹ باندھتا ہوا باہر نکلا اور کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ حرکت ہشمان ذکری کی تو نہیں ہو سکتی۔ جو شخص مجھ پر اتنا خرچ کر چکا ہو، وہ اتنا ذلیل کبھی نہیں ہو سکتا۔ اگر اس نے اتنی ہی مالیت کے جواہرات اڑا کر اپنی عزت اور شہرت کو خطرے میں ڈالنا تھا تو پھر اتنا بڑا آدمی ظاہر نہ کرتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ اتنا نہیں گر سکتا۔ پھر......؟

میں یہیں تک سوچنے پایا تھا کہ گوہر آفندی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور میرے خیالات منتشر ہو گئے۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر کہا۔

"بیٹھو گوہر، بیٹھو۔"

اس نے دروازہ بند کیا اور شکریہ کہتے ہوئے کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ "آغا! آپ سے پہلے کسی نے میری اتنی عزت افزائی نہیں کی۔ آپ میرے تجربے میں پہلے بڑے آدمی ہیں جو خادم کو انسان کی حیثیت دے رہے ہیں۔"

"سگریٹ پیتے ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں شکریہ۔"

"کیا بات ہے گوہر! انسان کی حیثیت حاصل کرنا پسند نہیں ہے کیا؟"

"آغا! آپ کا احترام کرتا ہوں۔ آپ کے ساتھ تھوڑی دیر باتیں کرنا ہی میری عزت افزائی ہے۔ ہاں، آپ مجھے کچھ دکھانا چاہتے تھے۔"

"ہاں...... لیکن اب شاید نہ دکھا سکوں۔"

"آپ کی مرضی۔ لیکن کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں رہا؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ جو کچھ میرے پاس تھا وہ ضائع ہو گیا۔"

"ضائع ہو گیا...... کیسے آغا؟"

"چھوڑو گوہر! مجھے ایران کے بڑے بڑے شہروں کے بارے میں بتاؤ۔"

"بتاؤں گا آغا! پہلے آپ مجھے یہ تو بتائیں وہ کیا چیز تھی جو ضائع ہو گئی؟"

"کچھ ہیرے، یاقوت اور زمرد وغیرہ تھے۔"

"یہ تو بڑی مالیت کے ہوں گے آغا۔"

"ہاں، مگر اب ان کا ذکر کرنا بیکار ہے۔"

"یہ تو بڑی افسوسناک بات ہے۔ آپ کو کسی پر شک ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اٹھا اور باہر نکل گیا۔ ہرحال اس کے بعد میں نے بھی اسے دوبارہ بلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شام کو پانچ بجے کے قریب بدخشانی میرے پاس آیا اور بولا۔

"ایک بات بتاؤ خاقان جمشیدی! کیا واقعی تمہارے جواہرات چرا لئے گئے ہیں؟"

"اوہ...... تو اس نے آپ کو بتا دیا؟"

"مجھے جواب دو۔"

"ہاں، ایسا ہوا ہے۔"

"اسکندریہ سے روانہ ہوتے وقت موجود تھے؟"

"یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

"کہاں رکھے تھے؟"

"میری بیلٹ میں تھے۔"

"تمہیں یاد ہے رات کو تمہیں کیبن میں کس نے پہنچایا تھا؟"

"اندازہ نہیں ہے۔ مجھے رات کو زیادہ ہوش نہیں تھا۔"

یہ سنتے ہی وہ پلٹا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کش لیتا ہوا باہر عرشے پر آ گیا۔ میرا خیال تھا بدخشانی جواہرات کے سلسلے میں عملے کے افراد سے تحقیقات کرنے گیا ہے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اسے اطمینان سے کیبن میں بیٹھے دیکھا۔ وہ پائپ منہ میں لگائے ہاتھوں سے میز بجا رہا تھا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ میں کئی منٹ تک اسے اس حالت میں دیکھتا رہا، آخر کار آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا جنگلے کے پاس پہنچ گیا اور سمندر کی لہروں پر غروب ہوتے ہوئے سورج کی آخری کرنوں کا منظر دیکھتا رہا۔ ہمیں اسکندریہ کا ساحل چھوڑے ہوئے تقریباً تیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ نامعلوم کتنا سفر طے کیا تھا ہم نے، کتنا سفر طے کرنا تھا۔ اس وقت ہمارے پورے اطراف میں پانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چاروں طرف حد نظر تک پانی ہی پانی یا پھر اوپر آسمان جس پر کہیں کہیں تارے نمودار ہونے لگے تھے اور تاریکی بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

میں دیر تک جنگلا تھامے اس منظر میں کھویا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ہوا کے تیز جھونکوں میں خنکی بڑھنے لگی تو میں جنگلا چھوڑ کر کیبن کی طرف چل دیا۔ بدخشانی ابھی تک اپنے کیبن سے باہر نہیں نکلا تھا۔ میں نے اس کی لاپرواہی کو شدت سے محسوس کیا۔ اگر اس نے مجھ سے دریافت کرنے کی زحمت نہ کی ہوتی تو میں اس غلط فہمی میں مبتلا رہ سکتا تھا کہ اس بیچارے کو تو اس بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ لیکن اب جبکہ وہ خود بڑھ کر تحقیقات کا آغاز کر چکا تھا تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ ضرور مجھ سے کچھ نہ کچھ کہے گا۔

بہرحال کھانا کھانے کے بعد میں دیر تک جنگلے کے قریب ٹہلتا رہا۔ ساڑھے بارہ بجے واپس آیا تو بدخشانی میرے کاؤچ پر بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"خاقان! میں نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کر لی لیکن ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔"

"لعنت بھیجو دوست! جہنم میں جائیں۔ میری تقدیر میں ہی نہیں تھا۔ اگر تقدیر میں ہو گا تو اب بھی مل جائیں گے۔"

"کہاں سے مل جائیں گے؟ میرا خیال ہے وہ اسکندریہ سے باہر نہیں نکلے۔"

میں نے ہنس کر گردن ہلائی۔ "چھوڑو اس ذکر کو۔ پتھر کے چند ٹکڑوں کے کھونے یا پانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں کچھ اور بھی کہنے والا تھا لیکن پھر رک گیا۔ بدخشانی چونک کر بولا۔

"ہاں، تم کچھ کہہ رہے تھے۔"

"بس اتنا کہ میرے پاس ویسے بھی بہت کچھ ہے۔ ٹریولر چیک، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میں دولت حاصل کرنا جانتا ہوں۔ صرف ساحل تک پہنچنے کی دیر ہے۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ لیکن خاقان! کیا تمہارا خیال ہے کہ تمہارے جواہرات کی چوری لانچ پر آنے کے بعد ہوئی؟"

"کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی یقین ہے کہ اسکندریہ میں نہیں ہوئی چونکہ میں ہشمان ذکری کے محل کے سوا کہیں گیا ہی نہیں۔"

وہ خاموش ہو کر ایش ٹرے میں پائپ کی راکھ کو جھانکنے لگا۔ اسی وقت ایک لڑکا کافی کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوا اور ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔ میں نے کافی کا پاٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"وہ گوہر آفندی کہاں گیا؟"

"سونے چلا گیا ہوگا۔ اس کی ڈیوٹی آٹھ بجے ختم ہو جاتی ہے۔"

میں نے کافی پیالی میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ "پیالی ایک ہی ہے بداخشانی، پہلے تم پی لو۔"

"ارے نہیں، تم لو۔ میں صرف اب ایک اول ٹین پیوں گا۔"

"اوکے۔" میں نے کہا اور وہ شب بخیر کہہ کر باہر چلا گیا۔ میں نے اسے کیبن سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا اور سگریٹ کا دھواں باہر خارج کرتے ہوئے کافی کی چسکیاں لینے ہی لگا تھا کہ دفعتہً میرے بائیں پہلو سے ایک دبلا پتلا ہاتھ آگے بڑھا اور پیالی ہونٹوں سے دور ہوگئی۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھا تو وردان سادھانی میرے پہلو میں کرسی کے اس طرف کھڑا تھا۔

"دھم راج۔" اس نے جھک کر کہا۔

"ارے تم؟"

"ہاں کیوں نہیں۔"

"اس وقت؟"

"وجہ ہے۔"

"کیا؟"

"تم مہا سنکٹھ میں گھرے ہوئے ہو۔"

"کیا مطلب کیسا سنکٹھ؟"

"اس پیالی میں سنکھیا ملا ہوا ہے دھم راج! بدخشانی تمہیں زہر دے کر سمندر میں پھینکنا چاہتا ہے۔"

"کیا......؟" میرے پورے وجود میں ایک چھناکا سا ہوا۔ "اسے مجھ سے کیا دشمنی ہے؟"

"ایک منٹ۔" وردان سادھانی نے کہا اور جواب دینے کی بجائے پیالی اٹھائی اور کونے میں انڈیل دی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک سازش ہے دھم راج! ہشمان ذکری تم سے ڈرتا ہے اس لئے اس نے یہ چال چلی ہے۔"

"اوہ میرے خدا! اتنی گہری چال؟ اچھا ایک بات بتاؤ وردان۔"

"دھم راج پوچھیں۔"

"میرے ہیرے کہاں گئے؟"

"بدخشانی کے پاس ہیں۔ کل رات تم شراب کے نشے میں بے ہوش کر دیئے گئے تھے۔ اس نے ایک آدمی کی مدد سے انہیں تمہاری پیٹی میں سے نکلوا لیا۔"

"اس آدمی کا نام...... میرا مطلب ہے اس لڑکے کا نام گوہر آفندی تو نہیں ہے؟"

"نہیں، وہ اچھا لڑکا ہے اور تمہاری عزت کرتا ہے۔ تم اسے انعام اکرام دے کر اپنا بنا سکتے ہو۔ اچھا خیر چھوڑو، اب یہ بتاؤ اب کیا کرنا ہے تمہیں؟"

"میرا خیال ہے تم نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے اس کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ بلکہ زندگی بچالی ہے تم نے میری۔"

"ایسا نہ کہیں دھم راج! آپ کی رکھشا تو ہمارا دھرم ہے۔ آپ کا جیون ہمارا جیون ہے۔ ہماری آنکھیں تو ہر وقت آپ کی طرف لگی رہتی ہیں۔"

"واقعی، تم ہمیشہ میرے ایک بہت اچھے ساتھی ثابت ہوئے ہو۔"

"دھم راج! آپ کی ماتر بھومی ہمیشہ آپ کو یاد کرتی رہتی ہے۔ آپ بلاوجہ اِدھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ کیا لینا ہے آپ کو یہاں۔ یم سدھو، سدھو پرماتما، بدن سدھو کا آپ کا وردان ہیں۔ وہ آپ کو ہر سمے یاد کرتے رہتے ہیں۔ آپ یہاں بھٹکنے کی بجائے ان کے ساتھ اپنی منڈلی کیوں نہیں لگاتے؟"

"چلوں گا میں وہاں۔ لیکن ابھی نہیں۔ آج رات تو ایک چوہے کو پاتال کی یاترا کرنی ہے۔ تم بھی دیکھ لو تو اچھا ہے۔"

"نہیں مہاراج! جیون ہتیا ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔" یہ کہہ کر وہ اچانک ہی شمع کی طرح گل ہوگیا۔ میں اس کو ہوا میں تحلیل ہوتے دیکھتا رہا۔

اس کے غائب ہونے کے بعد میں نے دروازے کا بولٹ چڑھایا اور پستول ہاتھ میں لے کر بستر پر دراز ہوگیا۔ رات ڈھل چکی تھی۔ لانچ میں ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سمندر کی پُرشور موجیں اور انجن کی آواز ماحول کو متاثر کئے ہوئے تھی۔ میں بستر پر لیٹا نیند پر غالب آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب نیند غالب آنے لگی تو میں نے بند ہوتی آنکھوں سے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بج چکا تھا۔ میں چھلانگ لگا کر بستر سے اتر آیا۔ ٹوائلٹ میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور تولیے سے منہ پونچھتا ہوا

باہر نکل آیا۔ پھر پُر خیال انداز میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زہر دینے کے بعد اب تک بدخشانی یا اس کے آدمی کیوں نہیں آئے؟ لاش ٹھکانے لگانے کے لئے اس سے اچھا موقع اور وقت کون سا ہو سکتا ہے؟ میں دیر تک ان خیالات میں ڈوبا رہا۔ پھر میں نے بستر سے پستول اٹھایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ عرشے پر آتے ہی ہوا کے تیز جھونکوں نے میرا استقبال کیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور میدان خالی پا کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا بدخشانی کے کیبن پر پہنچ گیا۔ پھر میں نے پورٹ ہول کے شیشے سے اندر کی طرف دیکھا، بدخشانی کاؤچ پر لیٹا ہوا تھا، اس کے ہاتھ میں کتاب تھی اور ٹیبل لیمپ کی روشنی میں وہ کتاب پڑھ رہا تھا۔ بائیں ہاتھ میں بدستور سگار دبا ہوا تھا۔ میں نے دروازے کا ہینڈل گھمایا، پستول والا ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کر آہستہ سے کواڑ کھولا۔ ہلکی سی آواز ہوئی تو بدخشانی نے کتاب رکھ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ میں اندر داخل ہوا تو مجھے دیکھتے ہی بستر پر اٹھ بیٹھا اور حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"تم...... خاقان جمشیدی، اس وقت؟"

میں نے قریب پہنچ کر کہا۔ "ہاں بدخشانی! میں۔ مجھے زندہ دیکھ کر تمہیں تعجب ہوا؟"

"کک...... کیا مطلب...... مم...... میں سمجھا نہیں؟"

"لو، تمہیں یہ بات سمجھانے کے لئے میرے پاس ایک آلہ موجود ہے۔" یہ کہہ کر میں نے پستول نکالا اور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ لرزتے ہوئے انداز میں اوپر اٹھ گئے تھے اور اس کے چہرے پر شدید خوف کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

"یہ...... یہ...... یہ کیا مذاق ہے خاقان؟"

"بالکل ویسا ہی مذاق جو تم نے میرے ساتھ کیا تھا۔"

"مم...... میں نے؟"

"ہاں، کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ تم نے مجھے زہر پلایا، میں تمہیں پگھلا ہوا سیسہ پلا رہا ہوں۔"

"زہر...... مم...... میں، جھوٹ ہے یہ۔ بالکل جھوٹ ہے۔"

"نہیں جان! جھوٹ نہیں ہے۔ کیا سمجھے؟"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اسی وقت میری نظر کیبن کی دیوار پر لٹکے ہوئے آئینے پر پڑی۔ میرے پیچھے چھ سات فٹ کے فاصلے پر دروازے میں ایک

آدمی کھڑا تھا۔ اچانک اس نے پستول سیدھا کر کے میرے سر کا نشانہ لیا اور میں پھرتی سے نیچے بیٹھ گیا۔ عین اسی لمحے اس نے ٹریگر دبا دیا تھا۔ دھماکا ہوا اور گولی بدخشانی کی پیشانی میں لگی۔ اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی تھی۔ میں نے اٹھتے ہوئے اس دروازے کی طرف چھلانگ لگائی اور گولی چلانے والے کی ٹانگوں میں سر ڈال کر اسے پیچھے کی طرف ڈال دیا۔ وہ منہ کے بل کاؤچ پر گرا۔ اسپرنگ دار کشن میں لچک پیدا ہوئی اور وہ پلٹ کر کاؤچ کے دوسری طرف جا پڑا۔ میں تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس پر حملہ کرنے کی بجائے دوڑ کر اپنے کیبن میں آ گیا۔ اندر آ کر میں نے دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھا دیا۔ اسی وقت باہر آدمی کے دوڑنے اور چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے اتارے اور سلیپنگ سوٹ پہن کر بستر پر لیٹ گیا۔ چند لمحوں کے بعد کیبن کے سامنے عرشے پر قدموں کی آہٹ ہوئی اور میری کیبن کا دروازہ بجایا جانے لگا۔ تین چار بار دستک سننے کے بعد میں نے اٹھ کر لائٹ جلائی اور دروازہ کھول کر دیکھا۔ سامنے کیپٹن اور میٹ کھڑے ہوئے تھے میں نے حیرانی سے اسے دیکھا اور کہا۔

"خیریت کیپٹن! کیا صبح ہو گئی؟"

وہ دونوں غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر کیپٹن نے کہا۔ "آپ سو رہے تھے مسٹر برک؟"

"ظاہر ہے۔ لیکن اندازہ یہ ہو رہا ہے کہ ابھی ٹھیک طرح سے صبح بھی نہیں ہوئی۔"

کیپٹن مجھے دیکھ کر چکرانے لگا، پھر بولا۔ "کیا آپ نے گولی چلنے کی آواز سنی؟"

"گولی؟" میں نے حیرت سے کہا اور اس نے میٹ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بورسیلو بکواس کرتا ہے۔ یہ اسی کا کام ہے۔"

"کیا آپ مجھے بتائیں گے نہیں کیا مسئلہ ہے؟"

"آپ باہر آئیے پلیز، آغا بدخشانی کو کسی نے شوٹ کر دیا ہے۔" وہ غمگین لہجے میں بولا۔

"شوٹ؟" میں نے زبردست اداکاری کی۔

"ہاں۔ بورسیلو اس وقت کیبن میں ہے۔ اس کے پاس پستول ہے جس سے ایک فائر بھی کیا گیا ہے لیکن وہ جو کچھ کہتا ہے وہ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"کیا کہہ رہا ہے وہ؟"

"بس میں کیا بتاؤں۔ وہ بدمعاش آپ کا نام لے رہا ہے۔"

"میرا نام؟" میں نے چونک کر کہا۔

"ہاں۔"

"مگر میں تو سو رہا تھا اور بدخشانی، وہ تو میرا عزیز ترین دوست ہے۔ کہاں گولی لگی اسے؟" میں نے بدخشانی کے کیبن کی طرف دوڑ لگائی اور دو قدم چل کر رکتے ہوئے کیپٹن سے کہا۔ "کیپٹن! آپ جس طرح سے چاہیں اپنا اطمینان کر سکتے ہیں۔ میرا پستول بھی دیکھ لیجیے، وہ تکیے کے نیچے رکھا ہوا ہے۔"

"نہیں مسٹر برک! سوری، ہم سمجھ گئے، وہ آپ کو اس معاملے میں پھنسانا چاہتا ہے۔"

"بے حد شکریہ کیپٹن۔ لیکن براہ کرم آپ میرا پستول ضرور چیک کر لیجیے، میں اسے ضروری سمجھتا ہوں۔"

"اوکے۔" کیپٹن نے میٹ کی طرف اشارہ کیا اور وہ میرے کیبن میں داخل ہو کر پستول نکال لایا۔ پستول اس نے کیپٹن کے ہاتھ میں دیا۔ کیپٹن نے پستول کی نالی سونگھی اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ "آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں مسٹر برک، اس پستول سے کوئی فائر نہیں کیا گیا۔"

یہ کہہ کر اس نے پستول میری جانب بڑھا دیا تو میں نے پستول اس کے ہاتھ سے لے کر میگزین کھولا، کارتوس نکال کر اسے دکھائے تو اس نے ایک بار پھر کہا۔ "مجھے یقین ہے، آپ اسے بند کر دیں۔"

میں نے میگزین بند کر دیا اور کیپٹن سے کہا۔ "کیپٹن! میں اس شخص کو دیکھنا چاہتا ہوں جو میرا نام لیتا ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے مسٹر برک! یہاں اس جہاز پر ہم خود فیصلہ کر لیں گے۔ تھوڑی دیر میں ہی اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔ ویسے یہ کارکین ہوتے ہی دغا باز ہیں۔"

"اس کا فیصلہ تو میں بھی کر چکا ہوتا کیپٹن، لیکن وہ مجھ پر کیونکر الزام لگا رہا ہے؟ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ بعد میں کوئی یہ کہے کہ میں نے اپنے خلاف بولنے کے خوف سے اسے ختم کر دیا۔ پھر بھی میں آپ سے اتنا ضرور کہوں گا کہ بدخشانی کا قاتل سورج کی کرن نہ دیکھنے پائے۔ وہ میرا گہرا دوست تھا۔"

"وہ ہمارا باس تھا۔ اس لانچ کا مالک۔" کیپٹن نے جواب دیا۔

بہرحال یہ میرے لئے کوئی انکشاف نہیں تھا۔ عثمان ذکری نے مجھے اس کے حوالے اسی لئے کیا تھا۔ کیپٹن نے اپنی ٹوپی کو چھو کر رخصتی سلام کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں کچھ دیر کھڑا انہیں جاتے دیکھتا رہا اور پھر واپس اپنے کیبن میں آ گیا۔ بدخشانی کا بدلا ہوا طرزِ عمل میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا تھا۔ سوچنے کی بات تھی آخر اس نے مجھے زہر دے کر مارنے کی کوشش کس لئے کی۔ کیا صرف جواہرات کے چوری ہو جانے کے خوف سے؟ لیکن یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ وہ مجھے آسانی سے جھٹلا سکتا تھا۔ اس لانچ یا چھوٹے جہاز پر بھلا میری کیا چل سکتی تھی۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے گوہر آفندی نے یہ جواہرات اس کے پاس دیکھنے کے بعد ہی اس سے کہا ہو کہ آقائی برک کے جواہرات چوری ہو گئے ہیں۔ بہت دیر تک میں سوچتا رہا اور اس کے بعد باہر نکل آیا۔ زینے کے قریب ایک بیرا ہاتھ میں چائے کی ٹرے لئے ہوئے کیپٹن کے کیبن کی طرف جاتا ہوا نظر آیا تو میں نے اسے روک کر اس سے گوہر کے متعلق معلوم کیا۔

"آقائی! وہ کینٹین کے بغلی ہال میں سو رہا ہے۔ اگر آپ کو چائے درکار ہے تو میں آپ کے کیبن میں لے کر آتا ہوں۔"

"نہیں شکریہ۔" میں نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے کہا اور زینہ اترنے لگا۔ پھر میں کینٹین کے بغلی ہال تک پہنچ گیا۔ یہاں تین چار میزوں پر خانساماں اور بیرے سوئے ہوئے تھے۔ میں نے ان میں گوہر کو تلاش کیا اور اسے جگا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی حیرت زدہ ہو گیا۔

"آقائی آپ......؟"

"ہاں گوہر، میرے لئے چائے لے کر میرے کیبن میں آ جاؤ۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

"ابھی لے کر آیا۔ کوئی خاص بات ہے آقائی؟"

"بہت اہم بات۔ تم جلدی آ جاؤ۔" میں نے اس سے کہا اور پھر زینہ چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ گوہر چائے لینے کے لئے چل پڑا تھا۔ بدخشانی کے کیبن میں اس وقت کئی آدمی موجود تھے اور بوریلو سے انگریزی میں طرح طرح کے سوالات کئے جا رہے تھے۔ میرے کانوں میں بس ایک ذرا سی باتیں پہنچیں۔ وہ کہنے لگا کہ بدخشانی پر برک نے پستول سے گولی چلائی تھی۔

یہاں رکنا مناسب نہیں تھا چنانچہ میں اپنے کیبن کی طرف چل پڑا۔ اس کی غلط بیانی نے خود اسے مجرم بنا دیا تھا۔ اگر وہ حقیقت بتا دیتا تو شاید کیپٹن اس کی بات مان لیتا۔

تھوڑی دیر کے بعد گوہر آفندی چائے لے کر آ گیا اور میرے سامنے رکھتا ہوا بولا
"فرمایئے آغا؟"

"دروازہ بند کر دو۔" میں نے اسے اشارے سے کہا اور اس نے جھپٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ میں نے اپنی چائے بناتے ہوئے کہا۔ "ایک افسوس ناک خبر ہے گوہر آفندی، آغا بدخشانی کو بورسیلو نے شوٹ کر دیا۔"

"کیا؟" گوہر آفندی اچھل پڑا۔

"ہاں۔ آغا بدخشانی مر چکا ہے۔"

"مگر کب آغا؟"

"رات کو تقریباً دو بجے مجھے کیپٹن نے سوتے سے جگا کر بتایا۔"

"اوہو...... شاید اسی لئے اس وقت اس کے کیبن میں بہت سے لوگ موجود ہیں۔ بس آغا، قدرت......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ میں نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا اس نے سر جھکا لیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔

"تم کچھ کہہ رہے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے ابھی تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔"

"ایسا نہ سمجھئے آغا، بس یونہی۔"

"ٹھیک ہے، تمہاری مرضی ہے گوہر۔ ویسے تم یقین کر لو، تم پہلے آدمی ہو جسے میں نے دوستی کے لئے پسند کیا تھا۔"

وہ شرمندہ ہو کر جھکتے ہوئے بولا۔ "آغا! میں آپ کا خادم ہوں۔ لیکن اس جہاز کے قانون سے ڈرتا ہوں۔" اس نے انگلی سے ٹریگر دبانے کا اشارہ کیا تو میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"آفندی! پہلے ساحلی شہر پر پہنچتے ہی میں اس لانچ کو چھوڑ رہا ہوں۔ اگر تم ان جرائم پیشہ افراد کے چنگل سے نکل کر شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو میں تمہیں اپنے ساتھ آنے کی پیشکش کرتا ہوں۔"

وہ آہستہ سے بولا۔ "آغا! آپ میرا امتحان تو نہیں لے رہے؟"

"امتحان...... کیسا امتحان؟"

"یہی کہ میں اپنے آقاؤں سے کس حد تک وفادار ہوں؟"

میں نے چائے کی پیالی اٹھا کر چند گھونٹ لئے اور آہستہ سے بولا۔ "جو کچھ کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو۔"

"ایک سوال کرنا چاہتا ہوں آقا! کیا آپ ان لوگوں کے شریک نہیں ہیں؟"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا، پھر بولا۔ "شریک؟"

"ہاں۔"

"نہیں گوہر! میں ان میں سے کسی کا شریک کار تو کیا دوست بھی نہیں ہوں اور اسی لئے مجھے ایک دوست کی ضرورت ہے۔ بولو، کیا تم میرے دوست بننا پسند کرو گے؟"

وہ سر جھکا کر بولا۔ "قربانت شوم۔ میں آپ کا خادم ہوں آغا! آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ اب آپ کو میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے جواہرات بدخشانی نے بورسیلو کے تعاون سے اڑائے تھے اور غالباً اسی وجہ سے بورسیلو نے......"

"تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟"

"میں نے شام کو بدخشانی کو چند یاقوت میز پر رکھے محدب شیشے سے معائنہ کرتے دیکھا تھا۔ جیسے ہی میں کیبن میں داخل ہوا اس نے ان پر کتاب رکھ دی لیکن میرے منہ سے نکل ہی گیا۔"

"کیا یہ جواہرات آقائی برک کے ہیں آغا؟"

"اوہو، پھر تو وہ تم پر بگڑ گیا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"نہیں آغا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ بمشکل سنبھل کر بولا۔ برک کے جواہرات، کیا اس نے تم سے ایسا کہا ہے؟"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے چوری کے متعلق تو کچھ نہیں کہا آغا! لیکن اتنا ضرور کہا کہ ہاں وہ اپنے کھوئے ہوئے جواہرات تلاش کر رہے ہیں۔ اس پر وہ بولا کہ تم پاگل ہو گئے ہو۔ زیادہ بکواس مت کیا کرو۔"

"یہ تو تم نے بڑی غلطی کی تھی گوہر! خیر اب جواہرات کا ذکر نہ آئے ورنہ بدخشانی کے قتل کا الزام ہم پر آ جائے گا۔ اچھا اب ٹرے اٹھاؤ اور بدخشانی کے کیبن میں جا کر ذرا کی معلومات حاصل کرو اور مجھے بتاؤ۔ اگر ایک مرتبہ ہم یہاں سے بچ کر نکل گئے تو پھر

ہمارے سامنے دنیا پڑی ہے۔"

"ٹھیک ہے آغا!" اس نے ٹرے اٹھائی اور سر جھکا کر باہر چلا گیا۔ میں ایک بار بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ باہر عرشے پر لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ میں پڑا منتظر ر[illegible] یہاں تک کہ جب صبح کی سفیدی نمودار ہوئی تو کسی نے دروازہ بجایا۔ میں نے پستو[illegible] سنبھال کر جیب میں رکھا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ گوہر ناشتے کی ٹرے لے کر ا[illegible] داخل ہوا تو میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے ٹرے تپائی پر رکھی اور بولا۔

"خدا کا شکر ہے آغا! سب ٹھیک ہو گیا۔ ایک اطلاع میں آپ کے لئے لایا ہوں۔

"کیا؟"

"بورسیلو کو بھی بدخشانی کی لاش کے ساتھ سمندر کی تہہ میں پہنچا دیا گیا۔"

"اوہو...... اچھا؟"

"ہاں، اسے موقع پر ہی اس قتل کی سزا دے دی گئی۔"

"اب اس لانچ کا مالک کون ہے؟"

"بدخشانی کا ماموں زاد بھائی علی حکمت۔" اس نے جواب دیا۔

"اوہو...... کیا اس کا کوئی بھائی بھی یہاں لانچ پر موجود تھا؟"

"ہاں، وہ اس وقت بدخشانی کے کیبن میں ہے۔"

"ایک ترکیب سمجھ میں آتی ہے آغا!" گوہر بولا تو میں نے چائے پیتے ہوئے اس طرف دیکھا اور وہ قریب آ گیا اور بولا۔ "آپ بدخشانی کے مارے جانے کا افسوس کرنے کے بعد اس سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے کچھ جواہرات بدخشانی کے پاس رکھوائے تھے۔ مجھے یقین ہے تفصیل پوچھنے کے بعد وہ آپ کو لوٹا دے گا۔"

"نہیں دوست! ہزاروں ڈالر کی قیمت کے جواہرات کون لوٹاتا ہے۔ الٹی مصیـ[illegible] گلے پڑ جائے گی۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ اور جب میں ناشتہ کر چکا تو وہ ٹرے لے کر چلا گیا۔ اس جانے کے بعد میں نے شیو وغیرہ کی اور کپڑے پہن کر بدخشانی کے کیبن میں پہنچ[illegible] یہاں علی حکمت دو تین آدمیوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے بدخشانی کے قتـ[illegible] اظہارِ افسوس کیا اور اس سے اپنے دوستانہ تعلقات کا تذکرہ کیا اور پھر تعزیت کرنے بعد وہاں سے چلا آیا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد میں نے پھر علی حکمت کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ اس دوران گوہر آ کر مجھے بتا گیا تھا کہ لانچ اب نیپلز سے کوئی ایک سو تیس میل کے فاصلے پر ہے اور آج رات کو دس بجے کے بعد کسی وقت وہاں لنگر انداز ہو جائے گی۔ یہ اطلاع بھی میرے لئے خاصی اہمیت کی حامل تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ نیپلز پہنچتے ہی جہاز چھوڑ دوں گا۔ گوہر میرا ساتھ دینے کے لئے تیار تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ نیپلز کے علاوہ اٹلی کے دوسرے بہت سے شہروں میں بھی بہت سی بار آ جا چکا ہے اور تمام مشہور مقامات اور قیام گاہوں سے کافی واقفیت رکھتا ہے۔ میں کیبن سے نکل ہی رہا تھا کہ وہ آ گیا اور مسکرا کر بولا۔

"آغا! میں نے علی حکمت سے سرسری طور پر تذکرہ کیا تھا کہ مسٹر برک، آقائی بد خشانی اور ہشمان ذکری کے خاص رفیقوں میں سے ہیں۔ وہ کئی لانچوں کے مالک ہیں جو ہندوستان اور چین کے درمیان لاکھوں روپے کا سامان اِدھر سے اُدھر منتقل کرتی ہیں۔ فی الحال اس سلسلے میں اٹلی اور فرانس وغیرہ گھومنے نکلے ہیں۔"

"واہ...... تم نے اس سے ہم پیشہ کی حیثیت سے میرا تعارف کرا دیا۔"

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر رازدارانہ انداز میں کہا۔ "یہ تمہید ضروری تھی آغا! اب اگر آپ اس سے جواہرات کا تذکرہ کریں گے تو وہ یقیناً بدخشانی کے سامان سے ان کو تلاش کرے گا اور اگر وہ مل گئے تو فوراً لوٹا دے گا۔ یہ لوگ دوسروں کے لئے خواہ کتنے ہی بے ایمان اور ظالم ہوں لیکن خود جیسے لوگوں کے ساتھ نہایت خوش معاملہ ہیں۔ آپ یہ کہئے کہ آپ جواہرات، کرنسی اور افیون اسمگل کرتے ہیں۔"

"تم تو بہت چالاک ہو گوہر! واقعی کام کے آدمی لگتے ہو۔"

پھر میں باخشانی کے کیبن کی طرف چل دیا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ تین چار مرتبہ دستک دینے کے بعد علی حکمت نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کر مسکرا کر بولا۔ "واہ...... مسٹر برک، میں تمہارا ہی کام کر رہا تھا۔"

"میرا کام، وہ کیا؟" میں نے سوال کیا تو وہ بولا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے بدخشانی کے پاس کوئی چیز رکھوائی تھی۔"

"اوہو...... لیکن اس کے لئے اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے حکمت علی۔ تھوڑے سے ہیرے اور یاقوت وغیرہ تھے، کوئی اتنی بڑی چیز تو نہیں۔ ابھی تو میرے دل

سے بدخشانی کے قتل کا صدمہ بھی ہلکا نہیں پڑا۔" میں پیشانی پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ حکمت بھی میرے قریب بیٹھ گیا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"علی حکمت! بدخشانی کے نہ ہونے سے میرا تمام پروگرام تلپٹ ہو گیا۔ وہ اٹلی فرانس کے تمام بڑے شہروں میں ہم پیشہ تاجروں سے میرا تعارف کرانے کے لئے تھا۔ یہاں بھی بہت سی چیزوں کی کھپت ہو سکتی ہے۔ ہمارا کاروبار وسیع ہوتا۔ ہم ا دوسرے کو بڑے بڑے فائدے پہنچاتے۔ لیکن ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔"

علی حکمت گہری نگاہوں سے میرا جائزہ لیتا رہا، پھر آگے بڑھ کر بولا۔ "کوئی با نہیں مسٹر برک، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں جتنے لوگوں سے واقف ہوں ان سب تمہارا تعارف کرا دوں گا۔"

"بہت بہت شکریہ مسٹر حکمت!"

"اچھا یہ بتایئے، جواہرات کی کل تعداد کتنی تھی؟"

"میں نے کہا تھا، ایک چھوٹی سی بات ہے۔ بارہ یا چودہ ہیں، مل جائیں گے۔ نہ ملے تو کیا ہوتا ہے۔ اتنے معمولی قیمت کے ہیروں کی اہمیت ہی کیا ہے۔ ہاں اتنا ض ہے کہ وہ ہزاروں میں سے چن کر نمونوں کے طور پر دکھانے کے لئے لائے گئے تھے۔"

وہ جواب دینے کی بجائے اٹھا اور بدخشانی کے ٹرنک کا قفل کھولنے لگا۔ میں اٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا علی حکمت، میں چلتا ہوں۔ ہیرے اگر مل جائیں تو مجھے بھجوا ورنہ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس سے ہمارے تعلقات پر کوئی اثر نہیں سکتا۔"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے کیبن سے نکل کر دروازہ بند کیا اور واپس ا کیبن کی طرف چل پڑا۔ یہ ایک اچھا اسٹارٹ تھا اور آگے چل کر اس سے بہت فائدے ہو سکتے تھے۔

☆

اس وقت شام کے تقریباً ساڑھے سات بجے تھے۔ میں بھوک لگنے کی وجہ سے جل کھانا کھا چکا تھا اور پھر کھانا کھا کر کیبن سے باہر نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ علی حکمت گھ ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ ایک چرمی پیکٹ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔

"یہ پیکٹ بدخشانی کے سامان میں ملا ہے۔ اسے چیک کرو برک! یہ تمہارے ہیر

ہیں یا نہیں"

میں نے پیکٹ کھول کر دیکھا، یہ میرے ہی ہیرے تھے۔ میں نے ایک نظر میں پہچان کر کہا۔ "شکریہ علی حکمت! یہ ہیرے میرے ہی ہیں۔ بہت بہت شکریہ، تم قابل اعتماد دوست ثابت ہوئے۔"

وہ مسکرانے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔ "شکریہ مسٹر برک! لیکن انہیں اپنی اندرونی جیب میں رکھو۔ کیش اور ٹریولر چیک وغیرہ بھی کسی واٹر پروف کور میں رکھو۔ میں تمہیں ایک بری خبر سنانے آیا ہوں۔"

"کیا......؟" میں نے پیکٹ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ہم گھر چکے ہیں مسٹر برک! تین چار لانچیں ہماری طرف بڑھ رہی ہیں۔ اور یہ کسٹمز کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتیں۔"

میں نے غور سے اس کی بات سنی اور پھر اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ایک لمحے کے اندر اندر میرے ذہن کی چرخیاں چل پڑیں اور بہت کچھ سوچ ڈالا میں نے۔ جو کچھ میں نے سوچا اسے سوچ کر میرے دل کو تسلی سی ہوئی تھی۔ میں نے کچھ لمحے سوچ کر اس سے کہا۔

"نیپلز کتنی دور ہے؟"

"تقریباً اٹھائیس میل۔"

"تو کیا ہم لوٹ نہیں سکتے؟"

"ممکن نہیں ہے۔" اس نے کہا اور پھر چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ "برک! میں تمہیں ایک لائف جیکٹ دیتا ہوں، اسے پہن لو۔ اب کسی بھی لمحے وہ ہمیں گھیر کر پکڑ سکتے ہیں۔"

میں ہنس پڑا۔ میں نے کہا۔ "شکریہ، مجھے لائف جیکٹ کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیوں آخر...... کیا گرفتار ہونا چاہتے ہو یا زندگی عزیز نہیں ہے؟" اس نے کہا۔

"نہیں میرے دوست، دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں ہے۔ بلکہ تم مجھے بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟" میرے اندر ایک جولانی سی پیدا ہو گئی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے میں بڑی سے بڑی بات پر نہیں اتراتا تھا، لیکن نجانے کیوں اس وقت طبیعت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔

حکمت ایک قدم آگے بڑھا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ ''تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔ لیکن اس وقت اس مدد کا کوئی چانس نہیں ہے۔ اگر ہے تو صرف یہ کہ ان اطالوی کسٹم افسروں سے تم بات کرو۔ کیونکہ وہ مجھے پہچانتے ہیں۔ بلکہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ ان کے سامنے آنے کی بجائے میں سمندر میں چھلانگ لگانا پسند کروں گا۔''

میں نے گردن ہلائی۔ اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی اور ہم نے کپتان کو دیکھا جو پریشان اور فکرمند دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی آواز ابھری۔

''آقائی، وہ بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ کوکین کے تمام پیکٹ تو پھینک دیئے گئے ہیں لیکن دوسری چیزیں موجود ہیں۔ سینکڑوں بکس ہیں اور اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم انہیں سمندر میں گرا سکیں۔''

''رُک جاؤ، برک کو ان سے بات کرنے دو۔ شاید مان جائیں۔'' پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''مائی ڈیئر برک! تم برطانوی تاجر کی حیثیت سے ان سے بات کرو اور پچاس ہزار ڈالر تک کی پیشکش کر کے دیکھو۔ ہوسکتا ہے تمہیں انگریز سمجھ کر وہ دوستی کے لئے تیار ہو جائیں۔ بلکہ تھوڑا سا یقین ہے مجھے۔''

''مگر مائی ڈیئر علی حکمت! میں اطالوی زبان نہیں بول سکتا۔''

''اوہ...... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ انگریزی سمجھتے ہیں۔ اور پھر کیپٹن تمہارے ساتھ ہوگا۔ جلدی بولو، کیا کہتے ہو؟''

''اوکے، میں کوشش کر کے دیکھ لوں گا۔ لیکن اگر وہ نہ مانے تو میرے لئے فرار کا راستہ بھی بند ہو جائے گا اور بہرحال میں کسی قیمت پر گرفتار ہونا پسند نہیں کرتا۔''

''ٹھیک ہے، اگر ایسا ہے تو تم بے فکر رہو۔ ہم مقابلہ کریں گے اور تمہارے لئے موقع فراہم کریں گے۔ بلکہ......'' وہ ایک لمحے کو رُکا پھر بولا۔ ''میں تم پر اعتماد کرتا ہوں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ آؤ کیپٹن، لانچ رکواؤ۔ میں بات کرتا ہوں۔''

کیپٹن انجن روم کی طرف چل پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد لانچ رک گئی۔ میں ریلنگ پر پہنچ گیا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک لانچ کی روشنی ہماری جانب بڑھ رہی تھی۔ کیپٹن نے کہا۔ ''یہی ہے۔ دوسری دو لانچیں اس کو کور کئے ہوئے ہیں۔''

میں خاموشی سے سمندر میں یہ کھیل دیکھنے لگا۔ لانچ آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر وہ رک گئی تو میں نے کیپٹن سے کہا۔ ''ان سے رابطہ قائم کرو کیپٹن!''

کیپٹن نے ٹارچ روشن کر کے روشنی آنے والی لانچ پر پھینکی۔ دو کسٹم آفیسر ڈیک پر کھڑے ہوئے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی، دوسرا دستی مائیکروفون لئے ہوئے تھا۔ لائٹ دیکھتے ہی اس نے مائیک پر کہا۔

''ہیلو، کسٹمز اور کوسٹ گارڈ تمہاری لانچ کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔''

کیپٹن نے میری طرف دیکھا۔ لانچ آہستہ آہستہ اور قریب آ گئی۔ میں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

''آفیسرز! آپ شوق سے تلاشی لے سکتے ہیں۔''

کسٹم آفیسر نے پیچھے کی طرف رُخ کر کے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ چار آدمیوں نے ایک چھوٹا سا گین وے گھسیٹ کر اس کا سرا ہماری لانچ پر رکھ دیا۔ آگے آنے والے دونوں آفیسر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے لانچ پر آ گئے۔

''ہیلو......'' میں نے مسکرا کر ان کو ریسیو کیا۔ انہوں نے بھی میرے اس تپاک کا جواب تپاک سے ہی دیا۔

''آیئے۔'' میں نے ان سے کہا اور بدخشانی کے کیبن کی طرف چل پڑا۔ روشنی میں آتے ہی دونوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر ان میں سے ایک نے سوال کیا۔

''آپ مصری ہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے مسکرا کر کہا اور کیبن میں داخل ہو گیا۔

''تو پھر......؟''

''آفیسر، میں برٹش ہوں۔ میرا نام برک ہے۔ ویسے آپ کس سلسلے میں میری لانچ کی تلاشی لینا چاہتے ہیں؟''

''ظاہر ہے سمندر میں کس سلسلے میں تلاشی لی جا سکتی ہے مسٹر برک۔''

''آیئے بیٹھئے، کیا ہم دوستوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ سلوک نہیں کر سکتے؟''

''ہاں، کیوں نہیں۔ لیکن قانون کے مطالبات پورے ہونے کے بعد۔''

''کیا خیال ہے کیپٹن! پچیس ہزار ڈالر کیسے رہیں گے؟''

''اوکے سر۔'' کیپٹن واپس مڑا تو کسٹم آفیسر نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔''

میں نے فوراً کہا۔ ''تیس؟''

اس نے پھر نو موسیو کہا تو میں نے یہ رقم چالیس ہزار کر دی۔ جب اس پر بھی کسٹمز
آفیسر نے گردن لہرائی تو میں نے ہمتی لہجے میں کہا۔
''آفیسر! پچاس ہزار ڈالر۔'' یہ کہہ کر میں کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر کہا۔ ''یہ فائنل ہے
قبول کر سکتے ہو تو کر لو۔ ورنہ تلاشی میں تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ ہم ایک سیکنڈ میں سب کچھ
سمندر کی تہہ میں پہنچا سکتے ہیں۔''
دونوں آفیسر میری بات سن کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے کیپٹن کی
طرف دیکھ کر کہا۔ ''لے آؤ کیپٹن! اٹالین آفیسر بے وقوف نہیں ہوتے۔''
کیپٹن سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ بہر حال انہوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ میں نے
کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''اب تو ہم دوست بن گئے ہیں۔ پلیز بیٹھیے۔ یہ ہماری دوستی کا آغاز ہے اور یہ
سلسلہ جاری رہے گا۔ ہم بہت جلد پھر ملیں گے۔ اور یہ پیشکش جاری رہے گی۔''
وہ مسکرا دیئے لیکن اسی طرح کھڑے رہے۔ میں ان کی احتیاط پر ہنس دیا اور میز سے
سگریٹ کیس اٹھا کر انہیں پیش کیا۔
''نہیں شکریہ۔'' انہوں نے میرا ہاتھ پیچھے دھکیل دیا۔ میں نے ایک سگریٹ نکال کر
سلگاتے ہوئے کہا۔
''ہم برطانوی لوگ دوستی کا ہاتھ بڑھا کر دھوکے سے وار نہیں کیا کرتے آفیسر۔''
''آپ ٹھیک کہتے ہیں سر! لیکن ابھی ہم دوست نہیں ہیں۔''
پھر اس نے اپنے ساتھی کی طرف رخ کر کے اطالوی زبان میں کچھ کہا۔ ریلنگ کے
پاس جا کر اس نے اپنی لانچ میں کھڑے ہوئے سپاہیوں سے دو تین جملے تبدیل کیے، پھر
واپس آ گیا اور اس کے پیچھے ہی ہمارا کپتان ہاتھ میں ایک بریف کیس لئے ہوئے کیبن
میں داخل ہو گیا اور بریف کیس میز پر رکھ کر چابی میرے ہاتھ میں دے دی۔ میں نے
بریف کیس کھول کر ڈالروں کی گڈیاں باہر نکالیں اور کسٹمز آفیسر کے سامنے سو سو ڈالر
والے پچاس ہزار ڈالر رکھ دیئے۔ دونوں نے ایک ایک نوٹ کو چیک کیا پھر کسٹمز آفیسر
نے رقم بریف کیس میں رکھ کر کہا۔
''ٹھیک ہے جناب۔''
''کیا خیال ہے، اب تو ہم دوست ہیں اور ہاتھ ملا سکتے ہیں؟''

دونوں نے مسکرا کر گردن ہلائی اور باری باری مصافحہ کیا۔ میں نے کسٹمز آفیسر کا نام
دریافت کرنے کے بعد کہا۔
''موسیو! اب آپ ہمیں کس قسم کا پروٹیکشن دیں گے؟''
میرا یہ سوال سن کر دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آخر کسٹم آفیسر نے مجھ
سے کہا۔ ''آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟''
میں نے کپتان کی طرف دیکھا تو کپتان بولا۔ ''نیپلز۔''
کسٹم آفیسر نے اپنے اسسٹنٹ سے اطالوی زبان میں دو تین جملے تبدیل کیے، پھر
جیب سے پین نکالا اور کپتان کے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ایک نشان بنا کر اپنے دستخط کیے
اور مجھ سے کہا۔ ''آپ بارہ بجے کے قریب ٹورٹین کی سیڑھیوں کے قریب لانچ روک کر
سامان اتاریں۔ ہوٹل میں ہمارا ایک آدمی ملے گا، وہ آپ کی ہر طرح مدد کریں گا۔
سمندر میں ہمارے سوا اس وقت اور کوئی نہیں ہے اور آپ کو ہمارے پیچھے کچھ فاصلہ
دے کر چلنا ہے۔''
میں نے کپتان کی طرف دیکھا تو کپتان نے گردن ہلا کر کہا۔ ''ٹھیک ہے مسٹر برک۔''
''اوکے آفیسر! بہت اچھا۔'' میں نے مسکرا کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا اور
دونوں مصافحہ کر کے بریف کیس اٹھا کر چل دیئے۔ کسٹمز کی لانچ ان کے پہنچتے ہی چلنے
لگی۔ میں نے ریلنگ سے انہیں سیز موگراف کے ذریعے دوسری لانچوں کو سگنل دیتے اور
پھر تینوں کو کلوز اپ ہو کر نیپلز کی جانب جاتے ہوئے دیکھا۔
''ٹھیک ہے کپتان، چلو۔'' میں نے کپتان کو اشارہ کیا اور وہ انجن روم کی جانب چل
پڑا۔ میں پھر واپس بدخشانی کے کیبن میں آ گیا۔ جیسے ہی لانچ چلی، علی حکمت اندر داخل
ہوا اور کہنے لگا۔
''واہ مائی ڈیئر برک! تم نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ میں ان سے کبھی اتنی
آسانی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا۔''
میں تھکے تھکے انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''ڈالر ہر مسئلہ حل کر سکتا ہے علی
حکمت۔ صرف حکمت عملی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کاش تم علی حکمت کی بجائے حکمت عملی
ہوتے۔''
علی حکمت نے میری بات پر قہقہہ لگایا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''برک تم دوست

ہو۔ ہمیشہ میرے ساتھ رہو۔"

میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے جذبات کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن میرے دوست، یہ میری لائن نہیں ہے۔ اس وقت میں نے بے شک تمہاری مدد کی ہے صرف اس وجہ سے کہ بورسیلو نے مجھے بدخشانی کے قتل میں ملوث کرنے کی جو کوشش کی تھی تم لوگوں نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔"

"ہم اندھے نہیں ہیں، صحیح اور غلط کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ خیر اس ذکر کو چھوڑو۔ میں تمہیں ایک پیشکش کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا؟"

"ہمارے پارٹنر بن جاؤ۔ صرف پانچ لاکھ ڈالر کا چیک دے دو، تم پچیس فیصد کاروبار کے مالک بن جاؤ گے۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

"نہیں میری جان! میں نے زندگی میں پانچ لاکھ بینک کے سوا کہیں نہیں دیکھے۔ تم مجھے اتنا امیر نہ سمجھو۔"

وہ کندھے اچکا کر بولا۔ "پرواہ نہیں ہے برک! تم صرف ایک نوٹ لکھ دو۔ ہشمان ذکری خوشی سے تمہارے نام پر یہ رقم ادا کر دے گا۔"

"نہیں دوست! میں دوستوں سے قرض نہیں لیا کرتا۔ خیر جانے دو، نیپلز میں ہم دونوں ایک دوسرے کو خدا حافظ کہیں گے اور پھر شاید ہی کبھی دوبارہ ملیں۔"

وہ کچھ لمحے سوچتا رہا، پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر کی جانب چل پڑا۔ دو گلاسوں میں وہسکی انڈیل کر اس نے ایک میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"لو پیو آغا! ہم مشکل ہی سے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ سکیں گے۔ اگر کسٹمز والوں نے ہمیں کوئی دھوکا نہ دیا تو ہمیں ایک ہفتے یا زیادہ سے زیادہ عرصے نیپلز میں ٹھہرنا ہوگا۔ سیر و تفریح، اٹالین لڑکیاں، پومپائی کے مٹ کر دوبارہ ابھرے ہوئے نقوش کا مطالعہ اور کیا نہیں۔ میں تمہارے لئے بہترین کمپنی کا انتظام کروں گا اور تم اس کے حسن میں ڈوب کر وطن اور عزیز و اقارب تو کیا خود کو بھی بھول جاؤ گے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے عمر خیام بنانا چاہتے ہو۔ بنا دینا۔ لیکن میں تمہیں بتاؤں کہ حسین سے حسین غزلوں کی ورق گردانی کرتے کرتے مر جاؤں گا لیکن ایک بھی رباعی تخلیق نہ کر پاؤں گا۔"

"نہ کرنا، کیا فرق پڑتا ہے۔ دنیا کے بازار میں ڈالر، پاؤنڈ، دینار، تومان، ریال اور روپیہ چلتا ہے۔ رباعیاں اور شعر نہیں چلتے۔"

میں ہنسنے لگا۔ علی حکمت اچھے جواب دیتا تھا۔

بہرحال ہم سفر کرتے رہے۔ گیارہ بجے ہماری لانچ نیپلز سے کچھ فاصلے پر ساحل پر لنگر انداز ہوگئی اور صبح کے تین بجے تھے جس وقت حکمت مجھے ساتھ لے کر ٹورسٹ کے ایک کمرے میں داخل ہوا تو کسٹم آفیسر سادہ سوٹ میں ملبوس پہلے سے موجود تھا۔ اس نے اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور دروازے کے قریب جاتے ہوئے بولا۔

"موسیو برک! آپ کا تمام سامان آپ کے آدمیوں کی نگرانی میں شہر بھجوا دیا گیا ہے۔ ہم نے دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ اب پھر کسی وقت ملیں گے، شب بخیر۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ باہر نکل گیا۔ حکمت نے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا خیال ہے حکمت! یہ صحیح کہہ رہا تھا؟"

"امکان تو یہی ہے۔ لیکن کیا کہا جا سکتا ہے جب تک کہ ڈلیوری کی رسید نہ مل جائے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "جہاں تک میرے تجربے کا تعلق ہے اس کے الفاظ سچائی پر ہی مبنی تھے۔ لیکن اس کے باوجود اگر اس نے ہمیں ڈبل کراس کیا ہے تو میں پچاس ہزار ڈالر اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اگلوا سکتا ہوں۔ چاہے اس کے لئے مجھے اسے پچاس حصوں میں ہی کیوں نہ تقسیم کرنا پڑے۔"

نجانے کیوں علی حکمت ایک دم جذباتی سا ہو گیا۔ "قسم کھاتا ہوں......"

"نہیں، کوئی قسم نہ کھاؤ...... مردوں کی طرح سینہ تان کر کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"بس میرا دل نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے الگ ہو۔ اگر تم واقعی اتنے ہی طاقتور ثابت ہوئے تو میں کسی قیمت پر تمہیں جانے نہیں دوں گا۔"

میں نے ہنس کر بستر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "میں اس طاقت سے ایک ہی بار کام لے سکتا ہوں حکمت! اس لئے اتنا کارآمد نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ خیر تم جاؤ، بے فکر ہو کر جاؤ۔"

لیکن وہ جانے کی بجائے صوفے پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر پینے لگا۔ میں نے تیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے مسکرا کر چھت کی طرف دھواں چھوڑا اور

دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ میں سلیپنگ سوٹ لے کر پارٹیشن کی طرف چل پڑا۔ وہ اسی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھے صوفے سے ٹیک لگا کر سگریٹ پیتا رہا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے کہا۔

"کیا بات ہے حکمت! کچھ اور کہنا چاہتے ہو مجھ سے؟"

"مسٹر برک! پتہ نہیں کیوں مجھے نیند نہیں آ رہی۔"

"تم ابھی تک شاید خطرہ محسوس کر رہے ہو۔"

"ہاں کسی حد تک۔ لیکن اس سے ہٹ کر بھی کچھ اور ہے جو مجھے معلوم نہیں۔"

"اپنے کمرے میں جا کر ایک پیگ لو۔ نیند آ جائے گی۔"

وہ سگریٹ ایش ٹرے میں رکھ کر صوفے سے اٹھا اور دروازے کے قریب پہنچ کر بولا۔ "آؤ، بولٹ چڑھا دو۔ میں چل رہا ہوں۔"

میں بستر سے اٹھا تو وہ جا چکا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کش لیتا ہوا دروازے پر آیا۔ بولٹ چڑھا کر لوٹنے لگا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں چلتے چلتے رک گیا اور میں نے گھڑی پر نظر ڈالی، چار بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ دروازہ ایک بار پھر بجایا گیا اور میں نے بولٹ سرکا کر دروازہ کھولا تو چمپا کی بو کا ایک جھونکا میری ناک سے ٹکرایا۔ میری توقع کے مطابق دروازے پر وردان سادھانی کھڑا ہوا تھا۔ چمپا کی تیز خوشبو کا جھونکا اندر آیا۔ میں نے نگاہیں ملتے ہی "شبھ آگمن" کہہ کر دروازہ کھول دیا۔ لیکن اس کے پیچھے ہی ماشرہ کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ جے جے دھرم راج کہتا ہوا اندر آ گیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا کمرے کے درمیان میں پہنچ کر ماشرہ بولا۔

"دھرم راج! مجھے اس لئے آنا پڑا۔"

"بیٹھو ماشرہ۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر صوفے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ابھی نہیں۔"

"بیٹھ جاؤ، اتنی جلدی بھی کیا ہے؟"

"آپ جانتے ہیں بدھی ستو! کہ میں نے کتنی دور جانا ہے۔ بیٹھنے کا وقت کہاں۔"

"ٹھیک ہے، مجھے پتہ ہے کہ تمہیں کتنی دور جانا ہے۔ مگر خیر میں اس وقت کیا کر سکتا ہوں تمہارے لئے؟"

"دھرم راج! میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ ان ابو گیاہ کاموں میں ان لوگوں

سے سہ کار نہ کیجئے آپ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے جو انسان کی ذلت کے لئے کسی بھی روپ میں بڑائی ثابت ہو۔ آپ کو تو صرف بھلائی کرنا ہے۔"

"ہاں، میں سمجھ چکا ہوں اس بات کو۔ واقعی مجھے سب کے ساتھ بھلائی کرنا چاہئے۔"

میرے طنزیہ الفاظ پر وہ ہنس دیا اور بولا۔ "سب کے ساتھ نہیں دھرم راج! آپ پاپی آتماؤں کے ساتھ بھلائی نہیں کر سکتے۔ سماج دشمنوں کے ساتھ بھلائی نہیں کر سکتے آپ۔ ان کے ساتھ دھرم نیتی انوسار سلوک کر سکتے ہیں۔ اچھا اوم نموستو بدھی ستو، چلتا ہوں۔"

"کیا تم مجھے یہی بتانے آئے تھے؟"

"ہاں بدھی ستو۔ یہ آپ کا کام نہیں ہے۔ اوم نموستو۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر رخصتی سلام کیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وردان سادھانی بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے نکل گیا تھا۔ میں بستر پر آ کر لیٹ گیا اور دونوں کی آمد پر سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔ کچھ اس طرح ذہن الجھا تھا کہ دروازہ بھی لاک نہیں کر پایا اور بستر پر لیٹ کر سوچ کی آغوش میں پہنچ گیا اور سوچ نے میری پلکوں کو نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔

نجانے کب تک سوتا رہا کہ علی حکمت نے جھنجھوڑ کر مجھے اٹھایا۔ میں نے ماحول کا جائزہ لیا تو خوب روشنی ہو گئی تھی۔ کلائی پر بندھی گھڑی گیارہ بجا رہی تھی۔

"صبح بخیر آغا!" علی حکمت صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ہاں، اب تم بتاؤ علی حکمت، مال کی کیا رپورٹ ہے؟"

"وہ پہنچ گیا۔ تم جیت گئے۔ منہ ہاتھ دھو کر آؤ، میں تمہارے ساتھ چائے پیوں گا۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور ٹوائلٹ کی طرف چل پڑا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ میں نے شیو و غسل وغیرہ میں صرف کیا۔ واپس آیا تو میز پر ناشتے کی ٹرے رکھی ہوئی تھی اور علی حکمت کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے میری پیالی انڈیلتے ہوئے کہا۔

"برک! ہوٹل میں، میں نے تمہارا نام رجسٹر نہیں کرایا ہے۔ اس لئے تمہیں کہیں جانا ہو تو میرے ساتھ چلنا تاکہ پاسپورٹ کے سلسلے میں کوئی جھگڑا کھڑا نہ ہو جائے۔"

میں نے لاپرواہی سے چائے کی پیالی اٹھائی اور چائے پینے لگا۔ وہ تھوڑی دیر تک میری طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔

"ناشتے کے بعد سیر کرنے چل رہے ہیں۔ کیا چلنا پسند کرو گے؟"

"کیوں نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"ویسے ایک بات کہوں تم سے؟"

"کہہ ڈالو، پوچھتے کیوں ہو؟"

"میں نے رات کو تم سے ایک جھوٹ بولا ہے۔ اب اس کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "علی حکمت! اعتراف جرم تو جرم سے بدتر سمجھا جاتا ہے۔ تم اس تکلف میں نہ پڑو تو کیا حرج ہے۔"

"نہیں، میں مصلحتاً یا کاروباری تقاضوں سے مجبور ہو کر جھوٹ بولنے کو جرم نہیں سمجھتا۔ لیکن دوست پر اعتماد نہ کرنے کو سنگین جرم سمجھتا ہوں۔ خصوصاً تم جیسے دوست پر۔"

"مگر قصہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ جو میں نے کہا تھا کہ کوکین تلف ہو گئی ہے، جھوٹ تھا۔ سچ یہ ہے کہ پورا کیس حفاظت سے ایجنٹ تک پہنچایا جا چکا ہے۔"

"یہ تو اچھا ہوا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"ہاں، بہت اچھا ہوا۔" اس نے کپ ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم تمہیں تمہارا حصہ پیش کر رہے ہیں۔"

"تمہاری مرضی ہے۔ حالانکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم مجھے روک لینے کے خیال سے یہ رقم یا حصہ پیش کر رہے ہو تو میری رائے ہے کہ اسے ضائع نہ کرو۔ مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو گا سوائے اس کے کہ کچھ راتیں خوبصورت ہو جائیں گی۔"

"چلو یہی سہی۔ میں دو تین دن تک تمہارے ساتھ رہوں گا، اس کے بعد چلا جاؤں گا۔ اس عرصے میں تم اس شہر سے واقف ہو جاؤ گے۔ اگر رک سکو تو یہیں رک جانا ورنہ تین ماہ کے بعد ہماری لانچ پھر یہاں آئے گی۔"

"ٹھیک ہے...... ٹھیک کہتے ہو۔ دیکھ لوں گا، فیصلہ کر لوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے بات ختم کر دی اور میز سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے کپڑے وغیرہ پہنے اور باہر نکل آیا۔ لانچ کے سیکنڈ میٹ سے گوہر آفندی کے بارے میں پتہ کیا تو پتہ چلا کہ چند افسروں کے علاوہ تمام چھوٹے ملازمین لانچ پر ہی موجود ہیں۔ میں نے ایک نوٹ لکھ کر اس کو دیا کہ گوہر کو پہنچا دیا جائے۔ اس نے پرچی جیب

میں رکھتے ہوئے کہا۔

"آغا! شام کو چھ بجے میں خود پرچہ پہنچا دوں گا۔ اگر زبانی کچھ کہنا ہو تو وہ بھی فرما دیجئے۔"

"بس یہی کہنا ہے کہ اسے جتنی جلدی ممکن ہو سکے میرے پاس پہنچا دیا جائے۔"

"ٹھیک ہے جناب!" اس نے کہا اور میں وہاں سے بار کی طرف چل دیا۔ ایک ویٹر نے میری رہنمائی کی اور دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا۔ میں اندر داخل ہوا۔ دروازے سے ذرا ہٹ کر ایک دیوار سے دوسری دیوار تک طویل و عریض کاؤنٹر بنا ہوا تھا جس کے پیچھے چھ سات حسین بار میڈس کھڑی ہوئی تھیں۔ دو تین کے سامنے پینے والے موجود تھے جن کو وہ جام بھر بھر کر پلا رہی تھیں۔ کچھ اور لڑکیاں جن کے سامنے کوئی نہیں تھا وہ ہال میں بیٹھے ہوئے مہمان جوڑوں کے لئے لے جانے والی لڑکیوں کے آرڈر کے مطابق سپلائی کرنے میں مصروف تھیں۔ وہ آپس میں باتیں بھی کرتی جا رہی تھیں۔ تمام ہال ہنسنے بولنے کی ملی جلی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ میں ہال میں بیٹھنے والوں پر ایک سرسری نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھا اور ایک لڑکی کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔

"ہیلو۔" وہ مسکرا کر بولی۔

میں نے کاؤنٹر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ڈبل وہسکی، سوڈا کے ساتھ۔"

اس نے پلٹ کر بکس سے سوڈا اور واٹر کی کانچ کی بوتلیں نکالیں اور گلاس میں انڈیل دیں۔ ایک لڑکی میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ "ٹورسٹ؟"

"ہاں۔" میں نے سر ہلا کر گلاس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"ایرانی یا جرمن؟"

"نہیں، برٹش۔" میں نے جواب دیا۔

"پلیز۔" کاؤنٹر پر کھڑے آدمی نے پیتے پیتے میری طرف مڑ کر دیکھا اور پھر لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ لڑکی کو پتہ نہیں مجھ سے کیا دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، وہ کہنے لگی۔

"آفیسر یا بزنس مین؟"

"بزنس مین۔"

"تھینک یو سر! کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں آپ؟"

"یہیں روم نمبر سکسٹی نائن میں۔"

"تھرڈ فلور پر؟"

"ظاہر ہے۔" میں نے صرف یہاں کا ماحول دیکھنے کے لئے یہ شراب طلب کی تھی پھر میں پانچ ڈالر کا ایک نوٹ کاؤنٹر پر رکھ کر چلنے لگا تو اس نے دراز کھینچتے ہوئے کہا۔

"ایک منٹ پلیز۔"

"شام کو پھر آؤں گا میں۔"

"میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟"

"برک۔" اور اس کے بعد میں وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔ کاؤنٹر پر کھڑے آدمی نے پیتے پیتے میری طرف دیکھا لیکن میں نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔

شام چار بجے میں چائے پینے کے بعد حکمت کے ساتھ سیر کو جانے کے لئے اس کے کمرے سے باہر نکل رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے میز کے پاس جا کر ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہہ کر اطالوی زبان میں باتیں کرنے لگا۔ دو تین جملے تبدیل کرنے کے بعد میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"مسٹر برک! کوئی لڑکی تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔"

"کون ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"شاید بارمیڈس ہوگی۔ تم دیکھ لو، وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

میں نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا اور کہا۔ "برک اسپیکنگ۔"

"مسٹر برک! میں آف ہو کر گھر جا رہی ہوں۔ آپ......"

"ہاں بولو؟"

"میرا مطلب ہے......"

"ایسا کرو تم یہیں آ جاؤ۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر بولی۔ "ٹھیک ہے، میں آ رہی ہوں۔ وہ اصل میں آپ کی باقی رقم......"

"اگر بہت زیادہ بے چینی ہے تو پورا کیش بکس اٹھا لاؤ۔" میں نے کہا اور اس نے ہنس کر ریسیور رکھ دیا علی حکمت ہنستا ہوا میرے قریب آ کر بولا۔

"شاید تم سیر کو نہیں چل رہے مسٹر برک؟"

"چل رہا ہوں۔ مگر تم ذرا ٹھہر جاؤ۔"

وہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ میں نے کوٹ اتار کر ہینگر پر ٹانگا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ منٹ کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی جس کے دلکش خطوط اور سیاہ آنکھیں دیکھ کر میں سکتے میں آ گیا۔ بارمیڈس نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جولیانا۔ اور یہ مسٹر برک ہیں۔"

میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہیلو۔"

"ہیلو" وہ بولی۔

"آپ بیٹھئے۔" بارمیڈس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔" جولیانا بیٹھ گئی۔ نجانے کیوں اس لڑکی نے ایک لمحے کے اندر اندر میرے ذہن پر ایک ضرب سی لگائی تھی۔ وجہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا تھا اور ذہن پر یہ ضرب سی کیوں لگی تھی۔ لیکن پھر خود ہی اپنے خیال پر ہنسی بھی آ گئی۔ میری فطرت میں میرے باپ کی شخصیت شامل تھی۔ والد مرحوم اپنے دائرہ عمل میں بہت سے کھیل، کھیل چکے تھے۔ خاص طور سے سلطان چچا نے اسی بات کا اظہار کیا تھا۔ ہر خوبصورت چہرے کو دیکھ کر میری بھی کوئی رگ پھڑک اٹھتی تھی اور یہی رگ اس وقت جولیا اور میڈس کو دیکھ کر پھڑکی تھی۔ بارمیڈس نے میری بقیہ رقم میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"سب سے پہلے تو آپ یہ رکھ لیں جو میرے ذہن پر بوجھ بنا ہوا ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ اسے آپ اپنے پاس رکھیں اور اگر زیادہ ضرورت محسوس کرتی ہیں تو میری امانت سمجھ کر رکھیں۔"

"کیوں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"اس لئے کہ اس معمولی سی رقم کے عوض آپ کی قربت تو حاصل رہے گی اور آپ میرا تعارف اتنے اچھے اچھے لوگوں سے کراتی رہیں گی۔"

"بہت چالاک ہیں آپ۔ آپ نے میرا تو نام بھی نہیں پوچھا۔"

"میں خود اس بات پر حیرت کا اظہار کرنے والا تھا کہ آپ نے اپنا نام ابھی تک نہیں بتایا بلکہ ایک طرح سے میں شکایت بھی کرنے والا تھا۔" میں نے سلیقے کی گفتگو کرتے ہوئے کہا اور وہ ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔

"میرا نام رائینہ جولیس ہے۔"

"آپ سے مل کر تو ہمیشہ ہی خوشی ہوتی ہے مس رائینہ جولیس۔"

"شکریہ۔ ویسے ایک بات کہوں اگر آپ محسوس نہ کریں تو؟"

"جی فرمائیے؟"

"دراصل میں ہم لوگ تو دن رات ہی اس ہوٹل میں اپنی ڈیوٹیاں سرانجام دیتے ہیں اور جب فرصت ہوتی ہے تو ہماری سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ہم یہاں سے نکل بھاگیں۔ اگر اس کے بعد بھی ہمیں یہیں وقت گزارنا پڑے تو آپ یقین کریں بڑی ذہنی کوفت ہوتی ہے۔ کیوں نہ باہر نکلیں۔ بلکہ اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں آپ کی میزبان......"

"ارے نہیں رائینہ ڈیئر! چلو چلتے ہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔"

"جولیانا کے پاس اس کی اپنی کار موجود ہے۔ اسے آپ ہماری طرح نہ سمجھیں، نہ ہی اس کا تعلق اس ہوٹل سے ہے۔ یہ اپنا کاروبار کرتی ہے۔"

"واہ، چلیں پھر چلتے ہیں۔"

اور اس کے بعد میں ان دونوں لڑکیوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔ بس وہی فطرت کی بات کرتا ہوں کہ والد صاحب کی سرشت خون میں سرایت کر رہی تھی اور ان لوگوں کے درمیان وقت گزارنے میں لطف آ رہا تھا۔ خاص طور سے جولیانا کچھ ایسی شاندار شخصیت کی مالک تھی کہ دل اس کی جانب کھنچتا تھا۔ باہر نکلا تو حکمت سامنے سے آتا نظر آیا۔ میں نے کہا۔

"لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے"

حکمت نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "انسان بڑا خودغرض ہوتا ہے۔ اپنی کسی پسند پر وہ اپنے دوستوں کا ساتھ اسی طرح چھوڑ دیتا ہے۔ اوکے، میں انتظار کروں گا۔"

دونوں لڑکیاں ہماری گفتگو پر مسکرا رہی تھیں۔ جولیانا نے اپنی کار کا لاک کھولتے ہوئے کہا۔ "ویسے مسٹر برک بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں۔"

ہم کار میں بیٹھ گئے۔ رائینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ڈرائیونگ سیٹ میں سنبھال سکتی ہوں لیکن میں نہیں چاہتی کہ جولیانا مکمل طور پر آپ پر قبضہ جما لے مسٹر برک! ویسے ہمارے درمیان یہ مشترکہ معاہدہ ہو چکا ہے کہ آپ آدھے آدھے ہم دونوں میں تقسیم

جائیں گے۔"

"چلو، میں تو ختم ہوا۔"

"کیا مطلب؟"

"ظاہر ہے اگر آدھا آدھا تقسیم ہوا تو دو حصے ہو جائیں گے میرے۔"

جولیانا نے ہنستے ہوئے کار آگے بڑھا دی۔ رائینہ میرے برابر ہی بیٹھ گئی تھی۔ کار مختلف علاقوں میں گھومتی رہی اور ہم لوگ باتیں کرتے رہے۔ میرا ذہن ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم مضافاتی علاقے میں نکل آئے۔ میں نے جولیانا سے کہا۔

"کیا خیال ہے، ڈرائیونگ ہی کرتی رہیں گی میڈم؟"

"آپ ان علاقوں سے واقف نہیں ہیں۔ میں آپ کو سیگل لے جا رہی ہوں۔ مصنوعی سمندر جس کے کنارے چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ ان جھونپڑیوں میں اگر چوبیس گھنٹے گزار لئے جائیں تو پھر جنت کی خواہش نہیں رہے گی۔"

ہم تینوں ہنسنے لگے تھے۔ سیگل نامی علاقہ شہر سے کوئی ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی مثال آپ تھا۔ وہاں ایک ریزرٹ بنایا گیا تھا جس کے احاطے میں یہ مصنوعی سمندر لہریں لے رہا تھا۔ واقعی کمال کی جگہ بنائی گئی تھی۔ اور یہ جھونپڑیاں اور ان کے آس پاس نظر آنے والے خوش ذوق لوگ جنہوں نے دنیا کی ہر مشکل سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا اور کسی قسم کی تہذیبی قید سے آزاد آرام سے سرگشت کر رہے تھے۔ میں نے حیرت بھری نگاہوں سے ان بے لباس اور بے حجاب لوگوں کو دیکھا۔ بلاشبہ زندگی کا ایک دور اسی طرح کا ہوتا ہے کہ ایسے مناظر بڑی دلکشی کے حامل ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی خوبصورت جھونپڑی کے دروازے پر جولیانا نے کار روکی اور ہم تینوں نیچے اتر آئے۔

"یہ میری ہٹ ہے۔"

"اس کا مطلب ہے رائینہ، کہ جولیانا ایک دولت مند خاتون ہیں۔"

ہم تینوں ہنستے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ میں نے کہا۔ "لیکن جس طرح یہ لوگ گھوم پھر رہے ہیں کم از کم میں اس کا اہل نہیں ہو سکتا۔"

"ارے کیوں؟ یہ تو زندگی کی ایک بہت بڑی سچائی ہے۔" جولیانا نے کہا۔

"اتفاق کی بات یہ ہے کہ جس ماحول سے میرا تعلق ہے وہ ان باتوں کو قبول نہیں

کرتا۔"

"اوہ، کیا بات لے بیٹھے ڈیئر۔ جیسا دیس ویسا بھیس والی بات کہو نا۔"

"نہیں، مجھے ایک بھاگے ہوئے قیدی کی حیثیت دے کر اسی جھونپڑی میں قید رہنے دو۔"

"او کے، او کے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ چلو آؤ بیٹھو۔ کم از کم باہر کا نظارہ تو کر سکو گے۔" میں ہنس دیا۔ اب اس وقت میں پوری طرح ان دونوں لڑکیوں کے جال میں جکڑ چکا تھا اور میری اپنی سوچنے سمجھنے کی قوتیں پس پردہ جا سوئی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بے لباس تو میں کسی قیمت پر نہیں ہو سکتا تھا لیکن جہاں تک باہر کے نظاروں کا تعلق ہے بس ان سے گریز نہیں کر پایا تھا۔ دونوں لڑکیاں بڑی دلچسپ باتیں کر رہی تھیں۔ ان کی نگاہیں بھی باہر بھٹک رہی تھیں اور وہ نظر آنے والوں پر تبصرے کر رہی تھیں۔

دفعتہ ہی مجھے ایک عجیب و غریب جگہ نظر آئی اور میری نگاہیں ادھر جم کر رہ گئیں۔ وہ جگہ بڑی عجیب و غریب تھی۔ تھی تو وہ جھونپڑی ہی لیکن اس کا ڈیزائن بدھ پگوڈے کی طرح بنایا گیا تھا۔ چھوٹا سا خوبصورت پگوڈا جو دور سے بے حد حسین نظر آ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ذہن کے تار اس پگوڈے سے بندھ گئے ہوں۔ کچھ لمحوں کے لئے میں یہاں کے ماحول کو نظرانداز کر بیٹھا۔ پھر کس طرح اور کیا کہہ کر میں اس جھونپڑی سے باہر نکل آیا، اس کا مجھے بالکل علم نہیں تھا۔ بس ایک سحر سا میرے ذہن پر طاری تھا اور میرے قدم اس چھوٹے سے پگوڈے کی جانب بڑھ رہے تھے۔

جب میں اس دروازے کے قریب پہنچا تو دروازہ آہستہ سے کھلا اور میرے پاؤں اندر کی جانب چل پڑے۔ میں اندر داخل ہو گیا تھا۔ اندر چاروں طرف مدھم مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی، سامنے ہی بدھا کا مجسمہ نظر آ رہا تھا اور اس کے دائیں بائیں وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی آنکھیں بند کئے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ میں سحر زدہ سا مجسمے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور مجھے یوں لگا جیسے میرے چاروں طرف دھواں پھیلتا جا رہا ہو۔ میں اپنے آپ کو اس دھوئیں میں گم ہوتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ چمپا کی جانی پہچانی خوشبو میرے دل و دماغ کو معطر کئے ہوئے تھی۔ آہستہ آہستہ دھواں چھٹنا اور وردان سادھانی کی آواز ابھری۔

"جنم ستو..... بدھی نموستو..... نمو بدھی، نمو بدھی، نمو بدھی، بدھی مان! آپ کو بار بار

یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ مستقبل کے ہونے والے مہتر بدھ ہیں اور آپ کے لئے پاکیزگی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ بدھی ستو! یہ پاکیزگی آپ یوں سمجھ لیجئے آپ کے جیون کا سمدھان ہے۔ اور اگر آپ کا وجود یونہی ناپاکیوں میں ڈوبا رہا تو بدھ مت کی تاریخ بدل جائے گی۔ بڑا غلط ہو جائے گا بدھی ستو! آپ کو ایک بار پھر متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپ دنیا کی برائیاں چھوڑ دیں۔ یہ جو آپ کے راستے میں جگہ جگہ استھان آ جاتے ہیں یہ درحقیقت سچائیوں کی طرف آپ کے سفر کو روکتے ہیں اور سچائیوں کی طرف آپ کے سفر کا رکتا رہنا بہت بڑا نقصان ہے۔ کوئی نہ کوئی، کسی نہ کسی طرف سے پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ کو یہ اندازہ ہے کہ آنے والے سے آپ کو کتنا بڑا منصب سنبھالنا ہے۔ ہمارا دلائی لامہ ایک سو چودہ سال کا ہو چکا ہے اور وہ اس لئے زندہ رہے گا کہ آپ کو مہتر بدھ کا تاج پہنا دے۔ پر جیون کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہم جلد از جلد آپ کو آپ کے استھان پر لے چلتے ہیں بدھی ستو! ہمیں اس کا موقع دیجئے۔ آپ نے تو صحیح معنوں میں ابھی تک ایک بھی ایسا کام نہیں کیا ہے جو آپ کے راستوں کو کھولے۔"

میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن میری زبان جیسے بند ہو چکی تھی۔ میں نے کچھ لمحے خاموشی ہی اختیار کئے رکھی۔ پھر جیسے میری زبان پر سے تالا کھل گیا۔ میں نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں یہ سمجھ ہی نہیں سکا ہوں کہ مجھے آگے جا کر کیا کرنا ہے۔"

"بدھی ستو! آگے کی باتیں تو آگے چل کر ہی معلوم ہو سکتی ہیں۔"

"دوسری بات یہ ہے کہ میں نے ایک مسلمان گھرانے میں جنم لیا ہے۔ کیا میرے لئے اپنے دین دھرم کو بدلنا آسان کام ہو گا؟"

وردان سادھانی نے سیوک سندھورتی کو دیکھا اور سیوک سندھورتی کہنے لگا۔ "مہا بدھی ستو! کبھی کبھی جنم استھان غلط ہو جاتے ہیں۔ آپ کو گاشر برم میں مہان مندر کے بڑے مجسمے کی آغوش میں دیکھا گیا اور بدھی مان دھرم وستو تسلیم کر لیا گیا اور پھر ہر جگہ آپ کے ساتھ وہی پیش آیا جس کی توقع کی جاتی رہی ہے۔ ہاں، پرنتو آپ کو آپ کا استھان اس وقت نظر آئے گا جب آپ نیل سنگھاسن پر بیٹھیں گے۔ نیل سنگھاسن آپ کا سواگت کرنے کے لئے تیار ہے۔ پر آپ نے اپنے راستے لمبے کر لئے ہیں۔"

"سنو..... جو واقعات میری زندگی میں پیش آ رہے ہیں اگر میں ان سے گریز کروں تو میرا نظریہ ہی بدل جائے گا۔"

"مہان ستو! اصل میں آپ نے اپنے راستے پہچانے نہیں ہیں۔ ان راستوں پر بہت سی شاخیں نکلتی ہیں اور بہت سی قوتیں آپ کو ان راستوں پر بھٹکا رہی ہیں۔ آپ کو ایک سیدھا راستہ اختیار کرنا ہے۔ آپ کو بھوج پتر دیا گیا ہے، اس بھوج پتر پر آپ اپنے راستوں کو دیکھ سکتے تھے۔ لیکن آپ نے اسے اٹھا کر پھینک دیا۔ حالانکہ آپ اس کا تجربہ کر چکے ہیں کہ بھوج پتر پر جو کچھ ہوتا ہے بالکل سچ ہوتا ہے۔"

"تو پھر میں انتظار کروں گا کہ میرا ذہن تمہاری بتائی ہوئی سچائیوں کو قبول کرے۔"

"مہان ستو، آپ جتنا راستہ لمبا کرتے جائیں گے اتنے ہی آپ کے راستے کٹھن ہوتے چلے جائیں گے۔ آپ بالکل اس طرح نہ سوچیں، خود کو ستندر سردھان کے راستے پر لگا دیں۔ اور اگر آپ نے اپنا راستہ خود کھوٹا کیا تو بدھی ستو، وہ پریشانی بھی آپ کو اکیلے ہی اٹھانی پڑے گی جس کے چھوٹے چھوٹے نظارے آپ دیکھ چکے ہیں۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"وہ تختی جو آپ نے ہمیں دی ہے، آپ کو اس کا گیان حاصل کرنا ہوگا اور اس کے بعد آپ نیل سنگھاسن تک جا پہنچیں گے۔"

"میں نہیں جانتا کہ میں ایسا کبھی کر سکوں گا یا نہیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میرا دل یہ سب کچھ کرنے کو چاہتا بھی نہیں ہے۔ میں اپنی پسند اور اپنی مرضی سے جینا چاہتا ہوں۔"

"مہا بدھی ستو...... ایسی بات نہ کریں۔ سنسار کا توازن بگڑ جائے گا۔ وہ سب کچھ نہیں ہو پائے گا جو سوچا جاتا رہا ہے۔ ایسا نہ کیجئے مہان بدھی ستو، بڑی مشکل پیش آ جائے گی۔"

"بہرحال میں ابھی سوچنا چاہتا ہوں، غور کرنا چاہتا ہوں میں۔" میں نے کہا اور مجھے یوں لگا جیسے میری پلکیں آپس میں جڑتی جا رہی ہوں۔ ایک لمحے کے لئے مجھ پر نیند کا جھونکا طاری ہوا تو میرے کانوں میں بارمیڈس کی مترنم آواز ابھری۔

"یہ تو غلط ہے۔ اتنا حسین ماحول، ایسے دلکش نظارے اور آپ گم صم بیٹھے ہوئے ہیں۔"

میں نے چونک کر گردن جھٹکی، رائینہ اور جولیانہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں شدتِ حیرت سے آنکھیں پھاڑنے لگا اور میرے ہوش و حواس گم ہونے لگے۔ ابھی چند قدم پہلے تو اتنی دور چل کر گیا تھا اور میں نے اس پگوڈے میں وہ تمام مناظر دیکھے تھے

بے اختیار میری نگاہیں سامنے کی جانب اٹھ گئیں اور پھر میں بوکھلائے ہوئے انداز میں گردن گھمانے لگا۔ اس پگوڈے کا اب کہیں وجود نہیں تھا۔ بارمیڈس کسی قدر الجھی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی، پھر بولی۔ "لگتا ہے آپ ذہنی طور پر منتشر ہیں۔ جولیانا! تم نے اپنے مہمان کی کوئی خاطر نہیں کی۔"

میں کچھ اس طرح نڈھال ہو گیا تھا ان تمام حالات سے کہ میں نے اپنے آپ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ انہوں نے مجھے کیا پلایا اور میں نے ان کے ساتھ کیسے لمحات گزارے اس کے کچھ نقوش میری آنکھوں میں تو تھے لیکن صحیح طور پر اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب کیا ہوا ہے۔

بہرحال میں خاصا الجھ گیا تھا اور مجھ پر ایک شدید غنودگی سی سوار ہو گئی تھی۔ پھر نجانے کب ہوش آیا۔ لیکن جب ہوش آیا تھا تو جو منظر میری نگاہوں کے سامنے تھا وہ میرے ہوش و حواس چھین لینے کے لئے کافی تھا۔ ایک عجیب و غریب جگہ تھی اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ میں ایک برفانی علاقے میں تھا۔ میرے قرب و جوار میں برف میں نہائے ہوئے چیڑ کے درخت کھڑے ہوئے تھے اور میں ایک ایسے ہی درخت سے ٹیک لگائے اپنے دل و دماغ کو یکسو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بعض خواب بھی کیسے عجیب ہوتے ہیں۔ یہ خواب میری زندگی کا سب سے انوکھا خواب تھا۔ چیڑ کا کوئی جنگل معلوم ہوتا تھا پورے کا پورا۔ لیکن علاقہ ایسا تھا جہاں ہر طرف برف ہی برف نظر آ رہی تھی۔ سردی بھی اچھی خاصی تھی۔ میں نے اپنے سینے کو جکڑنے کے لئے دونوں ہاتھ اپنے جسم پر گھمائے تو مجھے یوں لگا جیسے میں انتہائی گرم اور قیمتی سوٹ پہنے ہوئے ہوں۔ زور زور سے آنکھیں جھٹکیں اور اپنے آپ پر غور کرنے لگا۔ میرے پیروں کے برابر ہی ایک سوٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی خواب نہ دیکھ رہا ہوں۔ ایک بار پھر میں نے آنکھیں بند کر کے یہ غور کیا کہ ابھی مجھ پر کیا گزر رہی تھی۔ بارمیڈس رائینہ اور جولیانا دونوں یاد آ گئیں اور وہ ہٹ بھی اور سامنے نظر آنے والا پگوڈا بھی۔ حکمت اور اس کے بعد ماضی کے بہت سے واقعات۔

دفعتہً ہی مجھے اپنے پیچھے کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دی اور میں گردن جھٹک کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ خونخوار کتے میری ہی جانب آ رہے تھے۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا، بہت سے لوگوں کی آوازیں ہی نہیں بلکہ شکلیں بھی نظر آئیں۔ وہ میری ہی طرف آ

رہے تھے اور ان کے جسموں پر فوجی وردیاں تھیں۔ یا الٰہی! یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ خواب ہے یا حقیقت؟ حقیقت کا تو خیر تصور ہی نہیں کر سکتا تھا لیکن خواب میں کیا اس طرح ہوش و حواس قائم رہ سکتے ہیں؟ کتوں کے پیچھے گھسٹ کر آنے والوں نے مجھ پر گنیں تان لیں اور پھر ان میں سے ایک شخص غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"برٹش جاسوس۔"

انہوں نے اپنی اپنی رائفلیں مجھ پر تان لیں اور میرا کلیجہ اچھل کر حلق میں آ گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کوئی خواب نہیں ہے بلکہ ایک انوکھی سچائی ہے۔ میرے ہاتھ خودبخود اوپر اٹھ گئے۔ فوجی افسر نے اپنی رائفل سے ایک سپاہی کو اشارہ کیا اور بولا۔

"اس کے سوٹ کیس کی تلاشی لو۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی بھی تلاشی لو۔"

سپاہی نے بڑے زور سے مجھے دھکا دیا اور چیڑ کے ایک درخت سے پشت لگا کر مجھے کھڑا ہونے کے لئے کہا۔ میں خاموشی سے ان حالات سے نمٹ رہا تھا۔ دل و دماغ کی جو حالت تھی اس کا اندازہ تو باآسانی کیا جا سکتا تھا۔ یہ انوکھی افتاد پڑی تھی۔ اور اگر خواب نہیں تھا تو سوچنے کی بہت سی باتیں موجود تھیں۔ میں یہاں تک کیسے آ گیا؟ یہ سب ہوا کیا ہے؟

میرے پورے بدن کی تلاشی لی گئی اور اس کے ساتھ ہی سوٹ کیس کی بھی۔ لیکن ان کے رویے میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"مگر تم اس طرح جرمنی میں کیوں داخل ہوئے ہو؟" مجھ سے سوال کیا گیا اور میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ج...... ج...... جرمنی؟" بمشکل تمام میرے منہ سے نکلا۔ سامنے کھڑے ہوئے افسر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم انگریز جاسوس ہو۔ برٹش نیوی سے تمہارا تعلق ہے اور تم جاسوسی کے لئے یہ سرحد عبور کر کے اندر داخل ہوئے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو جرمن بیوقوف ہیں؟ یہ بھی معلوم ہو چکا ہے ہمیں کہ تم ہندوستانی ہو اور تمہارا نام خاقان جمشیدی ہے۔ بولو، کیا ہم غلط کہہ رہے ہیں؟"

مجھ پر جو کچھ بیت رہی تھی وہ تو میں ہی جانتا تھا۔ ان لوگوں کا چہرہ دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ انتہائی وحشی قسم کے لوگ ہیں۔ لیکن اس قدر معلومات کے ساتھ مجھے برٹش نیوی

کے ایک رکن کی حیثیت سے جو مخاطب کیا جا رہا تھا وہ میرے لئے موت کے نشان کی مانند تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اب میرے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ میں نے اگر ان سرپھرے فوجیوں سے بحث کرنے کی کوشش کی تو یہ مجھے کتے کی موت مار دیں گے۔ بہرحال اب صورتحال بڑی سنگین ہو گئی تھی۔ وہ لوگ مجھ سے میرے کاغذات کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ لیکن ظاہر ہے نہ یہ سوٹ کیس میرا تھا نہ میرے لباس میں ایسا کوئی کاغذ تھا۔ اب انہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میرا نام خاقان جمشیدی ہے، یہ ایک الگ بات ہے۔

بہرحال وہ مجھے وہاں سے آگے لے گئے۔ تھوڑے فاصلے پر چوکی بنی ہوئی تھی اور یہاں عارضی طور پر مجھے ایک کمرے میں قید کر دیا گیا۔ کمرہ کیا تھا بس ایک چھوٹا سا کیبن بنا ہوا تھا۔ لکڑی کی ننگی دیواریں، زمین سے اونچا فرش۔ بیرک نما جگہ تھی۔ وہ لوگ مجھے بند کر کے چلے گئے تو میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس افتاد کے بارے میں نئے سرے سے غور کرنے لگا۔ وہ دونوں لڑکیاں یعنی جولیانا اور رائینہ عام سے حالات میں مجھے ملی تھیں۔ حکمت کا مسئلہ بھی اسی طرح کا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ ہوا کیا تھا؟ کیوں ایسا ہو گیا تھا؟ اور میں کس جال میں پھنس گیا تھا؟

وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی نجانے کیا کیا چکر چلائے ہوئے تھے۔ اب تو دماغ کی چولیں بھی ہل گئی تھیں اور عقل ساتھ دینا چھوڑ چکی تھی۔ البتہ بہت سے دوسرے ایسے خیالات دل میں آ رہے تھے جو پریشان کن تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ لوگ مجھے بدھ مت کے ایک اوتار کا درجہ دینا چاہتے تھے لیکن ابھی تک میں انہی کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا۔ بذاتِ خود مجھے کوئی ایسی طاقت نہیں دی گئی تھی جس سے میں اپنے طور پر بھی کم از کم اور کچھ نہیں تو اپنی بچت ہی کر سکتا۔ کتنی ہی بار ایسے خطرناک ترین حالات سے واسطہ پڑا تھا۔ ہشمان ذکری کی اس حویلی میں جہاں پلے ہوئے چیتے موجود تھے اور جہاں بیچاری اینہ ملی تھی، میری زندگی لمحہ لمحہ موت سے ہمکنار رہی تھی۔ بس وقت اور حالات اور میری جدوجہد نے ہی مجھے بچایا تھا ورنہ نہ میری مدد وردان سادھانی نے کی نہ سیوک سندھورتی نے۔ کوئی ایسی قوت مجھے حاصل نہیں تھی جس سے میں خود بھی اپنے طور پر کوئی عمل کر سکتا۔ کہاں ہو تم دونوں، اب بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ بڑا دیوتا بنائے ہوئے تھے مجھے۔ مہتر بدھ، بدھی ستو اور نجانے کیا کیا۔ اب یہاں اس طرح ان دنیا داروں کے عتاب کا

شکار ہو کر پڑا ہوا ہوں اور آنے والے وقت میں نجانے میرے ساتھ کیا ہوگا۔ بہر حال کسی رعایت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

کچھ دیر کے بعد مجھے پھر اس جگہ سے نکالا گیا اور اس بار مجھے اعلیٰ افسروں کی ایک جماعت کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان کم بختوں نے مختلف قسم کے سوالات کر کر کے میری ناک میں دم کر دیا۔ لیکن ظاہر ہے میں انہیں اور کیا بتاتا۔ البتہ ایک اور نئی چیز کے بارے میں بتایا گیا، وہ یہ کہ انہوں نے مجھے میری کچھ تصویریں بھی دکھائی تھیں اور ان تصویروں میں، میں برٹش نیوی کی وردی میں ملبوس تھا۔ میری حیرت آخری حدود کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہ تصویریں اس وقت کی تھیں جب میں جہاز پر اپنے دوست کے پاس چھپا ہوا تھا اور اس نے مجھے بحریہ کی وردی فراہم کی تھی۔ کئی تصویروں میں برٹش نیوی کا وہ جہاز بھی نظر آ رہا تھا اور اس کا نام بھی۔ گویا کسی طرح کا شبہ نہیں تھا۔

بہر حال یہ لوگ مجھ سے معلومات حاصل کرتے رہے۔ میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ پھر انہوں نے مجھے ایک کوٹھڑی کے اندر بند کر دیا۔ یہ وہ کمرہ نہیں تھا جہاں پہلے مجھے بند کیا گیا تھا بلکہ ایک دوسری جگہ تھی جہاں صرف ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ میں نجانے کب تک اس چارپائی پر پڑا اپنی تقدیر کو کوستا رہا۔

صبح نو بجے ایک سپاہی اندر آیا اور مجھے اپنے ساتھ چوکی میں ایک بڑے کمرے میں لے گیا جہاں ایک میجر اور ایک کیپٹن میرا بیان لینے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی ایک عورت بھی تھی جو میرے لئے اجنبی تھی۔ میجر نے مجھے خونخوار نظروں سے دیکھا اور میز کی دراز سے میرا پاسپورٹ نکال کر اس پر لگی تصویر سے مجھے شناخت کیا پھر اس نے کہا۔

''ہوں...... تم اس علاقے میں آنے کی وجہ بتاؤ؟''

''آپ یقین کیجئے، مجھے بے ہوشی کے عالم میں یہاں پہنچایا گیا ہے۔''

''بیوقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔ ہم جانتے ہیں کہ تم برٹش ایجنٹ ہو۔ کسی خاص مقصد کے تحت جرمنی کے اس علاقے میں داخل ہوئے ہو۔ یہ دیکھو۔'' اس نے ایک نقشہ نکال کر میرے سامنے پھیلا دیا اور میں نقشے پر جھک گیا۔ پھر میں نے خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ بولا۔ ''یہ تمہارے سوٹ کیس سے برآمد ہوا ہے۔''

''مم...... میرے سوٹ کیس سے؟'' میں نے شدید حیرت کے عالم میں کہا۔

''ایکٹنگ مت کرو۔ ہم اتنے نادان نہیں ہیں کہ تمہاری اس چالبازی کو نہ سمجھیں۔

میں بہت جلد یہ ثابت کر دوں گا کہ تم برطانوی سیکرٹ سروس کے آدمی ہو۔ کیا سمجھے؟ اور اب تمہیں ہمارے سوالات کے جوابات دینا ہوں گے۔''

میں کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کر لیا۔ اب حماقت کی دنیا سے نکل کر عقل سے کام لینا چاہئے ورنہ یہاں کھال اتر جائے گی اور کوئی کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''اگر آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں تو پوچھئے جناب۔''

''گڈ...... یہ ہوئی نا بات۔ اچھا یہ بتاؤ کہ جرمنی میں برطانیہ کے خفیہ فوجی اڈے کہاں کہاں قائم ہیں اور ان کی پوزیشن کیا ہے؟''

''برطانیہ کا سب سے بڑا فوجی اڈا ہنیور میں ہے جہاں ٹینک ڈویژن موجود ہے۔''

''ہوں...... بولے جاؤ۔''

کلکتہ میں، میں نے اپنے برطانوی دوستوں سے اور کچھ ایسے لوگوں سے جو میرے ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے ان جگہوں کے بارے میں تفصیل وغیرہ سنی تھی اور وہ میرے ذہن میں موجود تھی۔ میں نے اسی کے مطابق فضول بکواس شروع کر دی۔ لیکن میری اس بکواس سے جرمن میجر بہت متاثر ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''ویری گڈ...... اب تم مجھے اپنی ملٹری سروس کے بارے میں بتاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تمہاری اطلاع درست پائی گئی تو ہم تمہیں رہا کر دیں گے۔''

''آپ یقین کریں جناب! کہ میں نے اب تک آپ کو جو معلومات دی ہیں، انہی کی بنیاد پر مجھے وطن واپس پہنچتے ہی شوٹ کر دیا جائے گا۔''

''گھبراؤ مت، ہم تمہارا بیان خفیہ رکھیں گے اور تمہاری حکومت کو تمہارے اس بیان کے متعلق بالکل نہیں پتہ چل سکے گا۔ تم پورے اطمینان سے ساری بات بتا دو۔ بتاؤ، تم برطانوی فوج میں کیا کام کرتے ہو؟''

''میرا کام دہشت پسند گروہ کے ساتھ مل کر تخریبی کام کرنا ہے۔ ٹرینوں کو بم سے اڑانا، ہوائی جہاز تباہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔''

''ہوں، مجھے پہلے ہی شبہ تھا، تمہارا کیس معمولی نوعیت کا نہیں ہے۔ تمہیں اب اعلیٰ حکام کے سامنے بیان دینا ہوگا۔'' اس نے قلم اٹھایا اور کاغذ پر تیزی سے کچھ لکھنے لگا۔ اس کے بعد مجھے ایک گارڈ کے حوالے کر دیا گیا جو مجھے اسی کوٹھڑی میں لے گیا۔ اس نے

مجھے بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔

دوسرے روز ایک اردلی کے سوا جو میرے لئے کھانا لایا تھا میں نے کسی اور کو نہیں دیکھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب نجانے میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ بہر حال بڑی سنگین صورتحال ہوگئی تھی اس بار۔ جس نے بھی میرے ساتھ یہ سلوک کیا تھا وہ بہت ہی ذہین اور طاقتور آدمی تھا۔ خدا کی پناہ...... خدا کی پناہ۔ اب کیا ہوگا؟ اب تو یہاں بچنے کی کوئی امید نہیں رہی ہے۔

رات آہستہ آہستہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ میں اسی چارپائی پر دراز تھا کہ کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور ایک لیفٹیننٹ اندر آیا اور مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ رات کے مہیب سناٹے میں سرحدی چوکی کے باہر ایک جیپ کھڑی تھی جس میں ڈرائیور کے علاوہ دو مسلح سپاہی بھی تھے۔ لیفٹیننٹ نے مجھے جیپ میں بٹھایا اور میرے قریب بیٹھ گیا اور آخر کار ہم ایک نامعلوم منزل کی جانب چل پڑے۔ تھوڑا فاصلہ طے ہوا تو میں نے کہا۔

"جناب! مجھے اس وقت کہاں لے جایا جا رہا ہے؟"

"بکواس بند کرو خاموش بیٹھے ہو۔ بولنے کی اجازت نہیں ہے۔" لیفٹیننٹ نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور میں خاموش ہوگیا۔ دو گھنٹے تک جیپ ایک سنسان اور تنگ سڑک پر دوڑتی رہی جس کے دونوں طرف تاریک جنگل تھا۔ ٹھیک دو بجے ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں ایک بڑی سی عمارت کے صدر دروازے پر جیپ روکی گئی۔ یہ عمارت اپنے حلیے سے جیل خانہ معلوم ہوتی تھی۔ لیفٹیننٹ مجھے لے کر جیلر کے پاس پہنچ گیا۔ جیلر تھا یا جو اور وہ مجھے اپنے ساتھ لئے ہوئے عمارت کے اندر داخل ہوگیا جہاں بہت سی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک کوٹھڑی کے سامنے وہ رکا اور اس نے آہنی دروازہ کھولا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے دھکا دیتا میں خود ہی کوٹھڑی میں چلا گیا۔ اتنا گہرا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ جیلر جب دروازہ بند کر کے چلا گیا تو میں نے ٹٹول کر دیکھا، وہاں کوئی چارپائی وغیرہ نہیں تھی، فرش پر صرف ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں چھوٹی سی ٹیبل پڑی ہوئی تھی اور ایک دوسرے گوشے میں ایک لوہے کا گندا سا کموڈ پڑا ہوا تھا جس سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ دروازے کے علاوہ اس کمرے میں دو فٹ اونچی اور دو فٹ چوڑی ایک کھڑکی تھی جس میں لوہے کی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

میں نے چٹائی کو کموڈ سے دور گھسیٹ کر اس پر اپنا کوٹ بچھایا اور ٹانگیں سکوڑ کر سونے

کی کوشش کرنے لگا۔ اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ اس جیل خانے کے اندر میرے علاوہ اور بھی بہت سے قیدی جمع ہیں جن کی کوٹھڑیوں سے مختلف آوازیں میرے کانوں میں پہنچ رہی تھیں اور کچھ اس طرح کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

معبود کریم! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بہت سے گناہ کئے ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ ان گناہوں میں سو فیصدی میرا ہاتھ نہیں تھا۔ فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر جب آنکھ کھلی تو دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ اگرچہ میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی اور میں کچھ دیر اور سونا چاہتا تھا لیکن ایک آواز نے زور سے کہا۔

"چھ بج گئے ہیں۔ سات بجے تک ناشتہ ملے گا۔ تیار ہو جاؤ۔"

بہر حال مجھے تیار ہونا تھا۔ ناشتے کا اہتمام ایک سارجنٹ کے سپرد تھا۔ بے پناہ لمبا تڑنگا اور قوی ہیکل تھا۔ ٹھیک سات بجے ناشتہ آ گیا۔ ایک بھدے سے چینی کے پیالے میں گرم گرم قہوہ اور ابلے ہوئے نمکین چاول دروازے میں سے ایک سپاہی نے مجھے تھمائے تھے۔ میں نے عجیب سے انداز میں ان چیزوں کو دیکھا۔ ماضی کی ایک لہر میرے ذہن سے گزر گئی اور میں یہ سوچنے لگا کہ وقت کیسی کیسی کہانیاں تحریر کرتا ہے۔ بظاہر تو اس وقت میں جس جنجال میں پھنسا ہوا تھا اس سے نکلنے کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میری زندگی بدترین حالات سے دوچار ہوئی تھی۔ کیا کرنا چاہئے۔ آخر کیا کرنا چاہئے؟ اور میرا ذہن فضاؤں میں تحلیل ہونے لگا۔

☆

ایک پراسرار سا تصور، ایک انوکھا خیال میرے دل و دماغ میں سرایت کرنے لگا۔ اس وقت کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ نہ زردان سادھانی، نہ سیوک سندھورتی نہ کوئی اور۔ گاشر برم میں جو آوازیں میرے کانوں تک پہنچائی گئی تھیں اور جس طرح انہوں نے مجھے اپنا دیوتا بنانے کی کوشش کی تھی اور میرے راستوں میں آنکھیں بچھائی تھیں، کہاں چلے گئے وہ سارے کے سارے؟ اور کلاڈیا جس نے مجھے بڑی انوکھی تلقین کی تھی اور جو صحیح معنوں میں سب سے زیادہ پراسرار کردار تھی، آخر کس طرح غائب ہو گئے یہ لوگ؟

میں چٹائی پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اندر ہی اندر میں اپنے ان مددگاروں کو یاد کر رہا تھا اور نجانے کیا کیا الفاظ میری زبان سے نکل رہے تھے۔

پھر ٹھیک دو بجے میرا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ وہی لمبا تڑنگا سارجنٹ دروازہ کھول رہا تھا۔ اس نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا اور پھر ایک وسیع و عریض کمرے میں لے گیا۔ یہاں کئی نوجوان لڑکیاں پانی کے ٹب میں قیدیوں کے کپڑے دھو رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ کمرہ بیک وقت غسل خانہ اور باورچی خانہ ہے۔ سارجنٹ نے الماری سے ریزر اور آئینہ نکال کر میرے سامنے کیا اور لڑکیوں سے کہا۔

"اس کے لئے نہانے کا بندوبست کر دو۔"

یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کیا اور چلا گیا۔ لڑکیاں حیرت سے مجھے دیکھتی رہی تھیں۔ میں ان کی قومیت کے بارے میں صحیح طرح اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ کون ہیں، جرمن ہیں یا فرنچ ہیں یا برٹش وغیرہ۔ لیکن پھر ان میں سے ایک نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔

"تم نے کیا جرم کیا ہے؟"

"بس کوئی جرم نہیں کیا۔ میں انڈین ہوں اور یہ لوگ مجھے جاسوسی کے الزام میں پکڑ کر لائے ہیں۔"

لڑکیوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ مجھے بے حد خوفزدہ محسوس ہوئی تھیں۔

اس کے بعد میں نے ان سے بہت سے سوالات کئے لیکن ان میں سے کسی نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ انہوں نے میرے لئے ایک ٹب میں پانی بھرا اور صابن دے کر اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی طرف چور نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں اور کافی خوفزدہ ہیں۔

میں نے جلدی جلدی شیو بنائی اور غسل سے فارغ ہو کر کپڑے پہن لئے۔ سارجنٹ ہاتھ میں رائفل لے کر نمودار ہوا اور مجھے کوٹھڑی میں لے گیا۔ میرا خیال تھا یہ لوگ پھر مجھ سے معلومات حاصل کریں گے۔ لیکن پورا دن، رات اور تقریباً اسی طرح آٹھ دن گزر گئے۔ اب یہ قید تنہائی مجھے ناقابل برداشت عذاب کی مانند لگ رہی تھی۔ پینے کے لئے وہی قہوہ اور کھانے کے لئے نمکین اُبلے ہوئے چاولوں کے علاوہ مجھے کچھ نہ دیا گیا۔ ایک بار میں نے ان سے شکایت بھی کی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

نویں روز چار بجے مجھے پھر کوٹھڑی سے نکال کر کمرے میں لے جایا گیا جہاں ایک فوجی افسر میرا منتظر تھا۔ گفتگو کا آغاز ہوا۔

"ہاں، تو تم کو اپنے بارے میں کچھ اور کہنا ہے؟ دیکھو جتنی جلدی تم حقیقتیں اُگل دو گے اتنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ ہم نے ابھی تک تم پر تشدد نہیں کیا لیکن تم ہمیں مجبور کر رہے ہو۔"

"میں نے جو کچھ بتایا اس سے زیادہ میں کچھ جانتا بھی نہیں ہوں۔"

"سوچ لو۔"

"سوچنا تو آپ کو ہے جناب۔ میں تو آپ کا قیدی ہوں۔" میں نے کہا اور وہ کچھ دیر تک ٹیلی فون پر کسی سے بات کرتا رہا اور اس کے بعد اس نے گھنٹی بجا کر اسی سارجنٹ کو بلایا اور سارجنٹ نے مجھے پھر کمرے میں پہنچا دیا۔ مزید دس روز تک میں اسی کوٹھڑی میں بند رہا۔ اب مجھے شدید نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ گیارہویں دن مجھے پھر اسی افسر کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ مجھ سے سوالات کرنے لگا جن کا میں نے وہی جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، تم یوں نہیں مانو گے۔ لیکن ہم تمہیں مجبور کر دیں گے کہ تم ہمیں مزید اور کچھ بتانے پر مجبور ہو جاؤ۔ کیا سمجھے؟"

"میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہو۔"

"وہ سب کچھ جس کے لئے تم یہاں آئے تھے۔ تمہارے پاس سے ان علاقوں کے

نقشے دریافت ہوئے تھے۔"

"یقین کرو وہ سوٹ کیس ہی میرا نہیں تھا جو تمہیں ملا۔ میں اسکندریہ میں تھا اور
کے بعد اسمگلروں کا ایک گروہ مجھے اپنے جال میں پھانس کر نیپلز لے آیا اور نیپلز سے
نجانے کس طریقے سے یہاں تک پہنچا دیا گیا۔"

"بالکل بکواس...... تمہارے کاغذات، تمہارا پاسپورٹ، تمہاری بحریہ کی وردی
بات تو طے ہے کہ تم انڈین ہو۔ تم نے کلکتہ میں تعلیم حاصل کی ہے۔"

"آہ...... تب تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو جانا چاہئے کہ میں ایک پراسرار الجھن میں
ہوا ہوں۔ کیا تمہیں یہ معلوم ہے گاشر برم کے بدھ مجھے اپنا دیوتا بنانا چاہتے ہیں۔"

جواب میں وہ شخص ہنس پڑا اور بولا۔ "اب تم پاگل بننے کی کوشش کر رہے ہو۔
اب ہم تمہیں ایک ایسے جیل خانے میں بھیج رہے ہیں جہاں جاسوسوں کو ہلاک کرنے
سوا وہ ہر ممکن اذیت دی جا سکتی ہے جس کا تصور انسانی ذہن میں آ سکتا ہے۔ کیا سمجھے

"تمہارا جو دل چاہے کرو۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ اب مجھے احساس ہوا تھا کہ
تک بلاوجہ وقت ضائع کیا ہے۔ صحیح معنوں میں، میں ایک ناکام انسان تھا۔ ماں
نے مجھے نجانے کس مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔ اگر میرے والد شکاری نہ ہوتے اور
طرح مجھے اس بدھ مندر تک نہ لے جاتے جہاں میں مجسمے کی آغوش میں جا بیٹھا تھا
سب کچھ نہ ہوتا۔ تعلیم حاصل کرتا اور کسی اچھے عہدے پر کام کر رہا ہوتا۔ سب کچھ چو
ہو گیا تھا۔ کلکتے میں مجھے بدمعاش ہیگ ملا تھا جس نے میری زندگی کا جغرافیہ ہی پلٹ
تھا۔ ویسے میری زندگی کا جغرافیہ پلٹنے والے تو بہت سے لوگ تھے مگر اب سب کے
پیچھے ہٹ گئے تھے۔ گویا مجھے امتحان کی ایک دنیا میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ ٹھیک ہے دوستو
میرا امتحان لے لو اور اس کے بعد فیصلہ کرنا میرا کام ہو گا کہ اب مجھے آگے کیا کرنا چا
اس وقت اگر کوئی قوت میری مدد کر سکتی ہے تو میں اس سے مدد مانگتا ہوں۔ لیکن اس
بعد اگر کسی بھی پراسرار قوت نے مجھے اپنا پیروکار بنانے کی کوشش کی تو خدا کی قسم میں
فریب کروں گا صرف فریب۔ اور اگر یہیں اسی جگہ موت لکھی ہوئی ہے تو یہ بھی سہی۔

دفعتہً ہی مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ میں نے خدا کی قسم کھائی تھی۔ اس کا مط
ہے کہ میں اپنے اندر ایک استحکام رکھتا ہوں۔ خدا میرا اول و آخر ہے۔ پراسرار قوتیں
کسی بھی راستے پر لے جائیں، میں اپنی حیثیت میں اٹل ہوں۔ یعنی وہ حیثیت جو

ابتداء ہے۔

وہی گڈ...... ایک عجیب سا اعتماد، ایک عجیب سا احساس میرے دل میں پیدا ہوا اور
نجانے کیوں ہلکی سی سکون کی سی کیفیت محسوس ہوئی۔ لیکن عارضی۔ کیونکہ اس کے بعد مجھے
جس قید خانے میں پہنچایا گیا تھا وہ واقعی ایک ہولناک جگہ تھی۔ قید خانے کے منتظم نے
سب سے پہلے میرے کپڑے اتروا کر میری تلاشی لی اور مطمئن ہو کر مجھے قید خانے کی
کوٹھڑی میں بھیج دیا گیا۔ یہ کوٹھڑی پچھلی کوٹھڑیوں کی نسبت کچھ کشادہ تھی اور یہاں
چارپائی پر ایک نرم گدا بھی پڑا ہوا تھا۔ دروازے میں چھوٹا سا بلب لگا ہوا تھا جو ہر وقت
جلتا رہتا تھا۔

کوٹھڑی میں داخل ہو کر میں بستر پر لیٹا اور بے خبر سو گیا۔ اب میں اپنے آپ کو حالات
سے بے پرواہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک فوجی نے مجھے آ کر جھنجھوڑا۔
تھکن، جھنجھلاہٹ اور نیند کے باعث میں اس وقت اپنے آپے میں نہیں تھا۔ بہرحال یہ
یاد تھا کہ قید خانے میں ہوں۔ چنانچہ ایک چلتی پھرتی لاش کی طرح میں اس سپاہی کے
ساتھ لڑکھڑاتا اور ڈگمگاتا ہوا چل پڑا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا جہاں ایک میز کے
پیچھے چار فوجی افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے پہنچتے ہی انہوں نے مجھ سے میرے بارے
میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ مجھ پر نیند اور تھکن غالب تھی لیکن میں جانتا تھا
کہ ان کے لئے مجھ پر تشدد کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہو گا۔ ایک افسر اعلیٰ نے کہا۔

"اپنے بارے میں، اپنے باپ کے بارے میں، اپنے بچپن اور بچپن سے اب تک
تمام تفصیل رُکے بغیر بتاتے چلے جاؤ۔ اور خبردار، رُکنے کی کوشش مت کرنا۔"

میں اپنے بچپن اور ماضی کے بارے میں نجانے کیسی کیسی باتیں سوچنے لگا۔ لیکن
بہرحال ان کا اظہار ان لوگوں کے سامنے نہیں کر سکتا تھا۔ دماغ پر قابو بھی مشکل ہو رہا
تھا۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ میں نجانے کیا کیا بکواس کرتا رہا تھا ان سے۔ یہاں تک کہ
میرا سر چکرانے لگا۔ میں کھڑے کھڑے تھک گیا اور جب ٹانگیں کانپنے لگیں تو میں فرش پر
بیٹھ گیا۔ مجھے کمرا گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا کیونکہ نجانے کتنے گھنٹوں تک یہ بدبخت مجھ
سے سوالات کرتے رہے تھے۔ اور جب انہوں نے دیکھا کہ میں بولنے پر بھی قادر نہیں
رہا تو دو سپاہیوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ اور پھر کوٹھڑی
میں لا کر پھینک گئے۔ نجانے کتنی دیر مجھ پر غنودگی کی سی کیفیت طاری رہی تھی کہ دروازہ

پھر کھلا اور ایک سپاہی نے آ کر مجھے اٹھانا چاہا۔ لیکن نقاہت کی وجہ سے میں حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔

"آہ..... میں ٹھیک نہیں ہوں۔ میری کیفیت بہت خراب ہے۔ میں اٹھ بھی نہیں سکتا۔"

"کتے کے بچے! بہت زیادہ نخرے مت کرو۔ اٹھو، تمہیں ڈیوٹی آفیسر بلا رہا ہے۔"

دفعتہً ہی میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس وقت مجھ میں قوت کی لہر کہاں سے آ گئی تھی کہ میں نے لیٹے ہی لیٹے سپاہی کے دونوں پاؤں پکڑ کر اسے نیچے گرا دیا اور پھر اس پر اندھا دھند گھونسوں کی بارش کر دی۔ سپاہی پہلے تو ششدر رہ گیا تھا لیکن جب میرے گھونسے اس کے جبڑوں پر پڑے تو اس نے اپنی مدافعت کے لئے میرا گلا دبانے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی اونچی آواز میں دوسرے سپاہیوں کو پکارنے لگا۔ اسی اثناء میں، میں نے اسے خوب پیٹ لیا تھا۔ آخر کار وہ بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے جلدی سے دروازے میں تالا لگایا اور دیوانوں کی طرح چیختا ہوا دوسری منزل کی سیڑھیوں کی طرف لپکا اور پھر دو ہی منٹ کے بعد میں نے لکڑی کی سیڑھیوں پر بہت سے قدموں کی آوازیں سنیں۔ وہی سارجنٹ اور اس کے ساتھ کئی سپاہی اور گارڈ جن میں وہ سپاہی بھی شامل تھا جس کی میں نے مرمت کی نمودار ہو گئے اور ایک لمحے کے اندر اندر صورتحال میرے ذہن میں واضح ہو گئی۔ وہ حشر کریں گے یہ لوگ میرا کہ مزا آ جائے گا۔ چنانچہ میں نے پاگل بن جانا ہی بہتر سمجھا۔ انہیں دیکھتے ہی میں نے حلق پھاڑ پھاڑ کر گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ اپنے سر کے بال نوچ ڈالے۔ جیکٹ اتار کر پھینکی، انگلیاں دانتوں سے کاٹیں اور دیواروں سے سر ٹکرانے لگا۔ یہ ترکیب بہت ثابت ہوئی۔ وہ میری ان وحشیانہ حرکتوں کو دیکھتے رہے۔ جب میں نے دیکھا کہ سارجنٹ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہا ہے تو میں نے ایک خوفناک نعرہ لگایا اور اس کی جانب لپکا۔ وہ گھبرا کر پیچھے مڑا اور سپاہیوں سے کچھ کہنے لگا۔ ان سب نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ سب کے سب وہاں سے چلے گئے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ میری یہ تدبیر کارگر ہوئی ورنہ وہ مار مار کر میرا بھرتا بنا دیتے۔

تیسرے دن البتہ میں نے اپنے آپ کو پُرسکون ظاہر کیا تھا۔ پہلے انہوں نے مجھے تنگ کیا اور یہ دیکھنا چاہا کہ میں مستقل پاگل تو نہیں ہو گیا ہوں۔ لیکن میں نے ایک لمحے کے لئے خاموشی اختیار کر لی۔ البتہ دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ پاگل بنا رہوں گا۔ اور اس

کے بعد میں پھر شروع ہو گیا۔ دوسرے افسران میری حرکات کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں واقعی پاگل ہو گیا ہوں یا صرف اداکاری کر رہا ہوں۔ لیکن یہی وقت ایسا تھا اور ویسے بھی سچی بات یہ ہے کہ ان حالات نے مجھے پاگل ہی کر دیا تھا۔ جس قدر ہنگامہ آرائی کر سکتا تھا، میں نے کی اور وہ لوگ مجھے بند کر کے چلے گئے۔ اس کے بعد پھر چھ دن اسی طرح گزر گئے۔

ساتویں دن مجھے کوٹھڑی سے نکالا گیا، میری بھرپور تلاشی لی گئی، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنائی گئیں، آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی گئی اور اس کے بعد جیل خانے سے باہر جا کر ایک جیپ میں بٹھا دیا گیا جو نہایت تیز رفتاری سے ایک نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔ جیپ تیزی سے جا رہی تھی۔ راستے میں کوئی موڑ نہیں آیا جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ سفر بہت لمبا ہے۔ انجن کی پُرشور آواز گہرے سناٹے کو چیرتی ہوئی مسلسل آگے بڑھ رہی تھی۔ جیپ میں نجانے میرے ساتھ کون کون بیٹھا ہوا تھا۔ گاڑی میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ میری آنکھوں پر سیاہ کپڑے کی پٹی سختی سے بندھی ہوئی تھی اور ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ذہن اس وقت سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل محروم تھا اور معمول کے مطابق نجانے کیسے کیسے الٹے سیدھے خیالات ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

تقریباً چار گھنٹے کے بعد یہ اکتا دینے والا سفر ختم ہوا۔ راستے میں صرف دو جگہ موڑ آئے تھے اور جیپ جس رفتار سے چل رہی تھی اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ہم نے ڈیڑھ دو سو میل کا فاصلہ طے کر لیا ہے۔ بہرحال اس کے بعد جیپ رکی اور مجھے جیپ سے اتار کر کافی دور تک پیدل لے جایا گیا۔ جب میری آنکھوں سے پٹی کھلی تو میں نے اپنے آپ کو ملگجے اجالے میں گھری ہوئی ایک عظیم الشان عمارت کے صدر دروازے پر کھڑے ہوئے پایا۔ بہرحال یہ کوئی آبادی تھی۔ غالباً کوئی شہر۔ مجھے دروازے کے بائیں جانب چھوٹے سے کمرے میں لے جایا گیا اور اس کے بعد میرے ہاتھ بھی کھول دیئے گئے۔ چند افراد وہاں موجود تھے اور وہ مجھے بغور دیکھ رہے تھے۔ اس وقت میری جو حالت ہو رہی تھی وہ قابل رحم تھی۔

مجھے ایک بینچ پر بٹھا دیا گیا۔ پھر چند لمحوں کے بعد ایک اندرونی دروازے سے ایک شخص باہر نکلا اور اسے دیکھ کر میرے دماغ میں ایسا دھماکا ہوا کہ میری آنکھیں ہی بند ہو گئیں...... اور دماغ میں جیسے بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ میں نے آنکھیں بھینچ کر گردن جھکا

لی تھی اور دیر تک گم صم بیٹھا رہا تھا۔ جو چہرہ میں نے دیکھا تھا، آہ...... آنے والے شخص کا چہرہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ لیکن کوئی وقت ایسا بھی آئے گا جب وہ ایک کامیاب حکمران کی حیثیت اختیار کر جائے گا اور میں ایک مصیبت زدہ انسان قرار پاؤں گا۔ جو کچھ میں نے دیکھا ہے اگر وہ سچ ہے تو میری مصیبتوں کے بادل اور گہرے ہو گئے ہیں۔ میری تقدیر میں روشنی کی کوئی کرن نہیں رہی ہے۔ آخر کار وہ منحوس آواز میرے کانوں میں اُبھری جسے میں بہت سی بار سن چکا تھا۔

"خاقان جمشیدی، میری جان! آنکھیں کھولو۔ تم اتنے کچے انسان نہیں ہو جتنا اپنے آپ کو ظاہر کر رہے ہو یا واقعی اپنی وہ قوتیں کھو چکے ہو جو تمہیں ممتاز کرتی تھیں۔ خاقان! میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں میرے دوست! سنبھالو خود کو اور مجھ سے گفتگو کرو۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اس واقعی کامیاب شخص کو دیکھنے لگا جس کا نام ہیگ تھا۔ میرا بدترین دشمن، میرا صحیح معنوں میں برباد کنندہ۔ ہیگ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے صرف کرسی گھسٹنے کی آواز سنی تھی۔ پھر میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا، یہ وقت میری زندگی کا کٹھن ترین وقت تھا اور مجھے جن لمحات سے گزرنا پڑ رہا تھا بس مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ انسان کو ہر طرح کی گنجائش رکھنی چاہئے۔ اپنے آپ کو فاتح اعظم نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ وقت کی کہانی مختلف ہوتی ہے اور فیصلہ کرنے والا صرف وقت ہوتا ہے جو انسان کو یہ بتاتا ہے کہ کیا ممکن ہے اور کیا ممکن نہیں ہے۔

بہرحال میں نے اپنے آپ کو پوری طرح ذہنی طور پر سنبھال لیا اور ہیگ کو دیکھنے لگا۔ ہیگ بغور مجھے دیکھتا رہا، پھر بولا۔ "نہیں، اصل میں دشمنی کا بھی ایک رشتہ ہوتا ہے۔ دوست تو خیر ہوتے ہی دوست ہیں۔ لیکن دشمنوں کا بھی ایک مقام ہوتا ہے۔ یہ ساری کہانی تمہیں دلچسپ لگنی چاہئے اگر صاحب ذوق ہو۔"

"یہ تم ہی ہو نا مسٹر ہیگ؟" میری آواز ابھری۔

"کوئی شبہ ہے تمہیں؟"

"نہیں حیرت ہے۔" میں نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"وہی میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔ کسی کے بارے میں فوری طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر لینا چاہئے۔ دراصل تمہاری تو خیر عمر بہت چھوٹی ہے، بڑے بڑے لوگ جن کی عمریں اچھی خاصی ہوتی ہیں غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"اب تم دیکھو نا، ذرا سا غور کرو۔ کلکتے میں میری تمہاری ملاقات بڑے دوستانہ انداز میں ہوئی اور اس بات کے بڑے امکانات تھے کہ اگر تم مجھ سے تعاون کرتے تو ہم لوگ دوست ہی بنے رہتے۔ تم مجھ سے منحرف ہو گئے اور عذابوں نے تمہارا گھر دیکھ لیا۔ مجھے ایک بات کا جواب دو کیا تم نے کبھی اپنے آپ کو مجھ پر فتح پاتے ہوئے دیکھا؟ ایک بار بھی نہیں۔ اس سے تمہیں یہ اندازہ ہو جانا چاہئے تھا کہ تم بہت پیچھے کے انسان ہو میری نسبت۔ اب تم نے دیکھ لیا، تم نے وہاں کلکتہ میں میرا راستہ کاٹنا چاہا، نقصان اٹھایا۔ ایک قاتل کی حیثیت سے تمہیں اپنی پوری زندگی داؤ پر لگانی پڑی اور نجانے کیسی کیسی مصیبتوں میں گرفتار ہوئے تم۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے مددگار میرے لئے حیرت ناک ہیں لیکن تم سے ان کے بارے میں بھی سوال کروں گا میں۔ بہرحال میں یہ جاننا چاہوں گا کہ جو لوگ اس قدر اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں ان کے وسائل کیا ہیں۔ بس یوں سمجھو یہ میرا طریقہ کار ہے۔ میں ان لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جو میرے خلاف کسی بھی شکل میں تھوڑی بہت کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔"

"مسٹر خاقان! ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔ پوری کہانی تمہارے سامنے کہنا چاہتا ہوں۔"

"تم چھپے چھپے پھر رہے تھے۔ اتفاقیہ طور پر تمہیں میرے سفر کے بار میں معلومات حاصل ہو گئیں۔ جہاز پر کیا تم اس لئے سوار نہیں ہوئے تھے کہ تم مجھے ہلاک کر دو۔ جواب دیتے جاؤ تو زیادہ بہتر ہو گا۔"

"ہاں، میں تمہاری ہلاکت چاہتا تھا اور اب بھی چاہتا ہوں۔"

"یہی تو مزیدار بات ہے۔ اگر تم یہ کہہ دیتے کہ میں معافی چاہتا ہوں ہیگ، میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تو یقین کرو مجھے تم سے نفرت ہو جاتی۔ میں نے کہا نا انسان اگر اپنے آپ کو ہوش مند رکھنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اپنے دشمن بنائے۔ سمجھے۔ دشمنوں کا موجود ہونا بڑا ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح اسے جینے میں آسانی ہو جاتی ہے، وہ محتاط رہتا ہے اپنے دشمنوں سے اور اسے دنیا بڑی دلکش لگتی ہے۔ میری بھی یہی کیفیت ہے۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات؟ اچھا خیر چھوڑو، جہاز پر مجھے اول وقت سے معلوم تھا کہ تم موجود ہو اور اس کے بعد جہاز پر جو ہنگامہ آرائیاں ہوئیں، ان کا مجھ سے زیادہ

تمہیں علم ہے۔ بہت سے لوگ راستے میں آئے۔ اصل میں اس جہاز سے سفر کرنا میرے لئے بڑا ضروری تھا۔ چونکہ وہ شخص جس کا نام احتشام تھا مجھے اس کی بڑی ضرورت تھی اور اس سے مجھے بہت سے کام لینے تھے۔ بہرحال جہاز کا کھیل بڑا دلچسپ رہا۔ پھر ہم اسکندریہ آ گئے۔ یہاں ہشمان ذکری موجود تھا۔ میرا دوست سمجھ لو۔ دست راست سمجھ لو۔ یوں سمجھ لو میرے آدھے کاروبار کا مالک ہے وہ۔ اتنی معمولی شخصیت نہیں ہے جتنا تم نے اسے سمجھا ہوگا۔ سب کچھ میری مرضی کے مطابق ہو رہا تھا۔ لیکن مجھے سب سے بڑا دھچکا اس وقت پہنچا جب وہ لوح تمہارے ہاتھ لگ گئی۔ وہ بڑا غلط ہو گیا تھا۔ اور پھر تم نے اسے اس طرح غائب کیا کہ وہ مجھے مل ہی نہیں سکی۔ بہت غور کیا میں نے۔ میں جانتا تھا کہ کچھ پراسرار قوتیں، کچھ ایسی قوتیں جن کے بارے میں صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکا کہ کون لوگ ہیں، کہاں رہتے اور کہاں سے آتے ہیں؟ تمہاری مدد کر رہی تھیں۔ لوح کا میرے ہاتھ سے نکل جانا میرے لئے بڑے دکھ کا باعث رہا۔ مجھے حیرت ہے کہ تم نے اسے کہاں پوشیدہ کر دیا اور مجھے یہ بھی حیرت ہے کہ وہ قوتیں کون سی ہیں اور ان کا تعلق کہاں سے ہے جو تمہاری مددگار رہی ہیں اور جنہوں نے بہت سے نازک مرحلوں پر اتنے حیرت انگیز طریقے سے تمہاری مدد کی ہے کہ مجھ جیسا آدمی بھی ان کا پتہ لگانے میں ناکام رہا۔ خیر چلو چھوڑو، بڑے غور و خوض کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ تمہیں ان قوتوں سے اتنی دور کر دیا جائے کہ تم ان کی مدد نہ لے سکو اور میرا خیال ہے اپنی اس کوشش میں، میں بھرپور طریقے سے کامیاب رہا ہوں۔ جتنے عرصے سے تم یہاں جرمنی میں پھنسے ہوئے ہو اتنے عرصے تک میں ایک ایک لمحہ، دن اور رات تمہاری نگرانی کرتا رہا ہوں اور یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ وہ کون ہے جو تم تک پہنچ سکتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں ہپناٹزم کا ماہر ہوں۔ میں نے اس سے بھی تمہارا ذہن پڑھنے کی کوشش کی لیکن تم خاموش رہے اور میں یہ معلوم نہیں کر سکا کہ وہ پراسرار قوتیں کون سی ہیں جو تمہاری مددگار اور محافظ ہیں۔ یہ چیز بھی میرے لئے بہت حیران کن ہے۔ چونکہ بہرحال میں اپنے اس علم میں بھی اضافہ چاہتا ہوں۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات؟" میں خاموشی سے اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ بڑے عجیب و غریب انکشافات کر رہا تھا ہیگ۔

"تم مجھ سے کوئی سوال کرنا چاہتے ہو؟" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور میں سوچنے لگا کہ میں اس سے کیا سوال کرنا پسند کروں گا۔ میرے اور اس کے درمیان

دشمنی کا جو رشتہ ہے وہ شدید ہے لیکن کرنا کیا چاہیے؟ جو باتیں اس نے کی تھیں وہ بڑی تعجب خیز تھیں۔ ہو سکتا ہے میری معلومات میں بھی کچھ اضافہ ہو جائے۔ میں نے اس سے کہا۔

"ہاں، میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"بولو، بولو۔ میں تمہیں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔" وہ نرم اور ہمدردانہ لہجے میں بولا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ تم نے یہاں مجھے اس جال میں کیسے پھنسا لیا؟"

"میرے عزیز، میرے دوست! اسکندریہ میں تم کچھ لمحوں کے لئے میرے چنگل سے نکل بھاگے تھے۔ تم نے دیکھا کہ اسکندریہ کا سب سے بڑا آدمی میرے لئے غلاموں کی طرح کام کرتا ہے۔ حالانکہ وہ اس قدر دولت مند ہے کہ آدھا اسکندریہ خرید سکتا ہے۔ لیکن بہرحال میرے کچھ اور نام بھی تمہارے علم میں آئے ہیں، وہ غلط نہیں ہیں۔ اصل میں ہر انسان کی اپنی ایک سوچ ہوتی ہے۔ میں نے اس دنیا میں اپنے جینے کے لئے ایک معیار مقرر کیا تھا۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ کسی ملک کے حکمران کی حیثیت سے نہیں جیوں گا جبکہ میں اگر چاہتا تو تم یقین کرو میرے پاس اتنے وسائل ہیں کہ میں کسی بھی ملک کا وزیراعظم بن سکتا تھا یا کم از کم اس کے مساوی حیثیت حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن ان لوگوں پر بھی لاتعداد پابندیاں رہتی ہیں۔ وہ سازشوں کا شکار ہوتے ہیں اور بیشتر انہیں اپنی مرضی کے خلاف ہی کام کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ یہ سب کچھ میری فطرت میں ہی نہیں تھا۔ آخر کار میں نے یہ طے کیا کہ میں کسی ایک ملک کا سربراہ بن کر نہیں بلکہ ایک ایسا انسان بن کر زندہ رہوں گا جو سربراہی کے مساوی ہو لیکن اس پر کسی کا دباؤ نہ ہو اور بس سمجھ لو میں اسی انداز میں جی رہا ہوں۔ دنیا کے لاتعداد ملکوں میں جو کچھ میں کرنا چاہوں، کر سکتا ہوں۔ میرے مختلف شوق ہیں اور میں ان کی تکمیل کرتا رہتا ہوں۔ وہ تختی جو تمہاری تحویل میں ہے اور بلاشبہ تم نے اسے کسی ایسی جگہ چھپایا ہے جہاں واقعی میری ذہنی اور عملی رسائی نہیں ہو سکی یہ میرے لئے ایک دلچسپ تجربہ ہے۔ اور یوں سمجھ لو کہ میں نے اس تجربے کی تکمیل کا عہد کر رکھا ہے اور یہ عہد پورا ہو جائے گا۔ ایسا کوئی کچا کام میں کبھی نہیں کرتا جس کی تکمیل نہ کر پاؤں۔ یہاں جرمنی میں میرے پاس ایسے وسائل تھے کہ میں تمہیں ایک برطانوی جاسوس کی حیثیت سے یہاں تک لا سکوں۔ تم جانتے ہو جرمنی کا ایک الگ

حساب ہے۔ مشرقی اور مغربی جرمنی کی صورتحال کا تمہیں اندازہ ہے مگر یہ خالص سیاسی عمل ہے۔ تم دیکھ لو، تمہیں جن مدارج سے گزارا گیا ہے وہ اصل میں تمہارا حوصلہ توڑنے کے لئے تھے۔ تم نے دیکھ لیا کہ جگہ جگہ تمہارے ساتھ کیا نہیں ہو سکتا تھا، میں نے ابھی تک نہیں ہونے دیا۔ لیکن میرا ایک اشارہ تمہیں تمہارے جسم کی تمام کھال سے محروم کر سکتا ہے۔ ان لوگوں کی تربیت کے بارے میں تم نے پڑھ ہی لیا ہو گا کہ اذیت رسانی میں ان کا کیا مقام ہے۔ میں تمہیں دھمکیاں نہیں دے رہا، وہ سچائیاں بتا رہا ہوں جو تم جاننا چاہتے ہو۔ کیا تم مجھے کچھ بتانے پر آمادہ ہو گے؟"

"ہاں، میں آمادہ ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"واہ...... کم از کم یہ اظہار کر کے تم نے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اب اگر تم چاہو تو کچھ وقت بھی لے سکتے ہو۔ تم چاہو تو اپنی یہ حالت بہتر بنا سکتے ہو۔ لیکن کھیل جتنی جلدی ختم کر دیا جائے بہتر ہوتا ہے۔ بولو کیا پسند کرو گے؟"

"زبان ہی ہلانی ہے تو اس کے لئے انتظار بے معنی چیز ہوتی ہے۔ جو کچھ میں جانتا ہوں تمہیں بتا دوں گا۔ اس کے بعد تم یہ فیصلہ کر لو گے کہ تمہیں میرے ساتھ کیا کرنا ہے۔"

"ہاں، میں اس کے لئے تیار ہوں۔"

میں جانتا تھا کہ اس وقت دنیا کا سب سے خطرناک ترین آدمی میرے پاس ہے۔ وہ ذہن پڑھ لیتا ہے اور اپنی قوتیں مسلط کر سکتا ہے۔ اس کے لئے کسی برائی کا سوچنا احمقانہ بات ہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"ہیگ! جو کچھ تم نے میرے ہاتھوں کرایا اور جس طرح ہندوستان میں میرے لئے زمین تنگ ہو گئی اور مجھے انگریز دشمنی کا شکار ہونا پڑا تم جانتے ہو ایسا صرف تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"اچھی طرح جانتا ہوں میری جان، بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"اس کے بعد اگر میں تمہارے قتل کے چکر میں پڑ گیا تو یہ کوئی مشکل یا اہم بات نہیں تھی۔"

"اہم ہو یا نہ ہو لیکن مشکل ضرور تھی۔ کیونکہ جب تم نے میرا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا اور جس طرح اپنے وسائل سے کام لے کر اس جہاز میں سوار ہوئے ساری باتیں میرے علم میں تھیں۔ میں اسی جہاز میں تمہارے ساتھ سفر کر رہا تھا اور تنہا نہیں تھا۔ میرے ساتھ

بہت سے لوگ تھے لیکن اس جہاز پر سفر کرنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ تمہیں کھلاتا پلاتا چلا آؤں۔ بلکہ اس وقت بھی وہ تختی میری توجہ کا مرکز تھی۔ میں اس سے بہت سے کام لینا چاہتا تھا۔ تم یہ سمجھ لو کہ اس وقت وہ میری اہم ترین طلب ہے اور میں تمہیں یہ بات سچ سچ بتا دوں کہ میں ابھی تک یہ نہیں جان سکا کہ وہ کون سی پراسرار قوتیں ہیں جو تمہاری مدد کر رہی ہیں۔"

"آہ، یہی تو میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔ یہ سب کچھ مجھ پر بچپن ہی سے مسلط ہے ہیگ! تم یقین کرنا چاہو تو یقین کر لو اور اگر یقین نہ آئے تو تمہیں تو ہپناٹزم کی قوت حاصل ہے، مجھے تنویمی نیند سلاؤ اور یہ معلوم کر لو کہ میں تم سے سچ بول رہا ہوں یا جھوٹ۔"

ہیگ کی آنکھوں میں گہری سوچ کے آثار نظر آئے۔ اس نے کہا۔ "تمہاری بات وزن دار ہے۔ مجھے اس پر غور کرنا ہو گا۔ اچھا ایسا کرو تھوڑا وقت آرام کر لو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں پریشانی ہو یا تم جن مراحل سے گزرے ہو اور ان میں اپنی قوتیں کھو چکے ہو......"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "آؤ...... ہم دشمن تو رہے ہی ہیں۔ کچھ وقت کے لئے کم از کم دوستانہ انداز اختیار کر لیں جب تک ایک بار پھر ہم ایک دوسرے کے مقابل نہ آ کھڑے ہوں۔"

دلچسپ پیشکش تھی۔ مجھے بھی بھائی اور یہ حالات کا تقاضہ تھا۔ کیونکہ جو لمحات مجھ پر بیت چکے تھے انہوں نے مجھے واقعی تقریباً دیوانہ کر دیا تھا۔ مصنوعی دیوانگی کا مظاہرہ تو میں کر ہی چکا تھا لیکن میری خواہش تھی کہ سچ مچ دیوانہ ہو جاؤں۔ اب اگر ہیگ سے تعاون نہ کیا اور اپنی ضد کا مظاہرہ کرتا رہا تو جو نتیجہ ہو گا مجھے خود بھی اس کا اندازہ تھا۔ بہتر یہی تھا کہ اس سے تعاون کر کے اپنی تقدیر کے فیصلے کا انتظار کروں۔ ہیگ سے انتقام لینا اگر میری تقدیر میں نہیں ہے تو مجبوری ہے۔ لیکن کم از کم یکسوئی تو نصیب ہو۔ اونٹ اس کروٹ بیٹھے یا اُس کروٹ۔

ہیگ میری صورت دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "ٹھیک ہے مسٹر ہیگ! ہم ایک دلچسپ تجربے کے لئے تیار ہیں۔ آپ بھروسہ کیجئے، میں بھی کسی گھٹیا قسم کا انسان نہیں ہوں۔ جب آپ سے کوئی وعدہ کروں گا تو اس کی تکمیل بھی کروں گا۔"

"میں جانتا ہوں۔ ایسا نہ ہوتا تو میرا رویہ تمہارے ساتھ مختلف ہوتا۔ تم ایک اچھے خاندان کے صاحب ظرف اور معیاری انسان ہو۔ تمہارا دشمن ہونے کے باوجود میں اس

بات کا اعتراف کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم کب اور کن حالات میں مجھ سے کیا رویہ اختیار کرو گے۔ اب ایسا کرو میں تمہارے لئے آرام کا بندوبست کرتا ہوں۔ اپنے آپ کو بالکل بہتر حالت میں پاؤ تو مجھے اس کے بارے میں بتا دینا۔ میں تم سے ملاقات کر لوں گا۔“

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلا دی تھی۔

☆

سینے کے اندر دل کی پھڑپھڑاہٹ بھی عجیب ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو دماغ یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ یہ کمبخت دل آخر چاہتا کیا ہے؟ کیوں اس بے ترتیبی سے دھڑک رہا ہے؟ بہر حال دل کی چاہت کا تصور صدیوں پرانا خیال ہے۔ میڈیکل سائنس اس بارے میں کیا کہتی ہے کم از کم مجھے نہیں معلوم تھا۔ سوچیں کیا واقعی دل میں ہوتی ہیں؟ فیصلے دل کرتا ہے یا دماغ، میرے خیال میں یہ ایک بے مقصد بحث تھی۔ ہیگ جس کے لئے میں اپنی زندگی کا ایک طویل وقت ضائع کر چکا تھا، زندہ سلامت موجود تھا۔ کوئی الجھن، کوئی تکلیف، کوئی پریشانی اسے نہیں تھی۔ بلکہ یہاں مغربی جرمنی میں وہ جس انداز میں میرے سامنے آیا تھا وہ قابل رشک تھا۔ اس نے کلکتہ میں مجھے اپنا تعارف غلط نہیں کرایا تھا۔ سب کچھ صاف صاف بتا دیا تھا اس نے مجھے اپنے بارے میں کہ وہ ایک اسمگلر ہے۔ میں نے ہی اس کے خلاف کام شروع کیا تھا اور وہ بھی کچھ خاص وجوہات کی بنا پر۔ لیکن یہ بھی ایک سچ ہے کہ وہ حالات کا حکمران ہی رہا تھا اور مجھے اس کے سامنے ہر لحہ شکست ہوئی تھی۔ اس نے ہزاروں ستون میرے راستے میں کھڑے کر دیئے تھے اور مجھے اس کے مقابلے میں ناکامیوں ہی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اور اب وہ پھر میرے سامنے آیا تھا اور یہ ایک سچائی تھی کہ ایک فاتح کی حیثیت سے سامنے آیا تھا۔ بالکل بے بس کر کے رکھ دیا تھا اس نے مجھے۔ کچھ بھی نہیں کر سکا تھا میں اس کے خلاف۔ بہر حال یہ ایک افسوسناک امر تھا اور اب وہ مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا جو میرے مددگار، میری پشت پر تھے۔ کہاں مر گئے سارے کے سارے؟ ویسے تو عقیدت اور محبت کے طومار باندھ دیتے تھے اور اب جب میں ایک مستقل مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا تو سب میرا راستہ چھوڑ گئے تھے۔ میں نے درحقیقت دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اب دھوکا دہی سے کام لوں گا اور اپنا پچھلا رویہ تبدیل کر دوں گا۔ اپنی قوتِ ارادی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہمیشہ

حالات کے ہاتھوں میں کھیلتا رہا تھا، لیکن اب حالات کو اپنی انگلیوں پر نچاؤں گا۔ ہیگ کو ان لوگوں کے بارے میں بتایا جائے یا نہ بتایا جائے؟ پتہ نہیں کمبخت یقین بھی کرے گا یا نہیں کرے گا۔ ویسے جب کیمپ میں میری رپورٹ لکھی گئی تھی تب بھی میں نے اپنے بچپن، سیتا گڑھی، اپنے والد کے بارے میں تو سب کچھ بتا دیا تھا لیکن گاشر برم کی کہانی انہیں نہیں سنائی تھی۔ سیوک سندھورتی، وردان سادھانی یا اور کسی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ حالانکہ ماشرہ، اشم سندھانی اور نجانے کیا کیا میرے ذہن میں آیا تھا لیکن میں نے سوچا کہ وہ میری بات پر یقین نہیں کریں گے۔ چنانچہ میں وہاں سے گزر گیا تھا۔ تو کیا اب ہیگ کو اس بارے میں بتاؤں؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہیگ میری تمام تر حقیقتیں جاننے کے بعد کوئی گڑبڑ کرے۔ بہر حال آج بھی دل میں یہ حسرت تھی کہ ہیگ سے انتقام لے لوں۔ کبھی کبھی انسان خود اپنی ذات کو نہیں سمجھ پاتا۔ میں اس دوران بہت سے کرداروں سے متعارف ہوا تھا، ان سے ذہنی قربت بھی رہی تھی میری اور جسمانی قربت بھی۔ اس کا آغاز ایلس فیوری سے ہوا تھا۔

مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ سلطان چچا یا دوسرے لوگ مجھے میرے باپ سے منسلک ضرور کرتے تھے اور یہ بات تو خیر میرے علم میں بھی تھی کہ والد صاحب قبلہ شوقین مزاج آدمی تھے اور خاص طور سے اپنی رنگین فطرت کی بنا پر شہرت کے حامل بھی تھے لیکن میرے ذہن میں تو یہ سب کچھ یوں لگتا تھا جیسے کسی شیطانی عمل کے تحت آیا ہو اور اس میں میری اپنی کاوشوں کا دخل نہ ہو۔ یا پھر وہی دوسری بات کہ انسان اپنے آپ کو معصوم سمجھتا ہے اور کبھی کبھی اپنے ہر گناہ کو اتفاقات اور حالات سے منسوب کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہیگ کے ہاتھوں بے بس ہو جاؤں؟ کیا کروں؟ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہاں مجھے تھوڑی سی آزادی دے دی گئی ہو۔ اپنی اس قید سے باہر نکل آیا تھا۔ حالانکہ کیمپ جیسی جگہ تھی یہ بھی۔ سنتری بھی تھے اور شاید دوسرے قیدی بھی۔ لیکن اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ یہ ہیگ کی مہربانی ہے اس نے بہتر طریقہ کار اختیار کرنے کے لئے مجھے یہ آزادی دی تھی۔

جب بے چینی ضرورت سے زیادہ ہو گئی تو میں باہر نکل آیا۔ مجھے اندر رہ کر یہ اندازہ نہیں تھا کہ باہر مدھم مدھم بارش ہو رہی ہے۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ پر بھی میں نے پہلے غور نہیں کیا تھا۔ لیکن اب باہر آ کر دیکھا تو مدھم مدھم بوندوں کے ساتھ بادل بھی گرج

رہے تھے۔ ایک عجیب سا احساس دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ میں بے مقصد ٹہلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ یہ ایک پتلی سی راہداری تھی جس کے دونوں طرف اونچی دیواریں نظر آ رہی تھیں۔ پیروں میں کوڑا پڑا ہوا تھا۔ غالباً کوئی ایسی جگہ تھی جہاں سے صفائی وغیرہ نہیں کی جاتی تھی۔ البتہ بدبو وغیرہ نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ آگے چل کر دوسری سمت اختیار کروں اور کسی ایسی زیادہ کھلی جگہ پہنچ جاؤں جہاں ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا پھیپھڑوں میں کھینچی جا سکے۔ ابھی میں آہستہ روی سے چل ہی رہا تھا کہ دفعتہً ہی کسی نے میرا بازو پکڑا اور زور سے اندر گھسیٹ لیا۔ میرے حلق سے مدھم سی آواز نکل گئی تھی۔ بازو پکڑ کر کھینچنے والے نے کہا۔

"الّو کے پٹھے! مجھے بھی مرواؤ گے کیا؟ اپنا حلق بند رکھو۔" جملے انگریزی میں کہے گئے تھے۔ میرا حلق تو خیر کیا ہی بند ہوتا آواز البتہ بند ہو گئی۔ گھسیٹنے والے نے مجھے گھسیٹ کر دور تک لے جانے کا عمل کیا اور پھر بولا۔

"چلو بیٹھو، بیٹھو۔ آ جاؤ میرے پیچھے پیچھے۔ اور کوئی حماقت کا کام نہ کرو ورنہ بیٹے، ٹکڑے اڑا دیئے جائیں گے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن میں نے بے اختیار اس کی ہدایت پر عمل کیا اور اس عجیب سی جگہ میں بیٹھ کر گزرنے لگا۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی سرنگ ہے، تنگ اور کچھ اس طرح کی جیسے فرار کے لئے بنائی گئی ہو۔ ریت کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے اور سرنگ بہت پتلی تھی۔ آگے والا شخص ہاتھ پیروں کے بل رینگتا ہوا مگرمچھ کی طرح آہستہ آہستہ اس قبر نما سرنگ میں سفر کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میرا دل چاہا کہ میں الٹے قدموں واپس پلٹ جاؤں لیکن نجانے کیوں میں اس کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ ہم دونوں ایک ایک انچ کے حساب سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ابھی نجانے کتنا راستہ طے کیا گیا تھا کہ اوپر سے کسی کے بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی۔ لیکن پھر بھی ہم لوگ آگے بڑھتے رہے۔ میں تو بلاوجہ ہی اس چکر میں گرفتار ہو گیا تھا۔ لیکن آنے والا شخص نجانے کون تھا۔ بہرحال اس تنگ اور گھٹی ہوئی سرنگ میں رینگتے ہوئے گھٹنے اور کہنیاں چھل گئی تھیں۔ یہاں تک کہ سرنگ کا خاتمہ ہوا اور آگے والا شخص سرنگ سے باہر نکل گیا۔ شاید وہ گالیاں بکنے کا عادی تھا اس لئے اس نے انگریزی میں دو چار گالیاں اور دیں اور بولا۔

"مر گیا کیا؟ یار، تو انسان ہے یا گدھا؟ ہر مرحلے پر اسی طرح گدھے پن کا ثبوت دیتا ہے۔ گیرون الّو کے پٹھے باہر نکل آؤ ورنہ سرنگ میں ہی زندگی ختم ہو جائے گی۔"

میں نے حیرت سے سوچا کہ یہ گیرون کون ہے؟ اور اس کے بعد صورتحال میرے ذہن میں واضح ہو گئی۔ غلط فہمی...... کوئی بہت بڑی غلط فہمی۔ یہ آگے جانے والا شخص گیرون نامی آدمی کے ساتھ غالباً اس سرنگ کے ذریعے فرار ہونا چاہتا تھا جو اس نے خود یہاں بنائی تھی۔ لیکن بدنصیب گیرون کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر میں باہر نکل آیا۔ مدھم مدھم بوندا باندی اب بھی جاری تھی۔ آگے والا شخص جو ایک گٹھے ہوئے بدن کا آدمی تھا منہ اٹھا کر گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔

"بادل گہرے ہیں، بارش تیز ہو گئی تو......" یہ کہہ کر اس نے مجھے دیکھا اور دفعتہً ہی پیچھے ہٹ کر اچھل گیا۔ اب ایک دم اسے اندازہ ہوا تھا کہ میں گیرون نہیں ہوں۔ اس نے اپنا خنجر سیدھا کیا تو میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"اگر تمہارے پاس وقت ہے تو واپس اس سرنگ سے اندر جاؤ اور گیرون کو تلاش کر کے لے آؤ۔"

وہ بدستور مجھے گھورتا رہا۔ شکر تھا کہ اس نے حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی ورنہ اس کے ہاتھ میں دبا ہوا خنجر کافی خطرناک نظر آ رہا تھا۔ بمشکل تمام اس کی آواز ابھری۔ "تم...... تم کون ہو؟"

"صرف ایک لمحے کے لئے گزرے ہوئے حالات پر غور کرو۔ میں اس راہداری میں چلتا ہوا کھلے علاقے کی جانب جا رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ راہداری کی اطرافی دیواروں میں کوئی پوشیدہ ہے۔ تم نے بازو پکڑ کر مجھے اندر گھسیٹ لیا اور اس طرح مجھے اس سرنگ میں آنے کا اشارہ کیا۔ ویسے میں تمہیں بتاؤں کہ میں بھی اس جگہ کا قیدی ہوں اور ظاہر ہے فرار کی آرزو میرے دل میں بھی تھی۔ لیکن اس کی امید نہیں تھی۔"

"آہ...... وہ الّو کا پٹھا اسی قابل تھا۔ رہ گیا پیچھے۔ حالانکہ یہ سرنگ بنانے میں اس نے مجھ سے زیادہ محنت کی تھی۔ ساڑھے پانچ بج چکے ہیں۔ اگر کوئی بیرک میں آ گیا تو سمجھ لو زندگی ختم۔ اب اس کی گنجائش بالکل نہیں ہے کہ میں واپس جا کر اس گدھے کی اولاد کو تلاش کروں۔ آؤ...... جلدی سے آگے آ جاؤ۔ تقدیر تم پر مہربان تھی۔ کبھی کبھی ہی کسی کو اس طرح بغیر محنت کے موقع ملتا ہے۔ اوہو، دیکھو یہ آواز سنو۔"

کیمپ کے اندر بگل بج رہا تھا۔ یہ قیدیوں کو بیدار کرنے کا بگل تھا۔ حالانکہ چھ بج گئے تھے لیکن ابھی کیمپ کے اندر کافی اندھیرا تھا اور پہرے دار سنتریوں کی کوٹھڑیوں میں سرخ رنگ کی بتیاں جل رہی تھیں۔ وہ غم آلود انداز میں گردن ہلاتا ہوا بولا۔

"بدنصیب انسان۔ لیکن ہم کسی کی تقدیر کے ساتھ اپنی تقدیر نہیں جوڑ سکتے۔ زندگی کی یہ چند سانسیں اپنی ہی ملکیت ہونی چاہئیں۔ دیکھو آگے کیا ہوتا ہے۔ آؤ...... اوہو، لیٹ جاؤ...... لیٹ جاؤ" اچانک ہی اس نے کہا اور میں زمین پر لیٹ گیا۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے کیمپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہیں بھی اس طرف اٹھ گئیں۔ یہ موقع ایسا نازک تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی ہمیں موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔ کیمپ میں چاروں طرف پہریدار موجود تھے اور ان کی عقابی نگاہوں سے بچ نکلنا ناممکن تھا۔ بہر حال مجھ سے زیادہ وہ خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ اور پھر اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

"مجھے اپنے ذہن کو اس غم سے نکالنا پڑے گا۔ کیونکہ یہاں ایک معمولی سی بات پر گولی مار دی جاتی ہے۔ آؤ میرے ساتھ...... اگر ہم اپنی تقدیر کے ساتھ سفر کرتے ہوئے سڑک کے دائیں جانب اس جنگل تک پہنچ جائیں جو صنوبر کے درختوں کا جنگل ہے تو پھر ہمیں آسانی سے تلاش نہیں کیا جا سکے گا۔ آ جاؤ تقدیر کے دھنی، آ جاؤ" اس نے کہا اور سڑک کی طرف رینگنے لگا۔ کیمپ میں اب ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ ابھی تک کسی کو دو قیدیوں کے فرار کا علم نہیں ہے۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بھی اس بدنصیب شخص کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کا نام گیرون تھا اور جس نے اس سرنگ کے ذریعے باہر نکلنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن نجانے کس وجہ سے وہ اندر ہی رہ گیا تھا اور میں باہر نکل آیا تھا۔ واقعات جس طرح پیش آئے تھے اس کے تحت ابھی تک یہ غور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ میرا اس کیمپ سے نکل آنا میرے لئے فائدہ مند ہے یا نقصان دہ۔ ہیگ نے مجھے سوچنے کی پیشکش کی تھی۔ وہ ان لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا جو میرے پس پشت تھے۔ اور اگر میں واقعی اسے وردان سادھانی، گاشر برم وغیرہ کے بارے میں بتاتا تو پتہ نہیں وہ اس پر یقین کرتا بھی یا نہیں؟ اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انسان اگر اپنے دشمن کے سامنے اس سے تعاون کرنے پر مجبور ہو جائے تو یہ بے بسی کی انتہا ہوتی ہے اور ایسی بے بسی کو قبول کرنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہوتا ہے۔ وہ میرا بدترین دشمن تھا اور یہ بہت بڑی سچائی ہے کہ اگر وہ

مجھے ہپناٹائز نہ کرتا تو شاید میری زندگی کا رخ ہی بدلا ہوا ہوتا۔ میرا باپ اس غم سے مر گئے کہ میں نے مجرمانہ زندگی اختیار کر لی ہے۔ اس شخص کا شکریہ جس نے کم از کم آگے کے لئے جدوجہد کرنے کا موقع دیا۔ پتہ نہیں اس کا نام کیا ہے۔ بہر حال میں اس کی جانب ہو گیا۔ وہ کہنے لگا۔

"سنو، اب ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ اگر ہم خوف سے اسی طرح رینگ رینگ کر آگے بڑھتے رہے تو ضرور پکڑے جائیں گے۔ اٹھو...... ویسے یہ وقت پہریداروں کی ڈیوٹیاں تبدیل کرنے کا ہے اور رات کے پہریدار ناشتہ کرنے اپنے کوارٹروں میں چلے جاتے ہیں اور دن کو ڈیوٹی دینے والے ناشتہ کر کے اپنی ڈیوٹی پر آ جاتے ہیں۔"

بہر حال میں نے اِدھر اُدھر کا جائزہ لے کر یہ اندازہ لگایا کہ کوئی ہمیں دیکھ نہیں رہا اور ہم وہاں سے اٹھے اور اندھا دھند بھاگنے لگے۔ میں صرف اس کی تقلید کر رہا تھا اور اسی طرح پوری قوت کے ساتھ بھاگ رہا تھا جس طرح وہ۔ یہاں تک کہ ہم جنگل میں داخل ہو گئے۔ اس نے ایک گڑھا تلاش کیا اور اس میں چھلانگ لگا دی۔ میں ایک مفرور قیدی کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس نے کہا۔

"آخری بار افسوس کر رہا ہوں کہ گیرون بدنصیب اسی قید میں رہ گیا۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ نصیب بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"خاقان!" میں نے جواب دیا۔

"صحرائے گوبی کے رہنے والے ہو؟" وہ ازراہِ مذاق بولا۔

"بہر حال کہیں نہ کہیں کا ہوں۔"

"میرا نام مارک ہے۔ مارک گیو۔ تم چاہو تو مجھے گیو کہہ سکتے ہو یا مارک بھی کہہ سکتے ہو۔ مجھے اعتراض نہیں ہو گا۔"

"اب آگے کا کیا ارادہ ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"سب سے پہلے یہ لباس تبدیل کرنے ہیں۔ پتہ نہیں گیرون کا لباس تمہارے بدن پر پورا آتا ہے یا نہیں۔ تمہارا لباس تو بالکل ٹھیک ہے۔ میرا لباس البتہ بری طرح خراب ہو رہا ہے۔ میں لباس تبدیل کر لوں، اس کے بعد ہم سیدھے اسٹیشن جائیں گے۔"

"اسٹیشن؟"

"ہاں۔"

"تو کیا ٹرین کے ذریعے سفر کرنا ہے؟"

"لو اور کیا، تمہیں ہوائی جہاز لینے آ رہا ہے؟"

"نہیں میرا مطلب ہے ہم ٹرین میں پہچانے نہیں جائیں گے؟"

"ہم تو ہواؤں میں بھی پہچانے جا سکتے ہیں۔ پتہ نہیں تم کس سلسلے میں یہاں قید ہوئے ہو۔"

"وہ مجھے برطانوی جاسوس سمجھتے ہیں۔"

"برطانوی جاسوس؟"

"ہاں۔"

"یہ تو مجھے بھی سمجھا جاتا ہے۔"

"کیا تم برطانوی جاسوس ہو؟"

"اگر ہوں بھی تو کم از کم تمہیں تو نہیں بتاؤں گا۔" گیو نے کہا۔

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میں انڈین ہوں اور میرا تعلق برٹش نیوی سے ہے بلکہ تم یوں سمجھ لو کہ بحری انٹیلی جنس کا ایک رکن ہوں۔"

"اوہ مائی گاڈ...... اچھا، میں بھی برٹش ہوں۔ برٹش آرمی کا ایک رکن۔"

"تب تو تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ کم از کم ہمارا تعلق ایک ہی مقصد سے ہے۔"

"ہاں......" وہ جلدی جلدی اپنا لباس اتارنے لگا۔ اور پھر اس نے اپنا لباس تھیلے میں رکھا، دوسرا تھیلا اس نے میرے حوالے کیا اور بولا۔

"آؤ...... چلو، ادھر سے اب چلتے ہیں۔"

جنگل میں کچھ اور آگے جا کر پانی کے پائپ سے ہم دونوں نے ہاتھ منہ اور پیر صاف کیے۔ وہ کہنے لگا۔ "یہ وردی ہمیں چھپانی ہے۔ اگر ہم اسے جنگل میں پھینک دیتے ہیں ضرور جلد یا بدیر پتہ چل جائے گا۔ وردی پر نمبر پڑا ہوا ہے۔ کم از کم میرے بارے میں وہ لوگ جان لیں گے۔ ویسے کمال کی بات ہے، میں سمجھتا ہوں بالکل پہلا موقع ہے ابھی تک ان لوگوں کو دو قیدیوں کے فرار کا علم نہیں ہوا اور سائرن کی آوازیں بھی ابھریں۔ آؤ چلیں۔"

میں اب اس کا بھرپور ساتھ دے رہا تھا۔ میں نے بھی اپنا ایک نظریہ اپنا لیا تھا اور نظریہ یہ تھا کہ ہیگ کے سامنے زبان کھولنے سے بہتر ہے کہ دوسرے خطرات قبول

لئے جائیں۔ میلوں دور تک پھیلا ہوا یہ جنگل نجانے کتنی دور تک چلا گیا تھا۔ صنوبر اور چیڑ کے درخت خاموش اور اداس کھڑے ہوئے تھے۔ دور دور تک کہیں انسانی وجود نظر نہیں آ رہا تھا۔ موسم انتہائی سرد تھا اور ہوائیں بے حد ٹھنڈی۔ اس وسیع جنگل میں کسی کا نکل آنا حماقت کی بات تھی۔ بہرحال گیو کو راستے کے بارے میں شاید کافی معلومات تھیں۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اس نے اپنی وردی ایک گڑھے میں ڈال کر اس پر مٹی ڈال دی اور جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ تھوڑے فاصلے پر لوہے کا ایک پل نظر آ رہا تھا اور اس کے بعد ریلوے اسٹیشن تھا۔ پل عبور کر کے ہم لوگ آخر کار ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں اچھا خاصا رش تھا اور بہت سے لوگ گاڑی کے انتظار میں اِدھر سے اُدھر گھوم رہے تھے۔ گیو نے میرا ہاتھ دبایا اور بولا۔

"بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے لئے ایک ایک لمحہ موت کا لمحہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم اس منحوس کیمپ سے نکل آئے۔ لیکن خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے۔ وہ لوگ بڑے محتاط ہیں اور انہیں ہمارے فرار کا علم ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد چاروں طرف ہماری تلاش شروع ہو جائے گی۔"

"ایسا کرو تھوڑا فاصلہ اختیار کر لو۔"

"میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ اور ایک بات کا خیال رکھنا، اگر کوئی خطرناک مرحلہ آ جائے تو ہم ایک دوسرے کی فکر نہیں کریں گے بلکہ اپنی اپنی جان بچائیں گے۔ ہاں اگر ہم دونوں الگ الگ مشکل میں گرفتار ہوئے تو تم مجھے جنگل کے وائر ٹاور کے پاس مل جانا۔"

"کیا ہمیں ٹکٹ نہیں خریدنا چاہیے؟"

"ہاں بالکل۔ تمہارے پاس رقم موجود ہے؟ نہیں ہے تو یہ لو۔" اس نے کہا اور کچھ نوٹ میری جانب بڑھا دیئے۔ میرے پاس بھلا مقامی کرنسی کے ہونے کا کیا سوال تھا۔ مگر اس نے تمام انتظامات کئے ہوئے تھے۔ بہرحال ہم نے اپنے درمیان فاصلہ پیدا کیا اور لاپرواہی کا انداز اختیار کرتے ہوئے اسٹیشن کے بکنگ آفس کی طرف گئے۔ ٹکٹ لینے والوں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ گیو ٹکٹ خریدے بغیر سفر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ چیکر اگر بغیر ٹکٹ کے ہمیں چیک کر لیتا تو صورتحال خراب ہو جاتی۔ لیکن ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا۔ وہ یہ کہ ٹکٹ لینے والے سے اس کے بارے میں تمام تفصیل معلوم کی جا رہی تھی۔ گیو نے انگلی اٹھا کر مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور خود قطار میں کھڑا ہو گیا۔ بہرحال

یہ شخص میرے لئے فرشتہ ہی ثابت ہوا تھا۔ کیونکہ مجھے ہیگ کے چنگل سے نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔ گیو نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا اور بار بار اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتا تھا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ بکنگ آفس کے قریب پہنچ گیا تو میری نگاہیں لوہے کی جالی کے پیچھے اس لڑکی کے چہرے پر پڑیں جو مسکرا مسکرا کر کبھی کسی سے کوئی سوال کر دیتی تھی اور ٹکٹ اس کے حوالے کر دیتی تھی۔ بعض مسافروں سے اس نے شناختی کارڈ بھی طلب کئے تھے۔

بہر حال گیو کی باری آ گئی۔ اس نے نجانے لڑکی سے کیا کہا کہ لڑکی مسکرا دی اور میں نے اسے دو ٹکٹ دیتے ہوئے دیکھا۔ قسمت کی دیوی مہربان نظر آتی تھی۔ گیو ٹکٹ لے کر باہر نکل آیا۔ پھر ہمیں دور سے ریل گاڑی کی سیٹی سنائی دی اور پلیٹ فارم پر ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ اترنے والے مسافر ایک ایک کر کے باہر آ رہے تھے۔ ہم ہر شخص کو غور سے دیکھتے جا رہے تھے۔ مسافر یکے بعد دیگرے لوہے کے دروازے سے نیچے آتے رہے۔ چھوٹی سی ریل گاڑی تھی اور ہجوم کا یہ عالم تھا کہ ایک دوسرے پر گرا جا رہا تھا۔ ہر شخص ٹرین پر اس طرح چڑھنے کو تیار تھا کہ جیسے اس کے پیچھے کوئی بندوق لئے کھڑا ہے اور اگر وہ گاڑی میں نہ بیٹھ سکا تو اسے گولی مار دی جائے گی۔ راہداری میں اب بھی ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی ڈبے میں سوار ہونا چاہتے تھے۔ اور آخر کار ہم ایک مختصر سے ڈبے میں گھس گئے جو انسانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جرمنی جیسے ملک کے شہر برلن میں یہ ہنگامہ آرائی میرے لئے خاص طور سے سخت حیران کن تھی۔ چونکہ میں نے جرمنی کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن یہ وہ دور تھا جب جرمنی اپنے وقت کے عذاب سے گزر رہا تھا۔ گیو نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”اگر ریل گاڑی میں ہمارے کاغذات چیک کر لئے گئے تو؟“

”بس خدا پر ہی بھروسہ کرنا پڑے گا۔ ورنہ ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔“

بہر حال سفر جاری رہا۔ چند گھنٹوں کا یہ سفر اس قدر ہولناک تھا کہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن میرے ذہن میں سوچ کے دوسرے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ہیگ میرے فرار کے بعد کیا عمل کرے گا؟ ویسے اس نے جس طرح میرے مصیبتوں کا بندوبست کیا تھا اور جتنی محنت مجھے اپنے قبضے میں کرنے کے لئے کی تھی اس کے بعد یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ آسانی سے میرا فرار برداشت کرے گا۔

بہر حال اب جو کچھ بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو ہم اس جگہ سے نکل آئے تھے جس کا نام مجھے پہلی دفعہ معلوم ہوا تھا کہ اس کا نام برلن ہے۔ کچھ عجیب سی افراتفری کی فضا تھی یہاں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر شخص کسی کی تلاش میں ہو۔ لیکن یہ ہمارے اندر کا احساس تھا اور ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ہر شخص ہمیں تلاش کر رہا ہے۔ آخر کار گاڑی پیٹ ہون نامی ایک ریلوے اسٹیشن پر رکی تو ہم نیچے اتر گئے۔ گیو نے ہی یہ تجویز پیش کی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

”جب انہیں ہمارے فرار کا علم ہو گا تو وہ اپنے طور پر عقل کے گھوڑے دوڑائیں گے کہ ہم کہاں جا سکتے ہیں۔ بہتر جگہ چھپنے کے لئے کوئی بڑا شہر ہی ذہن میں آ سکتا ہے اور ہم نے ٹکٹ بھی دور کا ہی خریدا ہے۔ اگر ہم یہاں اتر جاتے ہیں تو یہ بہتر جگہ رہے گی۔“

چنانچہ ہم اس اجنبی جگہ اتر گئے۔ پیٹ ہون کچی پکی آبادی والا شہر تھا۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد تقریباً ہم دو گھنٹے تک مارے مارے پھرتے رہے اور شہر کے دوسری جانب پہنچ گئے۔ اس سے آگے میلوں تک کھیت ہی کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ گیو نے کراہتے ہوئے کہا۔

”آہ...... یوں لگتا ہے جیسے ٹانگیں جوڑ سے علیحدہ ہو جائیں گی۔ میں تو یہاں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“

”مگر گیو! یہ جگہ بالکل مناسب نہیں ہے۔ دو برطانوی جاسوس اتنے بڑے کھلے میدان میں لیے پڑے ہوئے ہیں، کسی کی نگاہ بھی پڑ سکتی ہے۔ ہم مصیبت میں پھنس جائیں گے۔“

گیو نے پریشان نگاہوں سے مجھے دیکھا، پھر اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا کہ میں اسے سہارا دوں اور اس کے بعد لڑکھڑاتے قدموں سے میرے ساتھ آگے بڑھا۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ اور طے کیا گیا۔ نیند کے مارے یہ حال تھا کہ اگر اس وقت کوئی تنگ و تاریک قبر بھی ہمیں مل جاتی تو ہم اس میں سو جانے کے لئے تیار تھے۔ شدید پیاس سے حلق سوکھ گئے تھے اور زبان پر جیسے کانٹے اگ آئے تھے۔ آخر ایک بڑی سی عمارت نظر آئی جو کافی دور تھی۔ ایک چھوٹی سی نہر کھیتوں کو سیراب کرتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں رکے اور جی بھر کر پانی پیا اور عمارت کی جانب دیکھنے لگے۔

”اگر یہاں ہمیں آرام کے لئے جگہ مل جائے تو لطف ہی آ جائے۔“

یہ عمارت ایک اسکول کی عمارت تھی اور یہاں ہمیں پناہ نہیں مل سکتی تھی۔ پھر تھوڑی ہی دور آگے گئے تھے کہ ایک پائپ لائن نظر آئی۔ بڑے بڑے پائپ نیچے پڑے ہوئے تھے اور شاید کافی عرصے سے پڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ ان کے اندر مٹی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ یہ ہمارے آرام کے لئے اعلیٰ ترین جگہ تھی۔ چنانچہ ہم ایک بڑے پائپ میں گھس گئے۔ تھیلے ہم نے سر کے نیچے رکھ لئے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد ہماری پلکیں جڑ گئیں۔ ہر چند کہ سخت سردی تھی اور بدن کانپ رہے تھے لیکن پھر بھی ہمیں یہاں کافی آرام ملا تھا اور اس کے بعد ہم خوب دن چڑھے تک سوتے رہے اور بہت سکون ملا یہاں سونے سے۔ پھر نجانے کس وقت آنکھ کھلی اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر گہری گہری سانسیں بھری تھیں۔

''ذرا الٹا نام ہے تمہارا۔ کیا نام بتایا تھا تم نے؟''

''کوئی آسان سا نام رکھ لو میرا۔''

''مثلاً؟''

''برک کہہ سکتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''مگر یہ نام۔''

''بس یونہی میرے ذہن میں آ گیا تھا۔'' میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

گیو مسکرانے لگا۔ پھر بولا۔ ''ڈیئر برک! عارضی طور پر یہ قیام گاہ ہمارے لئے بہترین ہے۔ آرام کی نیند سوئے ہیں۔ کسی نے ہماری جانب توجہ بھی نہیں دی۔ اس کا مطلب ہے کہ کچھ وقت یہاں گزار سکتے ہیں۔''

''ہاں۔ اس میں کیا شک ہے۔''

''آؤ پھر کھانے کی تلاش کریں۔''

میں پائپ لائن سے باہر نکل آیا۔ ہم لوگ دور دور تک نگاہیں دوڑانے لگے۔ تقدیر ہمارا بہترین ساتھ دے رہی تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک ایسی جگہ بنی ہوئی تھی جہاں سے ہلکی ہلکی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

''ہاٹ ڈاگ۔'' گیو نے گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا اور ہم دونوں اس جانب چل پڑے۔ بہترین قسم کے ہاٹ ڈاگ نہایت سستی قیمت پر دستیاب ہو گئے تھے۔ پیٹ بھر کر کھائے اور بڑا سکون محسوس ہوا۔ گیو نے کہا۔

''آوارہ گردی بالکل مناسب نہیں ہے۔ پیٹ بھر چکا ہے۔ ہمیں آگے کے لئے منصوبہ بندی کرنی چاہئے۔''

''تو پھر بتاؤ کیا ارادہ ہے؟''

''ظاہر ہے یہاں سے آگے نکلنا ہو گا اور اس کے لئے سیدھی سی بات ہے لمبا سفر کرنا ہو گا۔''

''کوئی خاص منصوبہ ہے ذہن میں؟''

''دوست! برطانیہ جانے کے لئے ہمیں شدید محنت کرنا ہو گی اور ہر طرح کا خطرہ مول لینا ہو گا۔ بہرحال اب دیکھنا یہ ہے کہ یہاں کیا ہوتا ہے۔''

''ہاں، ہمیں انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔''

پھر رات ہم نے اسی پائپ لائن میں گزاری اور اس کے بعد دوسرے دن صبح پھر اپنے لئے زندگی تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ اب یہاں زیادہ وقت نہیں گزارا جا سکتا تھا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا اور گیو نے فیصلہ کیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے ہمیں یہاں سے نکلنا ہو گا۔ یہ چھوٹی سی جگہ ہمارے لئے موزوں نہیں ہے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ یہاں ہم صرف تھوڑی دیر کے لئے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔''

''تو پھر کچھ سوچتے ہیں۔'' گیو نے کہا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ان مسلسل صعوبتوں نے دل و دماغ پر ایک ایسی کھولت اور بے حسی سی سوار کر دی تھی کہ بعض اوقات تو دل چاہتا تھا کہ آنکھیں بند کر کے گہری نیند سو جایا جائے چاہے جگہ کوئی بھی ہو اور حال کچھ بھی ہو۔ اگر اس کیمپ میں ہوتا تو ممکن ہے کچھ آسانیاں فراہم ہو جاتیں لیکن یہاں بھی تقدیر کا ہاتھ تھا کہ گیو مجھے اس طرح نکال لایا اور اب میں یہاں بے یار و مددگار پڑا ہوا تھا۔ نہ مارک کے ذہن میں کچھ تھا نہ میرے ذہن میں۔ بس ہم حالات کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ تو ظاہر ہے کسی ایک جگہ تو وقت نہیں گزارا جا سکتا تھا۔ چنانچہ جب تھکن ہو جاتی تو آوارہ گردی کر لیتے۔ کھانے پینے کی چیزیں دکانوں سے خرید لیا کرتے تھے۔

پھر اس دن ہم ایسے ہی اس جگہ سے گزر رہے تھے کہ اچانک ہی گیو نے کسی کو دیکھا اور ایک دم بے اختیار ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ وہ برق رفتاری

سے بھاگا اور ایک شخص کے قریب پہنچ گیا۔ جس شخص کے قریب وہ پہنچا تھا اس کے کندھے پر جب اس نے ہاتھ رکھے تو وہ اس طرح دہشت زدہ ہو گیا جیسے موت نے اسے دبوچ لیا ہو۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور پھر ہکا بکا سا گیو کو دیکھتا رہا، اس کے بعد وہ گیو سے لپٹ گیا۔ میں نے گہری سانس لی، اس جگہ بھی ایسا کوئی شخص ہے جس سے گیو اس طرح مخاطب ہو سکتا ہے کہ دوسرے اس کی جانب متوجہ ہو جائیں۔ یقیناً کوئی ایسی ہی بات تھی جس سے گیو اتنا متاثر ہوا تھا۔ میں بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب پہنچ گیا۔ وہ شخص مجھے دیکھ کر ایک دم سے دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ گیو نے کہا۔

”نہیں گیرون، یہ دوست ہے۔“

میں نے یہ نام سنا اور میرے دماغ کے سارے خانے روشن ہو گئے۔ گیرون کا نام میرے لئے اجنبی نہیں تھا، یہ وہی شخص تھا جسے گیو کے ساتھ فرار ہونا تھا لیکن اس کی جگہ گیو مجھے گھسیٹ لایا تھا۔ گیرون نے کہا۔

”یار گیو! تم تو بڑے بے مروت اور دھوکے باز نکلے۔“

”پاگل آدمی، یہ بتاؤ تمہارے پاس کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم تینوں یکجا ہو سکیں؟“

”بالکل نہیں، میں کچھ کوششیں کرتا پھر رہا ہوں لیکن کوئی بہتر جگہ نہیں تلاش کر سکا۔ بس کبھی یہاں کبھی وہاں۔“

”تب پھر آؤ ہمارے ساتھ۔“

ابھی تک وہ پائپ لائنیں ہمارے لئے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوئی تھیں۔ کوئی اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ سنسان راستوں سے گزرتے ہوئے آخر کار ہم پائپ لائنوں تک پہنچ گئے۔ گیرون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں یہ جگہ بھی دیکھ چکا ہوں مگر میرے علم میں نہیں تھا کہ یہ تمہارا ہیڈ کوارٹر ہے۔ جگہ ویسے اچھی ہے۔ دور دور تک خاموشی اور سناٹے کا راج رہتا ہے سوائے اس دکان کے جہاں برگر وغیرہ ملتے ہیں۔ لگتا ہے وہ دکان ہمارے لئے کھلی ہوئی ہے۔ اچھا خیر تم سناؤ، کیسے نکلے وہاں سے؟“

”تمہیں کیا ہوا تھا؟ تم تو بالکل اس طرح غائب ہو گئے جیسے مجھے چھوڑ کر بھاگ آئے ہو۔ وہ تو شکر تھا کہ بارش میں وہ لوگ مست ہو گئے تھے اور انہوں نے مجھ پر توجہ نہیں دی تھی۔ میں تمہارا ہی انتظار کرتا رہ گیا تھا۔“

”یار بس گڑبڑ ہو گئی۔“ گیو نے مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ اس کی جگہ میں گیو کے ہاتھ لگ گیا تھا اور گیو رات کی تاریکی میں یہ سوچ کر مجھے باہر نکال لایا تھا کہ یہ گیرون ہے۔ گیرون نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا اور بولا۔

”برٹش ہو نا؟“

”ہاں برٹش ہی سمجھ لو۔“

”تمہارا چہرہ مہرہ تو انگریزوں جیسا ہے لیکن ایک تبدیلی ہے اس میں۔“

”ان کا نام خاقان ہے اور تعلق ہندوستان سے ہے۔“

”وہی تو میں کہتا تھا۔ بہرحال تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ اچھا ہوا تقدیر نے ایک اور شخص کو ہمارا ساتھی بنا دیا۔“

”ان کا تعلق بھی برٹش نیوی سے ہے۔“

”واہ، پھر تو بہت ہی اچھی بات ہے۔“

”مگر دوستو کر کیا رہے ہو یہ بتاؤ۔“

”ابھی کچھ نہیں، صرف اپنی جان بچانے کے خیال سے بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔“

”یہی کوشش تو میں بھی کر رہا ہوں۔ اصل میں اگر ہم یہاں سے نکل کر سویڈن پہنچ جائیں تو زندگی بچ جانے کی امید ہو سکتی ہے۔ میں اس سلسلے میں کوشش کر رہا ہوں۔“

”تم نے کوئی ایسی جگہ تلاش کی ہے؟“

”ہاں، ایک ایسا کیفے ہے جہاں سویڈن کے اکثر ملاح آتے رہتے ہیں اور ان کے ذریعے قسمت آزمائی جا سکتی ہے۔ ویسے تم بھی اپنے آپ کو سویڈن کا باشندہ ہی ظاہر کرنا۔“

گیرون ہمیں سمجھاتا رہا۔ وہ ہمیں جس کیفے میں لے گیا وہ معمولی جگہ نہیں تھی، نہایت سجی سجائی اور روشنیوں سے جگمگاتی ہوئی جگہ تھی۔ وسیع و عریض ہال میں سینکڑوں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اسٹیج پر ایک موسیقار پیانو بجا رہا تھا، بے شمار فوجی آفیسر اور دوسری حسین و جمیل لڑکیاں تھیں۔ کھانا پینا اور خوش گپیاں چل رہی تھیں۔ ہم ایک میز پر بیٹھ گئے اور گیرون نے کھانے پینے کا آرڈر دے دیا۔

”کیا تمہارے پاس مقامی کرنسی ہے؟“

”کافی۔ اور یہ میں نے ایک جرمن کی جیب کاٹ کر حاصل کی ہے۔“

”واہ...... تم ہم سے بہتر زندگی گزار رہے ہو۔“

بہر حال ہم لوگ کافی دیر تک ہوٹل میں وقت گزارتے رہے اور اس کے بعد واپس اپنے ٹھکانے پر آ گئے۔ گیرون کو بھی یہی جگہ غنیمت محسوس ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔

"ایک شخص کو میں نے اپنے جال میں پھانسا ہے۔ تھوڑی بہت رقم بھی دے دی ہے اسے۔ بھلا ہو اس جرمن سرمایہ دار کا جس نے میری بہت بڑی مشکل حل کر دی تھی بہر حال وہ شخص ہمارے یہاں سے نکلنے میں مدد کرے گا۔"

دوسرے دن بہت دیر تک گلیوں اور بازاروں میں گزرتے ہوئے آخر کار ہم ایک کیفے کے سامنے پہنچے اور کیفے میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا شراب خانہ تھا جس میں ٹوٹی پھوٹی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ فرش پر گرد اور کوڑے کے ڈھیر پڑے تھے۔ یہاں ایک شخص نے ہمارے قریب پہنچ کر کہا۔

"آ جاؤ۔ میں کسی حد تک تمہارا کام کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔"

"میری جان! میں تمہیں طے شدہ معاوضے کے علاوہ بھی بہت کچھ دوں گا۔"

"میرا ایک دوست یہاں سے موٹر بوٹ کے ذریعے سویڈن جا رہا ہے۔ میں نے اس سے تمہاری بات کی ہے۔"

"کہاں ہے وہ اس وقت؟"

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا البتہ تمہیں ان کے پاس لے کر جا سکتا ہوں۔ چلنا چاہو تو چلو۔"

"ہاں، ہمیں چلنا چاہئے۔"

بہر حال ہم اس کے ساتھ چل پڑے اور پھر کئی گلی کوچوں، بازاروں میں گھومنے کے بعد وہ ایک مختصر سے مکان پر پہنچ گیا اور پھر وہ ہمیں اندر لے گیا۔ اندر ایک بڑے سے کمرے میں ہم بیٹھ گئے۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ شخص دو آدمیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ یہ دونوں اجنبی کافی قوی ہیکل تھے۔ ایک کے ہاتھ میں لکڑی کا موٹا سا ڈنڈا تھا اور ڈنڈے والا شخص دروازے پر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے پہرہ دے رہا ہو۔ دوسرے شخص نے کہا۔

"ہوں...... تم لوگوں کا تعلق کہاں سے ہے؟"

"سویڈن سے۔"

"نہیں، مجھے بتایا گیا ہے کہ تم برٹین ہو۔"

"آہ...... اگر تمہیں یہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا تعلق برطانیہ سے ہے تو پھر یقیناً بتانے

والے نے ٹھیک ہی بتایا۔ ہم سویڈن جانا چاہتے ہیں۔"

"خیر...... ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ سنا ہے تم بہتر معاوضہ ادا کر سکتے ہو؟"

"اتنا جتنا ممکن ہو سکے۔"

ہمارے درمیان سودے بازی ہوئی اور سودا طے ہو گیا۔ پھر ایک موٹر بوٹ ہم تینوں کو لے کر چل پڑی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس طرح اس بھیانک ماحول سے آزادی مل جائے گی۔ میں اب ان پراسرار قوتوں سے تو مایوس ہو چکا تھا جو میری مدد کرتی رہی تھیں۔ سب ڈرامہ بازی تھی۔ نجانے کیا کیا کھو گیا۔ اگر ان ساری باتوں میں سچائیاں تھیں تو پھر سارے کے سارے کہاں مر گئے؟ کہیں سے کوئی پذیرائی ہی نہیں ہوئی۔

موٹر بوٹ کا سفر آخر کار ختم ہوا اور ہم سویڈن پہنچ گئے۔ یہ دونوں یعنی گیو اور گیرون کمال کے ساتھی ثابت ہوئے۔ بھرپور مدد کی تھی انہوں نے۔ اور پھر مجھے لندن پہنچ کر یہ معلوم ہوا تھا کہ گیو ایک طرح سے شاہی فیملی کا فرد ہے اور لندن میں اچھی طرح صاحب حیثیت تھا۔ اس نے کہا۔

"میرے دوست! ہمارا ساتھ اتنا رہ چکا ہے کہ میں تمہیں اپنا بہترین دوست تصور کرتا ہوں۔ لیکن افسوس میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں ٹھہرا سکتا۔ کچھ ایسے ہی پوشیدہ معاملات ہیں۔ ابھی مجھے عام نگاہوں سے خاصے دن تک روپوش رہنا پڑے گا ورنہ میں تمہیں اپنی قیام گاہ پر لے جاتا۔"

"نہیں گیو! کوئی بات نہیں ہے۔ جتنا وقت تمہارے ساتھ گزرا ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ ہم زندگی میں کبھی نہیں بھولیں گے۔"

"مگر تم یہ مت سمجھنا کہ میں نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ بالکل ہی فکر مت کرو، میں تمہارا بھرپور طریقے سے ساتھ دوں گا۔ میں کسی اچھے سے فائیو اسٹار ہوٹل میں تمہارے لئے بندوبست کرتا ہوں اس کے بعد میں اپنے گھر واپس جاؤں گا۔"

بہر حال ایسا بھی ہوتا ہے۔ مجھے اس وقت یقینی طور پر امداد کی ضرورت تھی۔ بالکل بے یار و مددگار اور بہت ہی گھٹیا انداز میں یہاں پہنچا تھا۔ انگریز بیوقوف نہیں ہوتے۔ میرا مسئلہ بہت خراب تھا۔ چنانچہ اگر کہیں سے مدد مل رہی ہے تو اسے قبول کر لینا کسی بھی طرح ناگزیر تھا۔ اور بہر حال یہ ایک ضروری عمل تھا۔ جبکہ مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ برطانیہ این مورالس کا شہر ہے اور میں این مورالس کا قاتل تھا۔ ہندوستان میں تو خیر میرا داخلہ

ہی بند تھا۔ وہاں کسی بھی جگہ دیکھ لیا جاؤں تو ایک بدترین مجرم کی حیثیت سے سڑک پر ہی شوٹ کر دیا جاؤں گا یا پھر گرفتار کر لیا جاؤں گا اور اس کے بعد زندگی بھر ان انگریزوں سے نجات ملنا میرے لئے انتہائی مشکل تھا۔ چنانچہ گیو کا شکریہ ادا کیا۔ گیو نے میرے لئے خاصی خریداری کی اور آخر کار مجھے ہوٹل ہلٹن میں پانچویں منزل پر ایک کمرہ حاصل ہو گیا جہاں میں برک کی حیثیت سے مقیم ہو گیا۔ میرے پاس عمدہ لباس، ضرورت کی تمام چیزیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہی اچھی خاصی کرنسی موجود تھی۔ گیو نے کہا۔

"میں جا رہا ہوں ڈیئر! اپنے معاملات ٹھیک کرتا ہوں۔ جیسے ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ اب میں تمہیں اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں تو تمہیں ہوٹل سے اپنے گھر لے جاؤں گا اور اس کے بعد ہم فیصلہ کریں گے کہ آگے ہمیں کیا کرنا ہے۔"

"گیو! ہماری ملاقات جن حالات میں ہوئی انہوں نے ہمیں ایک دوسرے کا دوست بنا دیا تھا لیکن میں بھی کوئی چوڑا چمار نہیں ہوں۔ میرا تعلق بھی ہندوستان کی ایک ایسی فیملی سے ہے جس کی زمینداری ناقابل یقین تھی۔ سیتا گڑھی کے علاقے میں اگر خاقان جمشیدی اور اس کے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کرو گے......"

"بس، بس، بس...... کیا ضرورت ہے یہ تمام باتیں کرنے کی۔ انسان کی شخصیت لمحوں میں نظر آ جاتی ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں۔ اپنے آپ کو میرا احسان مند نہ بناؤ۔ دوستوں میں یہ سب کچھ چلتا ہے۔"

بہرحال کافی حد تک سکون نصیب ہوا تھا۔ اب یہ تو بالکل نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں سارے لوگ میرے ہی چکر میں ہوں گے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تھوڑا سا سکون اپنے طور پر بھی اپنے آپ کو دینا تھا۔ خدشات تو کبھی زندگی بھر ساتھ نہیں چھوڑتے۔ کم از کم یہاں مجھے اپنی زندگی پر غور کرنے کا موقع ملا تھا۔ اب تک جتنی آوارہ گردی کرتا رہا تھا اس کے بعد فائیو اسٹار ہلٹن کا شاندار کمرا میرے لئے جنت سے کم نہیں تھا۔ یہاں رہ کر میں اپنے ماضی کی کتاب الٹ سکتا تھا۔ ہوٹل کے کمرے سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا میں نے۔ اپنے بستر پر لیٹا آرام سے سوچوں میں ڈوبا رہتا تھا۔ میری سوچوں کا آغاز اس جگہ سے ہوتا تھا جہاں میرے والد ہمدان جمشیدی نے مجھے اپنا دست راست بنا لیا تھا اور پھر شکار کی زندگی میں وقت بسر کر رہے تھے۔ وہ لمحات جب ہم اس تنہا مندر میں پہنچے تھے جس کا نام دھرم شوالہ تھا اور شو جی کے مندر میں وہ واقعہ میرے ساتھ پیش

آیا تھا۔ آہ...... وہیں سے تو گڑبڑ کا آغاز ہوا تھا۔ شو کے مجسمے کی آغوش میں کیا لیٹا کہ جون ہی بدل گئی اور اس کے بعد ان لوگوں کے جال میں پھنس گیا۔ مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آتی تھی، بدھ مذہب بھی اعلیٰ تعلیمات کا حامل ہے۔ وردان سادھانی، سیوک سندھورتی اور وہ تمام لوگ جو مجھے ملے تھے انہوں نے تلقین تو یہی کی تھی کہ میں برائیوں سے بچوں لیکن انداز کچھ عجیب سا تھا۔ مجھے ہر جگہ موقع دیا گیا تھا کہ اگر میں کبھی کسی برائی میں پھنس سکتا ہوں تو ضرور پھنسوں اور اس کی وجہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آتی تھی۔

پھر اس کے بعد کلکتے میں تعلیمی زندگی، پھر ایلس فیوری جس نے صحیح معنوں میں مجھے زندگی کی لذتوں سے روشناس کرایا تھا۔ آہ...... جوانی کا ایک دور کیا دور ہوتا ہے۔ انسان لاکھ ایسے حالات سے بچنے کی کوشش کرے لیکن کہاں بچتا ہے۔ اور پھر سچی بات یہ ہے کہ بچنے کی کوشش کرنی بھی نہیں چاہئے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ زندگی کے یہی چار دن تو ہوتے ہیں اور ان چار دنوں میں مجھے جتنے افراد ملے تھے انہوں نے زندگی کی ایسی ہی کہانیوں سے روشناس کرایا تھا۔ کون کون سے کردار نہیں ملے تھے مجھے اور کس کس نے کیا نہیں سکھا ڈالا تھا۔ کمال کی بات تھی۔ واقعی بڑے کمال کی بات تھی۔ نجانے کون کون۔ آدم زمان، عالیہ زمان، ایلس فیوری اور اس کے بعد امینہ...... اور وہ بہت سے کردار......

ادھر کلاڈیا اپنے طور پر نجانے کیا کیا مجھے سمجھانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ یہ کلاڈیا کیا بلا تھی یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ بظاہر تو اس کا انداز بڑا پراسرار سا تھا جیسے وہ خود بھی انوکھے علوم کی مالک ہو لیکن معمول کے مطابق سب کے سب غائب ہو گئے تھے۔

بہرحال ہلٹن ہوٹل میں خوب عیش و عشرت کر رہا تھا اور وقت گزاری کر رہا تھا۔ عارضی طور پر گیو پر ہی بھروسہ کرنا تھا کیونکہ وہ ابھی تک اچھا دوست ثابت ہوا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ صاحب اختیار تھا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے میرے لئے کہ مجھے آئندہ زندگی میں کیا کرنا چاہئے۔ اصولی طور پر تو یہی ہونا چاہئے تھا کہ کہیں بھی زندگی کے بقیہ ایام گزار لیتا۔ سیتا گڑھی جانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اور پھر ماں باپ نہیں تھے۔ قرب و جوار کے رشتے داروں کو بھلا اتنی تڑپ کہاں ہوتی ہے۔ سب کے سب مجھے بھول بھی چکے ہوں گے۔ کیا فائدہ ان کے درمیان جانے کا۔ دل میں ایک ہی خیال آیا کہ گیو سے کہوں گا کہ یہیں لندن میں میرے لئے کوئی بندوبست کر دے، کسی بھی گوشے میں پڑ کر زندگی گزار لوں گا۔ اور اگر ہو سکا تو اپنے مستقبل کے لئے کسی ساتھی کا بندوبست

بھی کرلوں گا۔ جولوگ میری زندگی میں آئے تھے وہ تو اتنی دور نکل گئے کہ اب ان سے ملاقات کا دوبارہ تصور بھی ممکن نہیں۔ تو پھر اس زندگی میں ایسا اچھا ساتھی جو مجھے ایک خوبصورت مستقبل دے سکے۔ دل میں کئی بار ہیگ کا خیال بھی آیا تھا۔ کمبخت کس قدر صاحبِ اختیار ہے۔ ہر جگہ پہنچ جاتا ہے۔ لیکن کوشش یہی کروں گا کہ اب اس کا سامنا کرنے سے گریز کروں۔ اسکندریہ میں اس کی کتنی قوت تھی۔ نچا کر رکھ دیا تھا بدبخت نے۔ وہ شکر ہے کہ لوح میرے ہاتھ لگ گئی اور اس کے بعد وہ وردان سادھانی تک پہنچ گئی ورنہ نجانے کتنا لمبا چکر چلتا رہتا۔ ہیگ کو واقعی بڑی شکست ہوئی تھی۔ اس نے تو یہ سوچا تھا کہ اب وہ لمحات آگئے ہیں جب لوح کی کہانی منظر عام پر آجائے گی اور ہوسکتا ہے وہ اسے حاصل بھی ہو جائے۔ حالانکہ لوح جن پراسرار لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی ان سے اسے حاصل کر لینا ایک مشکل کام تھا۔ لیکن ہیگ کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ وہ خود بھی اعلیٰ ترین وسائل کا حامل اور کمبخت ایک ہپناٹسٹ تھا۔

دماغ کی چولیں ہل جاتی تھیں جب ان تمام باتوں کو سوچتا تھا۔ اس دن کمرے میں پڑے ہوئے مجھے چوتھا دن تھا۔ میں نے سوچا کہ اب اس طرح گھسے رہنا مناسب نہیں ہے۔ ہوٹل کے ویٹر وغیرہ بھی اب مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ لازمی طور پر سوچتے ہوں گے کہ یہ کیسا گاہک ہے یا کیسا مسافر ہے جو کمرے سے باہر ہی نہیں نکلتا۔ اپنے آپ کو دوسروں کی توجہ سے ہٹانے کے لئے بھی اپنے اندر تھوڑی بہت تبدیلی کرنا ضروری تھا۔

بہرحال میں نے لباس وغیرہ تبدیل کیا اور اس کے بعد لفٹ سے نیچے کی منزل پر آگیا۔ لیکن یہاں رکنے کی بجائے میں نے باہر جانا مناسب سمجھا۔ ہوا حیرت انگیز طور پر تیز چل رہی تھی اور لوگ اس سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر درخت لگے ہوئے تھے۔ چوڑے پتوں والے یہ درخت ہوا سے ہل رہے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر سوئمنگ پول تھا جہاں خاصا رش تھا۔ لیکن میں اس سے بالکل مختلف سمت چل پڑا۔ حالانکہ سوئمنگ پول کے ساتھ اس وقت حسن و جوانی کا سیلاب بہہ رہا تھا۔

رنگین لباس، چمکدار بدن، نقرئی قہقہے۔ یہ بڑا دلکش ماحول تھا۔ لیکن طبیعت پر کچھ ایسا جمود سوار تھا کہ میں نے دور سے اس ماحول کو دیکھنا چاہا اور درختوں کے نیچے پہنچ گیا۔ تیز ہوا سے درختوں کے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہے تھے۔ پھر میں ایک درخت سے کمر

لگائے دونوں ہاتھ سینے کے قریب باندھے دور سوئمنگ پول پر اٹکھیلیاں کرتے ہوئے انسانوں کو دیکھ رہا تھا کہ ایک عجیب سی خوشبو میری ناک سے ٹکرائی اور ایک پتہ میرے چہرے سے آکر چپک گیا۔ میں نے اسے ہاتھ سے اٹھا کر حیرت سے دیکھا۔ ویسے تو پتے اڑ ہی رہے تھے لیکن چمپا کی وہ خوشبو جو میرے نتھنوں سے ٹکرائی تھی میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ یہ وہی بھوج پتر تھا جو کئی بار میری نگاہوں کے سامنے آچکا تھا۔ اسی سے یہ خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میرے سارے وجود میں ایک چھپا کا سا ہوا۔

اس بھوج پتر کا میری زندگی سے بہت گہرا تعلق تھا اور اب تک میں اسے نفرت سے ٹھکراتا ہی چلا آیا تھا۔ لیکن اس وقت...... اس وقت میرا نظریہ ایک دم تبدیل ہو گیا۔ میں نے اسے نگاہوں کے سامنے کیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ بھوج پتر پر ایک تصویر ابھرتی آ رہی تھی۔ ایک خوبصورت عورت کا پُروقار چہرہ جس کی عمر پینتالیس سال سے کم نہیں ہوگی لیکن ایسا حسین نقش و نگار والا چہرہ بہت کم دیکھنے میں آتا تھا۔ بڑی بڑی دلکش آنکھیں میری ہی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ بس ایک لمحے کے لئے یہ چہرہ بھوج پتر پر ابھرا اور اس کے بعد میری نگاہوں سے معدوم ہو گیا۔ بھوج پتر پر اب تک جتنے نقوش ابھرے تھے ان میں سے ہر نقش میں ایک کہانی چھپی ہوئی تھی اور اتنی سچی کہانی کہ اس سے انکار ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ عورت کون ہے اور کیا اب اس سے میرا تعارف بھی کسی نہ کسی شکل میں ہونے والا ہے؟ میں نے بھوج پتر کو اپنے چہرے کے سامنے رکھا۔ پتہ نہیں کس طرح کی کیفیت میرے دل پر آ رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دوں۔ مگر اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ اپنی سوچی ہوئی ایک اور بات بھی میرے ذہن میں تھی۔ کچھ وقت پہلے میں نے ایک دفعہ سوچا تھا کہ اب اگر یہ لوگ میرے قریب آئے جیسے وردان سادھانی، سیوک سندھورتی یا اسی طرح کا اور کوئی کردار جیسے ماشرہ یا اشمبھ کرھانی تو میں ان سے رابطہ کروں گا اور اب تک جو ان کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی ہے تو اب اس پر توجہ دینے کی کوشش بھی کروں گا۔ اگر ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ کم از کم زندگی کی صعوبتوں سے تو نجات ملے۔ چنانچہ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بھوج پتر کو اپنے لباس میں چھپا لیا۔ ایسا میں نے پہلی بار کیا تھا۔

میری توجہ اب سوئمنگ پول پر نہانے والوں سے ہٹ گئی تھی اور میں نجانے کیوں اس

بھوج پتر کے مل جانے سے ایک انوکھی سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ گویا اس کے ذریعے زندگی کا رخ تھوڑا سا بدل سکتا ہے۔ کچھ ہو سکتا ہے۔ یقیناً کچھ ہو سکتا ہے۔ میں نے سینے کے پاس اسے تھپتھپا کر دیکھا۔ وہ عام پتا نہیں تھا۔ اس میں ایک خاص بات تھی اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ چمپا کی خوشبو اس سے مسلسل اٹھتی رہتی تھی۔ پھر اس کے بعد وہاں جی نہ لگا اور میں چونکہ تین چار دن تک کمرے میں قید رہا تھا اس لئے چہل قدمی کرنے لگا۔ ہوٹل کا بیرونی حصہ بھی کافی وسیع تھا۔ اگر اس کے احاطے ہی کا ایک چکر لگا لیا جائے تو اچھی خاصی ورزش ہو جائے گی۔ ایک سنسان سے گوشے میں جا کر میں نے بھوج پتر کو پھر سے نکالا اور دیکھا۔ میری نگاہیں اس پر اب بھی وہی چہرہ تلاش کر رہی تھیں جو میں نے دیکھا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس چہرے سے میرا کیا تعلق ہے۔ یہ حسین عورت جو شکل و صورت سے ہندوستانی ہی لگی تھی کیا میرے ہاتھوں قتل ہونے والی ہے؟ حالانکہ بھوج پتر پر اس کی موت کا منظر نہیں ابھرا تھا۔ اس کا مطلب ہے کوئی اور معاملہ ہے۔ مگر یہ کون ہے اور کہاں ہے؟ بھوج پتر پر دوبارہ یہ چہرہ نہیں ابھرا تھا لیکن میں چشم تصور سے ان نقوش کا جائزہ لے رہا تھا۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی اور پھر میں نے گردن جھٹک کر خود کو پرسکون کر لیا۔

میری زندگی کے ہزاروں واقعات ایسے تھے جن میں میری قوت ارادی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ بس جو ہونا تھا وہ ہو گیا تھا۔ میرا ایمان جیسا بھی تھا وہ ایک الگ بات ہے لیکن اتنا ضرور ہوا تھا کہ میں خود کو تقدیر کے دھارے پر چھوڑ دیا کرتا تھا اور یہ مجھے یقین تھا کہ تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا اور تقدیر لکھنے والی ذاتِ باری ہوتی ہے۔ گویا میرا ایمان نادانستہ طور پر ہی صحیح سلامت تھا چنانچہ میں نے اپنے ذہن کو حالات سے آزاد کر دیا۔

بھوج پتر پر نظر آنے والے نقوش جن کی حیثیت کچھ بھی ہو اپنی جگہ سچ ہوا کرتے تھے اور اگر یہ سچ میرے سامنے آیا تو پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے آپ کو یہ دلاسا دے کر میں نے مطمئن کر لیا اور اس طرح وقت گزرنے لگا۔

پھر شام جھک آئی اور باہر کی رونقیں سمٹ کر اندر چلی گئیں۔ فائیو اسٹار ہوٹل ہالز کے مختلف فلور تھے اور بہت سے فلورز پر مختلف قسم کے تفریحی پروگرام ہوا کرتے تھے۔ میں

کارڈ روم کی طرف چل پڑا۔ کارڈ روم میں مختلف قسم کے جوئے ہو رہے تھے۔ شوقین مزاج لاکھوں پونڈ کا کھیل کھیل رہے تھے۔ میں بذاتِ خود تو ان چیزوں سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا تھا لیکن زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں مجھے تھوڑی بہت معلومات ضرور حاصل تھیں۔ خاص طور سے اس وقت جب کلکتے میں اپنے بہترین دوستوں کے ساتھ میں بھی تھوڑی بہت تفریحات میں حصہ لیا کرتا تھا۔ رولٹ مشین اور دوسرے اسی طرح کے گیم۔ میں انہیں دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ پھر ایک حسین خوشبو میرے پاس سے گزری اور میری نگاہیں بے اختیار اس طرف اٹھ گئیں۔ یہ خوشبو بہت دیر سے میں اپنے ساتھ ساتھ محسوس کر رہا تھا۔ لیکن میں نے یہی سوچا تھا کہ دولت مند لوگ پرفیوم کا جس طرح استعمال کرتے ہیں چنانچہ اس خوشبو کا یہاں ہونا حیرت انگیز نہیں ہے۔ لیکن اس بار جو میری نگاہ اٹھی تو میرے ذہن میں ایک شدید دھماکا ہوا۔ وہ پراسرار آنکھیں مجھے ہی دیکھ رہی تھیں۔ ایک بہت ہی متناسب جسم کی مالک خاتون، دودھ جیسا سفید چہرہ، بڑی بڑی کالی آنکھیں، انتہائی خوبصورت گھنگھریالے بال۔ حالانکہ عمر کی اس منزل میں تھی جب دوشیزگی کبھی کی رخصت ہو چکی ہوتی ہے بلکہ دو چار دوشیزاؤں کی سرپرست بھی ہو سکتی ہیں وہ۔ لیکن یہ چہرہ بھوج پتر پر نظر آنے والا چہرہ تھا اور پراسرار حسین آنکھیں میری ہی جانب متوجہ تھیں۔ اس بات کا تو خیر مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ بھوج پتر پر جو چہرہ نظر آیا ہے اس کا کچھ نہ کچھ تعلق مجھ سے ضرور ہے لیکن اتنی جلدی یہ چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آ جائے گا یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔ لباس بھی ہندوستانی ہی تھا۔ اعلیٰ درجے کی سفید سلک کی ساڑھی جس پر ہلکا سا کام بنا ہوا تھا، کاندھوں پر پشمینے کی انتہائی خوبصورت شال۔ میں چونک پڑا۔ ان تمام سوچوں نے مجھے کچھ لمحوں کے لئے ماحول سے بیگانہ کر دیا تھا۔ لیکن جب اس کے قدم میری جانب بڑھے تو میں چونک پڑا۔ وہ میرے قریب پہنچ کر آہستہ سے بولی۔

”ہیلو۔“

”ہیلو میڈم۔“ میں نے بھی کہا۔

”ایک سوال کروں۔ برا تو نہیں مانو گے؟“ اتنی حسین اور مترنم آواز تھی کہ سننے سے تعلق رکھتی تھی۔

میں نے کہا۔ ”نہیں، میں برا نہیں مانوں گا۔ آپ کیجئے سوال۔“

"کیا تم ہندوستانی ہو؟"

"جی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"اوہ...... ایک ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے کیا میں تمہیں تھوڑی دیر کے لئے اپنے پاس دعوت دے سکتی ہوں؟"

"ضرور۔"

"بہت دیر سے دیکھ رہی ہوں کہ تم کھیل نہیں رہے، صرف ایک تماشائی کی حیثیت سے ہر چیز کو دیکھتے پھر رہے ہو۔"

"مجھے کھیلنا نہیں آتا۔ اور نہ میرے دل میں کھیلنے کی خواہش ہے۔"

"پھر تو ویری گڈ۔ آؤ یہاں سے چلتے ہیں۔ یہاں شور زیادہ ہے۔ نیچے کی منزل میں ایک بہت ہی پُرسکون گوشہ ہے، وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔" اس نے مجھے دعوت دی اور میں بغیر حیل و حجت کے اس کے ساتھ چل پڑا۔ لفٹ سے نیچے کی منزل پر جاتے ہوئے اس نے کہا۔

"میرا نام سریتا ہے۔ چندی گڑھ سے میرا تعلق ہے۔ تمہارا نام پوچھ سکتی ہوں؟"

"خاقان جمشیدی۔ سیتا گڑھی کا رہنے والا ہوں۔"

"آہ......تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ اور مزید یہ جان کر کہ تم خاقان جمشیدی ہو۔"

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"بتا دوں گی۔ ادھر آؤ۔" اس نے کہا اور واقعی جس گوشے میں وہ مجھے لے کر آئی وہ بہت ہی پُرسکون تھا۔ یہاں بہت خوبصورت گلاس لگے ہوئے تھے اور اس کی دوسری طرف سے سوئمنگ پول کا منظر نظر آتا تھا۔

"کیسی جگہ ہے؟" اس نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"واقعی جیسا آپ نے کہا۔"

"خاقان جمشیدی! میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ تم خاقان جمشیدی ہو؟"

"جی۔"

"دراصل میں ایک مسلمان خاندان سے تمہارا تعلق ہے۔ مجھے مسلمانوں کے بارے میں بہت سے تجربے ہیں۔ مذہباً ہی سہی، یہ لوگ قول و فعل کے پابند اور دوستوں کے دوست

ہوتے ہیں۔ دشمنوں سے تو خیر ہر کوئی دشمنی کرتا ہے لیکن اگر کسی اچھے مسلمان کی دوستی حاصل ہو جائے تو یہ سمجھ لو کہ بہت سے مسائل کا حل ہوتا ہے۔ میرا تجربہ ہے۔"

"حالانکہ میں ایک مذہبی آدمی نہیں ہوں۔ لیکن انسانی فطرت کے تحت مجھے آپ کے یہ جملے پسند آئے ہیں۔"

"گڈ۔ خاقان جمشیدی! میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میرا نام سریتا ہے۔ لوگ مجھے سریتا دیوی کہتے ہیں۔ چندی گڑھ کے شمالی علاقے میں ایک چھوٹی سی ریاست قولی ہے۔ میں قولی کی رہنے والی ہوں اور تم یہ سمجھ لو کہ اس ریاست کی رانی ہوں۔"

"اوہو...... رانی سریتا دیوی۔" میں نے خوش مزاجی سے کہا۔

"تم مجھے ایسا نہ کہو۔ میں جو کچھ بھی ہوں لیکن بہرحال انسان تو ہوں۔ اور اگر کوئی انسان یہ کہہ دے کہ وہ کبھی مصیبت میں نہیں پھنسا تو بڑا تعجب ہوگا اس بارے میں کیونکہ ایسا عموماً ہوتا نہیں ہے۔ وہ کسی بھی حیثیت کا مالک ہو کبھی نہ کبھی کسی ایسی مشکل میں گرفتار ضرور ہو جاتا ہے جو اس کے لئے کنٹرول میں نہ آنے والی ہو۔"

"جی۔ ایسا ہوتا ہے اکثر۔"

"خاقان جمشیدی! اب ذرا اپنا مکمل تعارف کرا دو۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ انگلینڈ میں ہی رہتے ہو؟ پڑھنے کے لئے یہاں آئے ہو؟ کیونکہ شکل و صورت سے تم بس ایک اسٹوڈنٹ معلوم ہوتے ہو۔ البتہ یہ ذرا سی تبدیلی ہے کہ تعلیم حاصل کرنے والا کوئی اسٹوڈنٹ اس طرح کے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں دیکھا جائے۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات؟"

"جی کوشش کر رہا ہوں۔"

"ہاں، مجھے اندازہ ہے کہ میرے الفاظ بے ربط ہیں اور جب تک میں اپنے بارے میں تمام حقیقتیں نمایاں نہیں کروں گی میں جانتی ہوں کہ تم اصل بات کو نہیں سمجھ پاؤ گے۔"

"شاید۔" میں نے مدھم لہجے میں کہا۔ میں اس عورت کا بھرپور طریقے سے جائزہ لے رہا تھا اور میرے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑتا جا رہا تھا کہ وہ کسی خاص وجہ سے میری جانب متوجہ ہوئی ہے۔ بھوج پتر پر یہ نقش بلاوجہ نہیں ابھرا تھا۔ ہمارے درمیان کوئی یقینی ربط قائم ہونے والا تھا اور میں نے اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کر لیا تھا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔

"دیکھو...... ایک بات کہوں تم سے۔ میں تمہیں جذباتی طور پر متاثر نہیں کرنا چاہتی۔

بڑی ٹھوس سی بات کہہ رہی ہوں جو سچائی ہے۔ میری عمر چھیالیس سال ہے اور تم ہر طرح سے میرے بیٹے کے برابر ہو۔ بے شک میرے بیٹے نہیں ہو لیکن میں اگر چاہوں تو بڑی بے تکلفی سے تمہیں بیٹا کہہ سکتی ہوں۔ اصل میں یہ دنیا بڑی عجیب ہے اور پھر خاص طور سے لندن کے اس ماحول میں رشتے ناتے، اقدار بڑی معمولی سی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ یہاں رشتے ناتوں کا احترام نہیں ہے لیکن جدید نسل اقدار چھوڑتی جا رہی ہے چنانچہ کہیں بھی کوئی برائی کسی بھی شکل میں منظر عام پر آ سکتی ہے۔ یہ نہ بھی آئے تو انسان اس کے بارے میں سوچ سکتا ہے جو لندن سے واقف ہو۔ ہمارا اپنا ایک کلچر ہے۔ ہمارے ہاں کچھ عمروں کے معیار بھی ہیں۔ ہم رشتوں کی بات چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لئے بیٹے! میں تمہیں کھل کر بتاؤں، نہ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہتی ہوں نہ میرے ذہن میں تمہارے لئے کوئی برائی آ سکتی ہے۔ ہاں...... یہ میں ضرور کہوں گی کہ میں ایک خاص وجہ سے تمہاری جانب متوجہ ہوئی ہوں اور اس کی وجہ تمہارے دلکش نقوش اور تمہاری پُر وقار شخصیت ہے۔ یقین کرو اسے بھی خوشامد مت سمجھنا، کچھ حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے لئے دوسری اور تیسری ملاقاتوں کا انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ میں اب بھی واضح الفاظ کہوں گی تم سے کہ میں بے ربط گفتگو کر رہی ہوں۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے میڈم۔"

"مجھے میڈم مت کہو۔" وہ بولی۔

"پھر کیا کہوں؟"

"آنٹی کہو۔"

"بہتر۔"

"شکریہ۔" وہ پُر خیال انداز میں گردن ہلانے لگی، پھر بولی۔ "اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گے؟ دیکھو، میں نے تم سے کہا تھا کہ لندن کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں کسی کا پایا جانا یہ ظاہر تو کرتا ہے کہ وہ اسٹوڈنٹ نہیں ہے اور اگر ہے تو کسی راجے مہاراجے کا ہے۔ سیتا گڑھی کے بارے میں، میں زیادہ نہیں جانتی کیونکہ چندی گڑھ اور سیتا گڑھی کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہے۔ لیکن بہرحال مجھے اس سوال کا جواب دو، سیتا گڑھی میں تمہارے والدین کیا کرتے تھے؟"

"ہمدان جمشیدی بہت بڑے زمیندار اور شکاری تھے۔"

"کہا تھا نا میں نے کہ تم کسی معمولی حیثیت کے مالک نہیں ہو۔"

"مگر میں ایک معمولی حیثیت کا مالک ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ ہندوستانی ہیں اور ویسے بھی آپ جس انداز میں مجھ سے پیش آئی ہیں اس میں انسانیت اور شرافت کی جھلکیاں ہیں۔ پھر میری بزرگ ہیں۔ اور آپ نے مجھے خود اس کا موقع دیا ہے کہ میں آپ کو آنٹی کہوں۔ اس کے علاوہ آنٹی! اتنا تنہا ہوں میں کہ صحیح معنوں میں کوئی ہمدرد، کوئی ایسا ساتھی نہیں ہے کہ جس کے سامنے سچ بول سکوں۔ جھوٹ کی زندگی گزارنی پڑ رہی ہے۔ سچ بولنا چاہتا ہوں لیکن اس امید پر کہ میرے اس سچ کو میرے لئے عذاب کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔"

سریتا دیوی حیرت سے مجھے دیکھتی رہی، پھر بولی۔ "نہیں بیٹا! اگر تمہیں کسی بھی شکل میں میری ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔"

"نہیں سریتا دیوی! بس ایسے ہی۔ آپ یوں سمجھئے کہ کچھ ایسے عجیب و غریب چکر میں پھنسا کہ پنپ ہی نہ سکا۔ کلکتے میں تعلیم حاصل کی، وہیں سے منشیات کے اسمگلروں کے چکر میں پھنس گیا۔ نجانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا۔ جرمنی میں قید ہوا۔ اس سے پہلے اسکندریہ میں ان لوگوں نے مجھے فٹ بال بنائے رکھا۔ اور پھر اس کے بعد بڑی مشکل سے یہاں تک آیا۔ کچھ لوگوں نے دوستی کا ثبوت دے کر مجھے یہاں تک پہنچا دیا۔ ہندوستان میں مجھ پر کچھ انگریز افسروں کو قتل کرنے کا الزام ہے۔ میں نے انہیں قتل نہیں کیا لیکن میرے خلاف اس طرح ٹھوس ثبوت تیار کر دیئے گئے کہ میرے علاوہ قاتل کا جرم کسی اور پر چسپاں نہیں کیا جا سکا۔ چنانچہ وہاں سے نکل بھاگا اور اب یہاں بھٹک رہا ہوں۔ مستقبل میرے لئے ایک تاریک سفر ہے۔"

وہ خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی اور اس کے بعد اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میرا نام سریتا دیوی ہے اور جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ ایک چھوٹی سی ریاست قولی کی مکمل حکمران ہوں اور وہاں میرے راستوں میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اگر تم میرا ساتھ دو خاقان جمشیدی! تو میں تمہیں اپنے ساتھ ہندوستان بھی لے جاؤں گی اور ہر طرح سے تمہاری مدد کروں گی۔"

"میں نے عرض کیا نا آنٹی! کہ ہندوستان میرے لئے بارود کا ڈھیر ہے۔"

اس نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور بولی۔ ''نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''جب تم آنٹی کے بھانجے کہلاؤ گے تو بارود کا کوئی ڈھیر تمہارا راستہ نہیں روکے گا۔ میرا تم سے وعدہ ہے۔ میں تمہیں ہندوستان لے جاؤں گی اور وہاں تمہیں اپنے بھانجے کی حیثیت سے رکھوں گی۔ کیا سمجھے؟''

''جی۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

''سمجھ لو کہ یہ پیشکش میں نجانے کتنی ملاقاتوں کے بعد تمہیں کرتی۔ لیکن وقت نے کہانی ترتیب دے دی ہے اور جس طرح سے میری تم سے ملاقات ہو گئی ہے اس سے فاصلے لمحوں میں طے ہو گئے ہیں۔ میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔ جو حالات تم نے مجھے سنائے کیا ان میں تم میرا ساتھ دے سکتے ہو؟''

''آپ دیکھ لیجیے۔ جس طرح آپ پسند کریں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اگر سوچنے کے لئے وقت چاہتے ہو تو سوچ لو۔ مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن میں تمہیں ایک بات بتاؤں، نہ سوچو تو بہتر ہے۔ تم نے جو حالات مجھے سنائے ہیں ان میں بیشتر لمحات ایسے آئے ہوں گے جب صورتحال تمہارے بس میں نہ رہی ہو گی اور تم نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا ہوگا۔ آج بھی ایسا ہی کرو، اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دو۔ زندگی ایک خطرے کا نام ہے اور اگر یہ خطرات اپنے لئے آسان بنا لئے جائیں تو زندگی گزارنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی۔ انسان خطروں کا کھلاڑی بن جاتا ہے۔ بولو کیا کہتے ہو؟''

''آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟''

''تمہیں ایک ایسا کردار دینا چاہتی ہوں جو تم نہیں ہو۔ تمہیں میرے ساتھ وہ کردار بن کر میری کچھ مشکلوں میں ساتھ دینا پڑے گا اور اس کے لئے تمہیں تھوڑے سے خطرات بھی پیش آ سکتے ہیں۔''

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے دل میں سوچا کہ بی بی! بھوج پتر پر تمہاری تصویر کا ابھرنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ میرا تم سے گہرا تعلق ہر قیمت پر ہونے ہی والا ہے۔ میں بھی تمہارے کسی کام کے لئے تیار ہوتے ہوئے میں بھوج پتر کا سہارا ضرور لوں گا۔ میں نے اس سے کہا۔

''آنٹی! آپ اسی ہوٹل میں مقیم ہیں؟''

''بالکل نہیں۔ لیکن یہاں میرا کمرہ موجود ہے اور اس وقت میں یہیں گزارا کر رہی ہوں۔ جبکہ یہاں لندن میں لیگ ڈسٹرکٹ نامی علاقے میں میرا ایک فارم ہاؤس موجود ہے جہاں قولی کے چند افراد مستقل مقیم رہتے ہیں۔ جب بھی میں یہاں آتی ہوں وہ میرا استقبال کرتے ہیں۔ میرے اعتماد کے لوگ ہیں۔ میرا ایک بھتیجا بھی یہاں رہتا تھا۔ لیکن...... لیکن......'' وہ خاموش ہو گئی۔

بہرحال ایک پراسرار کہانی وجود میں آئی تھی اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ضرور اس کہانی کا ایک کردار بنوں گا۔ اور ویسے بھی سچی بات ہے کہ میری زندگی کا کوئی مقصد باقی نہیں رہا تھا اور میں نہیں سمجھتا تھا کہ لندن میں میرا آنے والا وقت کیسا ہو گا۔

اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ اگر یہ عورت ٹھیک کہہ رہی ہے تو مجھے بہت سے سہارے مل جائیں گے۔ ورنہ غیر قانونی طور پر لندن جیسی جگہ میں رہنا آسان بات نہیں تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ پھر سریتا دیوی نے میری سوچ کا سلسلہ منقطع کر دیا اور بولیں۔

''کون سی منزل پر مقیم ہو؟''

''پانچویں منزل پر۔''

''میں چھٹی منزل پر ہوں۔ آؤ...... یہاں سے اٹھیں۔ بلکہ میرے کمرے میں ہی چلو۔ وہاں پہنچ کر تفصیلی باتیں ہوں گی۔''

میں نے آمادگی کا اظہار کر دیا اور ہم دونوں اس جگہ سے کچھ کھائے پئے بغیر اٹھ گئے۔ لفٹ نے ہمیں چھٹی منزل پر پہنچا دیا تھا۔

وہ میرے ساتھ راہداری میں چل رہی تھی۔ بہت سے الجھے ہوئے مسئلے تو حل ہو گئے تھے۔ مثلاً یہ کہ میں اسے اگر کوئی برا کردار سمجھتا تو یہ بات اس نے خود ختم کر دی تھی اور مجھ سے ایک مقدس رشتہ جوڑ لیا تھا جو بہرحال کچھ حیثیت کا حامل تھا۔ اس کی چال بھی بڑی پُروقار تھی۔ قد و قامت بہت شاندار۔ حالانکہ اچھی خاصی عمر کی مالک تھی لیکن بدن تناسب اور رکھ رکھاؤ بے حد شاندار تھا۔ ظاہر ہے رانی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ باقی حیثیت کیا ہے۔ لیکن بہرحال اس کی ظاہری شخصیت بنیادی حیثیت رکھتی تھی۔

کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا، اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں اور

پھر کمرے میں داخل ہوگئی۔ دروازہ اس نے اندر سے بند کرلیا تھا۔

"آؤ بیٹھو۔ اچھا اب یہ بتاؤ کیا کھانا پینا ہے؟"

"اصل میں......"

"نہیں، اصل میں کچھ نہیں۔ اگر مجھ پر چھوڑتے ہو تو ہم لوگ کافی لیں گے۔ کیا خیال ہے؟"

"جب آپ کا اپنا ہی فیصلہ ہے تو میرے خیال کے بارے میں سوال کرنا بے معنی ہے۔"

"نہیں، اب ایسا بھی نہیں۔ اگر تم کافی نہ لینا چاہو تو......"

"نہیں، کافی مجھے پسند ہے۔"

اس نے ٹیلی فون کے قریب جا کر روم سروس کو کال کیا۔ کافی کے ساتھ کچھ لوازمات لانے کو کہا اور فون بند کر دیا۔ پھر وہ میرے سامنے صوفے پر آ بیٹھی۔

"خاقان جمشیدی! تھوڑے سے اپنے خاندانی حالات بتاؤ گے؟"

"جتنے بتا چکا ہوں بس اتنا ہی سمجھئے آنٹی! اگر کچھ اضافہ چاہتی ہیں تو اتنا سا کر لیں کہ والد صاحب کے ساتھ سیر و شکار میں زندگی گزاری۔ دوست بنا لیا تھا انہوں نے مجھے اپنا۔ پھر تعلیم کے لئے کلکتہ بھیج دیا۔ وہاں دورانِ تعلیم کچھ ایسے لوگوں سے رابطہ ہو گیا جو میرے حق میں بہتر نہ ثابت ہوئے۔ بات اس سے آگے بڑھی اور کچھ خطرناک اسمگلروں سے رابطہ پڑ گیا۔ انہوں نے مجھے قتل کے الزام میں پھنسا دیا کیونکہ میں ان میں سے ایک شخص کے لئے خطرناک ثابت ہو چکا تھا۔ یہ الزام ایسے ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ مجھ پر عائد کیا گیا تھا کہ میں اس کی تردید نہیں کر سکا۔ نتیجے میں مجھے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ سمندری جہاز کے ذریعے اسکندریہ پہنچ گیا۔ اسکندریہ سے مجھے عجیب و غریب انداز میں جرمنی پہنچا دیا گیا جہاں زندگی لاتعداد خطرات میں گزری اور یوں سمجھ لیجئے کہ موت میرے ساتھ ساتھ آگے پیچھے بھاگتی رہی۔ مگر زندگی کو ہی فتح حاصل ہوئی اور میں لندن آ گیا۔ آپ یہ سمجھ لیجئے کہ لندن میں اس وقت بے یار و مددگار زندگی گزار رہا ہوں اور نہیں کہہ سکتا کہ آنے والا وقت میرے لئے کون سے راستے منتخب کر سکتا ہے۔"

"میں تمہیں یہ پیشکش کر چکی ہوں مائی ڈیئر سن! کہ اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو اور اپنے مستقبل سے بے فکر ہو جاؤ۔ اگر دولت کی بات کرتے ہو تو میں ایک ریاست کی

رانی ہوں۔ دولت میرے لئے ایک بے حقیقت شے ہے۔ اگر تحفظ کی بات کرتے ہو تو ریاست تولی میں جا کر تمہیں صرف وہ سمجھا جائے گا جو میں بیان دوں گی۔ بولو منظور ہے یہ؟ ایک سوال اور۔"

"جی آنٹی۔" میں نے کہا۔ ایک لمحے کے اندر میرا ذہن سوچ میں ڈوبا تھا اور میں نے دل میں سوچا تھا کہ اگر اس عورت کے ذریعے واقعی ہندوستان تک پہنچا جائے تو باہر کی اس دنیا سے نجات حاصل کر لوں گا جو میرے لئے اب کچھ بھی نہیں رہی تھی۔

"کسی سے عشق کرتے ہو؟" اس نے سوال کیا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھنے لگی۔

"نہیں۔"

"سچ کی بات ہو رہی ہے۔ ہم لوگ اس وقت تک ایک دوسرے سے بالکل سچ بولیں گے جب تک کہ یہ سچ ہمارے لئے مشکل نہ بن جائے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے گردن ہلائی۔

"عشق کرتے ہو کسی سے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"کچھ عوامل ایسے ہی تھے۔"

"بچپن میں بھی نہیں کیا؟"

"بالکل نہیں۔"

"کیا علیحدگی پسند ہو؟"

"نہیں۔"

"اور اگر مصلحتاً کسی لڑکی سے فلرٹ کرنا پڑے تو؟"

"کر لوں گا۔"

"کسی محبوبہ کی موت کا غم ہے؟" وہ عجیب و غریب سوالات کر رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے میرے ذہن میں امینہ داخل ہوئی۔ محبوبہ تو خیر نہیں تھی وہ میری لیکن پھر بھی میرا دل اس کی جانب راغب رہا تھا اور اس کی موت کا مجھے دلی صدمہ تھا۔ لیکن رات گئی بات گئی والی بات تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی۔

"نہیں، میں آپ سے کہہ چکا ہوں، محبوب تو زندگی کی بہت سی چیزیں ہو سکتی ہیں لیکن کوئی بھی چیز دل کا روگ بن جائے، ایسا نہیں ہوا۔"

"ویری گڈ۔ اس کا مطلب ہے سخت گیر اور سخت مزاج ہو۔"

"کیوں اس کا یہ مطلب کیسے ہوا؟"

"اپنے تجربے کی بات کر رہی ہوں۔"

"آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے؟"

"یہی کہ جو لوگ حسن سے متاثر نہیں ہوتے وہ تھوڑے سے غیر انسانی صفات کے مالک ہوتے ہیں۔"

"تو آپ مجھے غیر انسانی صفات کا مالک سمجھتی ہیں؟"

"تمہاری گفتگو کی روشنی میں۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میں حسن سے متاثر نہیں ہوتا۔"

"ہوتے ہو؟"

"جی بالکل۔ اب جیسے آپ۔"

"میں......؟"

"ہاں...... آپ یقین کیجئے کہ میں نے آپ کے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں سوچا کہ جوانی میں آپ ایسی ہوں گی، ویسی ہوں گی۔ لیکن آپ اس وقت جو کچھ ہیں وہ بھی بہت کچھ ہے۔"

"شریر لڑکے! شرارتیں مجھے پسند نہیں۔"

"یہ شرارت نہیں ہے۔ یہ تو سچائی ہے۔ آپ نے خود ہی کہا ہے کہ ہمارے درمیان سچ رہے گا جب تک کہ وہ سچ کسی کے لئے مشکل نہ بن جائے۔"

"ارے واہ...... تمہاری صلاحیتیں تو کھل رہی ہیں۔"

اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی اور ویٹر مطلوبہ اشیاء لے کر اندر آ گیا۔ ویٹر کے واپس جانے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے پھر دروازہ بند کر دیا۔

"ہاں، ہمارے درمیان جو گفتگو تھی وہ روا روی کی گفتگو تھی۔ کیونکہ میں انتظار کر رہی تھی کہ ویٹر آ جائے۔ اصل بات میں اس کے بعد شروع کرنا چاہتی تھی۔"

"جی آنٹی؟"

"ٹھہرو، میں تمہارے لئے کافی بناؤں۔"

میں نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ اس نے کافی بنا کر باقی چیزیں میرے سامنے کیں اور بولی۔ "بلا تکلف لو۔ کھانے پینے کی عمر ہے، اس سے گریز مت کرو۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کاجو کے دانے اٹھا لئے تھے۔ میری نگاہ سریتا دیوی کے چہرے پر پڑی تو مجھے احساس ہوا جیسے وہ کچھ سوچ میں ڈوبی ہوئی ہو۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"اصل میں ہر شخص کی زندگی کے تجربات مختلف ہوتے ہیں۔ تم نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے وہ ظاہر ہے تمہاری زندگی کا ایک حصہ ہے۔ میری زندگی کی مشکلیں مختلف ہیں۔ البتہ یہ بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ہر شخص کی زندگی کے معاملات مختلف ہوا کرتے ہیں اور کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کسی طرح کی الجھن کا شکار نہیں رہا ہے۔ ریاستی معاملات بہت عجیب ہوا کرتے ہیں۔ میری صورتحال یہ ہے کہ میرے شوہر کو اب سے کوئی چار سال قبل قتل کر دیا گیا تھا اور اس سے پہلے ان کے بڑے بھائی کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ ایک ریاست کے دو افراد کا قتل معمولی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ انگریز حکومت نے اپنے تمام وسائل سے کام لینے کے باوجود ان قاتلوں کا سراغ لگانے میں کامیابی نہیں حاصل کی اور ان کے قاتلوں کا کبھی کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ بہرحال مجھے بھی کوئی ایسی بات نہیں پتہ چل سکی جس سے یہ اندازہ ہو کہ میرے شوہر اور میرے جیٹھ کو کیوں قتل کیا گیا؟ ان کا ایک بیٹا تھا، میرا مطلب ہے میرے جیٹھ کا۔ میری کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ راجہ ہردیپ سنگھ، راجہ دلاور سنگھ کا بیٹا تھا۔ نو سال کی عمر میں اسے کچھ تعلیمی امور کے لئے بھیج دیا گیا تھا۔ سینٹ لوسیا جو مشرقی بحیرہ کریبین میں واقع ہے وہاں کی ایک یونیورسٹی میں وہ تعلیم حاصل کرتا تھا اور کاسٹریٹ جو سینٹ لوسیاہ کا دارالحکومت ہے وہاں رہا کرتا تھا۔ وہاں اس نے اپنا تھوڑا سا کاروبار بھی پھیلا رکھا تھا۔ ہردیپ سنگھ تھا اس کا نام، شاید میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ پرنس ہردیپ سنگھ کے نام سے مشہور تھا۔ بہرحال اب وہی اس خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ پھر یہ ہوا کہ رانا جسپال سنگھ جن کا قیام ہمیشہ سے لندن میں ہی تھا اور جو میرے شوہر کے بہت ہی گہرے دوست تھے، ہندوستان گئے اور چندی گڑھ میں آ کر مجھ سے ملے۔ ان کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ ان دونوں بھائیوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ بڑے ہی دکھ کا شکار ہوئے تھے انہوں نے ہردیپ سنگھ سے ملنے کا ارادہ کیا تو

میں نے انہیں بتایا کہ وہ سینٹ لوسیا میں ہے۔ بہت سی باتیں ہوئیں ہمارے درمیان۔ اکیلے ہی آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ روپالیہ ان کی بیٹی ہے۔ ایک انگریز ماں کی اولاد جس کی وجہ سے وہ لندن ہی میں رہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں پسند کروں تو ہردیپ سنگھ کو روپالیہ سے منسلک کر دیا جائے اور ان دونوں کی شادی کر دی جائے۔ میں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور ہمارے درمیان یہ بات طے ہو گئی کہ روپالیہ اور ہردیپ سنگھ کو یکجا کر دیا جائے۔ اس سے کچھ تھوڑے سے ریاستی امور بھی طے ہوتے تھے اور میری پوزیشن کا ایک حصہ بھی صاف ہوتا تھا۔ ہم لوگوں نے یہ طے کیا کہ میں سینٹ لوسیا سے ہردیپ سنگھ کو یہاں بلا لوں اور یہاں رانا جسپال سنگھ کی بیٹی سے اس کی شادی کر دوں۔ یہ تمام معاملات طے کرنے کے بعد میں یہاں لندن پہنچی اور میں نے ہردیپ سنگھ کو ساری تفصیل لکھی۔ وہ خوشی سے مجھ سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ لندن میں جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ میرا ایک باقاعدہ فارم ہاؤس ہے۔ ہردیپ سنگھ نے یہاں پہنچنے کے بعد مجھے اطلاع دی کہ وہ لندن آ چکا ہے اور میرا انتظار کر رہا ہے۔ چنانچہ میں یہاں پہنچ گئی۔ لیکن یہاں پہنچ کر مجھ پر اس وقت بجلی گر پڑی جب مجھے پتہ چلا کہ ہردیپ سنگھ کو قتل کر دیا گیا ہے اور اس کی لاش یہیں فارم ہاؤس میں موجود ہے۔

ڈرے اور سہمے ہوئے ملازمین نے جو ہندوستانی ہی ہیں، مجھے بتایا کہ ایک رات کچھ پراسرار لوگ یہاں آ گئے اور انہوں نے ہردیپ سنگھ کو قتل کر دیا۔ ملازموں نے فوراً ہی مجھے بھی اطلاع دینا چاہی لیکن میں ہندوستان سے چل پڑی تھی۔

میں سکتے میں رہ گئی تھی۔ ہردیپ سنگھ کی لاش میں نے دیکھی اور ایک لمحے کے اندر اندر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ہردیپ سنگھ کی لاش نہیں ہے بلکہ اس کے چہرے پر ہردیپ سنگھ کا میک اپ کر دیا گیا ہے۔ بعد میں، میں نے اپنے اس خیال کی تصدیق کے لئے اس کے چہرے کا میک اپ اتار کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ وہ بھی کوئی ہندوستانی ہی تھا۔ نوجوان آدمی تھا اور ہردیپ کا تھوڑا بہت ہم شکل بھی تھا۔ تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ حالات کس قدر پراسرار تھے۔ میں نے ہردیپ سنگھ کا انتظار کیا۔ سینٹ لوسیا سے رابطہ قائم کیا تو پتہ چلا کہ ہردیپ سنگھ وہاں سے اپنے ایک دوست راجکمار کے ساتھ لندن چلا گیا ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ جس شخص کو قتل کیا گیا وہ راجکمار ہی تھا۔ لیکن ہردیپ سنگھ کہاں گیا اس کے بارے میں مجھے پتہ نہیں چل سکا۔ اور آج تک میں اس کشمکش کا شکار ہوں کہ آخر

ہردیپ سنگھ گیا کہاں۔'' رانی سریتا رُکی تو میں نے کہا۔

''ابھی تک آپ کو ہردیپ سنگھ کا پتہ نہیں چلا؟''

''نہیں۔''

''آپ نے رانا جسپال سے ملاقات کی؟''

''اتفاق سے نہیں ہوئی۔''

''کیا مطلب؟''

''رانا صاحب فرانس میں ہیں۔ ایک دو دن میں واپس آئیں گے۔ لیکن مائی ڈیئر خاقان جمشیدی! میں رانا صاحب پر بھی نہیں ظاہر کر سکتی کہ ہردیپ کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہے۔''

''کیوں؟''

''وہ بدک جائیں گے۔ کون اپنی بیٹی کے لئے خطرہ مول لیتا ہے۔ ہردیپ کے پتا اور چچا یعنی میرے شوہر بھی قتل ہوئے ہیں۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔''

''رانا صاحب کو معلوم ہے کہ میں لندن آ چکی ہوں۔ وہ آتے ہی مجھ سے اور ہردیپ سے ملیں گے۔ یہ میری اصل مشکل ہے۔''

''پھر اب کیا کریں گی؟'' میں نے پوچھا۔

''خاقان! تمہیں ہردیپ بننا ہو گا۔''

سریتا دیوی نے کہا اور میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔

☆

تھوڑی دیر تک تو میں اسی کشمکش کا شکار رہا کہ جو کچھ میں نے سنا ہے وہی سریتا دیوی نے کہا ہے یا مجھے دھوکا ہوا ہے۔

"سنا تم نے خاقان......؟" سریتا دیوی بولیں۔

"مجھے ہردیپ بننا ہو گا؟"

"ہاں۔"

"مگر کیسے......؟" میں بدستور حیرت سے بولا۔

"یہ مشکل نہ ہو گا۔ بشرطیکہ......"

"بشرطیکہ؟"

"بشرطیکہ تم تیار ہو۔"

"فرض کیجئے آنٹی میں تیار ہو جاتا ہوں تو کیا رانا جسپال سنگھ......"

"یہی ایک آسانی ہے مجھے۔"

"کیا؟"

"رانا جسپال سنگھ نے تمہیں یعنی ہردیپ کو دیکھا نہیں ہے۔"

"تصویر بھی نہیں دیکھی؟"

"ہاں، نہیں دیکھی۔"

"اور ان کی بیٹی روپالیہ نے بھی نہیں۔"

"اس نے بھی نہیں۔"

"کیا یہ کمال کی بات نہیں ہے آنٹی؟"

"نہیں ہے بیٹے۔" رانی نے جواب دیا۔

"مجھے سخت حیرت ہے۔"

"آخر کیوں؟"

"اس دور میں بھی ایسا ہوتا ہے؟"

"کیا......؟"

"نہ رانا جسپال سنگھ نے ہردیپ کو دیکھا اور نہ ان کی بیٹی روپالیہ نے اور وہ لوگ شادی کے لئے تیار ہو گئے جبکہ خاص طور سے روپالیہ ایک انگریز ماں کی بیٹی ہے۔ ظاہر ہے اس کا مزاج......"

"آہ...... یہ ایک دلچسپ بات ہے۔"

"کیا؟"

"روپالیہ خاص طور سے خالص ہندوستانی مزاج کی حامل ہے اور پھر بڑے خاندانوں کی مان مریادائیں ہوتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے رانی صاحبہ...... آپ اتنا بڑا جوا کھیلیں گی؟"

"بہت ضروری ہے خاقان!"

"اور آپ کا کیا خیال ہے کہ ہردیپ زندہ ہے؟"

"میں تمہیں اس خیال کی وجہ بتا چکی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ آپ سے ملا تو؟"

"ملے گا۔ ضرور ملے گا۔"

"اس کے بعد آپ کیا کریں گی؟"

"دیکھو، میرا مؤقف سمجھو۔"

"واقعی میری سمجھ میں ابھی تک کچھ نہیں آیا ہے۔"

"کافی اور پیو۔" رانی نے میری کافی کی پیالی دوبارہ بھرتے ہوئے کہا اور مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ رانی نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر بولی۔ "ہنسے کیوں؟"

"آپ کے انداز پر۔"

"میں نہیں سمجھی؟"

"آپ نے اس طرح کہا جیسے کافی سب کچھ سمجھ جانے کا ذریعہ ہو۔"

"واقعی ہوتی ہے۔" وہ بولی۔

"چلئے ٹھیک ہے۔ آپ کی بات مانے لیتا ہوں کہ کافی بہت سی باتوں کو سمجھانے کا ذریعہ ہوتی ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے پیالی اٹھائی اور پھر چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔ رانی سریتا دیوی بھی اپنی کافی کی پیالی ہاتھ میں اٹھا کر سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ پھر کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''دیکھو اصل میں یہ میرے لئے ذرا سی سکون کی بات ہے کہ رانا جسپال سنگھ اور روپالیہ ہردیپ کو پہچانتے نہیں۔ ہردیپ جوان اور خوبصورت آدمی ہے۔ رانا صاحب نے بچپن میں کبھی اس کو دیکھا تھا لیکن اس وقت اس کی عمر آٹھ یا نو سال کی تھی۔ اس کے بعد سے رانا صاحب نے اسے نہیں دیکھا۔ جہاں تک میں اپنی مان مریاداؤں یا رسم و رواج کی بات کرتی ہوں تو ہمارے ہاں یہ قدیم رسم اب بھی بنیادی حیثیت رکھتی ہے کہ بچوں کی تقدیر کا فیصلہ والدین ہی کیا کرتے ہیں اور بچے مان بھی لیا کرتے ہیں۔ رانا جسپال نے اپنی بیٹی کو وہ تمام باتیں سکھائی تھیں۔ حالانکہ اس کی ماں فطری طور پر ذرا مختلف تھی۔ لیکن رانا جسپال اور اس کی بیٹی کے معاملات میں اس کی ماں نے کبھی ٹانگ نہیں اڑائی۔ روپالیہ ویسے تو ایک ماڈرن لڑکی ہے جس طرح لندن کی انگریز لڑکیاں ہوتی ہیں لیکن اسے ہندوستانی ماحول بہت پسند ہے۔ اکثر ساڑھی باندھتی ہے اور ماتھے پر تلک لگا کر گنیش پوجا کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تصویر کا مسئلہ یوں تمہارے ذہن سے صاف ہو جانا چاہئے اور ہردیپ کو نہ جاننے کا بھی۔ تم ہردیپ کی حیثیت سے ان سے ملو گے۔ یوں سمجھ لو کہ کسی کو کوئی حیرت نہیں ہو گی۔ ہردیپ چونکہ وطن سے باہر رہا ہے اس لئے بھی لوگ اسے نہیں جانتے۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ عارضی طور پر کوئی بڑی گڑبڑ نہ ہونے پائے اور وہاں چندی گڑھ میں کچھ لوگ جو اس بات کے منتظر ہیں کہ رانا جسپال کی بیٹی سے ہردیپ کی سگائی نہ ہونے پائے اور شاید وہی لوگ ہردیپ کے قتل کے سلسلے میں بھی ملوث ہیں، انہیں شاک لگے گا۔ عارضی طور پر وہ کچھ نہیں کر سکیں گے جبکہ اپنی دانست میں ہردیپ کو قتل کر کے انہوں نے بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہے پلیز میری مدد کرو۔ میں بالکل یہ پیشکش نہیں کروں گی کہ اس کا تمہیں منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ لیکن اگر تم چاہو گے تو وہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''مجھے ایک سوال کا جواب اور دیجئے گا۔''

''بولو۔ پلیز بولو۔''

''ہردیپ اگر زندہ ہے اور جب وہ منظر عام پر آئے گا تو کیا ہو گا؟''

''بالکل کچھ نہیں ہو گا۔ میرے اور ہردیپ کے درمیان بڑی انڈراسٹینڈنگ ہے۔ میں اسے سنبھال لوں گی۔''

''اور رانا جسپال کو؟''

''رانا جسپال کو بھی میں بتا دوں گی کہ اصل صورتحال کیا ہے۔ یہ اصل میں رانا صاحب بے چارے کو میں نے اپنے ذاتی معاملات سے آگاہ نہیں کیا جبکہ وہ ہمیشہ یہی چاہتے رہے ہیں کہ میری تنہائی مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا دے اور میں ان کا سہارا حاصل کر لوں۔ بہت ہی اعلیٰ ظرف انسان ہیں وہ۔ میرا مطلب ہے کہ اگر یہ عارضی مسئلہ حل ہو جائے تو آگے چل کر تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہردیپ کسی نہ کسی طرح مجھ سے رابطہ قائم کرے گا ہی۔ میں کم از کم اس ایک پہلو سے نمٹنے کے بعد زیادہ محتاط ہو کر ہردیپ کو تلاش کر سکوں گی اور ویسے بھی میں تمہیں پیشکش کر چکی ہوں کہ تم میرے ساتھ ہندوستان چل سکتے ہو۔ دنیا کا کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکے گا کہ تم ہردیپ نہیں ہو۔''

''رانی صاحبہ! مجھے سوچنے کا موقع دیں گی آپ؟''

''کب جواب دو گے؟''

''کل۔''

''میں انتہائی بے چینی سے تمہارا انتظار کروں گی۔ اور دیکھو، میری لاج رکھ لینا۔ اس وقت تم میرے لئے بہت بڑا سہارا بن گئے ہو اور میں نے اپنا انتہائی راز تمہیں دے دیا ہے۔''

''آپ اطمینان رکھیں، جو کچھ بھی ہو گا بہتر ہی ہو گا۔'' میں نے جواب دیا۔

رانی کے ساتھ کافی وقت گزارا اور پھر ہم دونوں الگ الگ ہو گئے۔ جاتے وقت رانی نے دوسرے دن دس بجے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہو گیا اور اس کے بعد بہت دیر تک میں اس عجیب و غریب کہانی کے بارے میں سوچتا رہا۔ بہر حال احمق تو میں بھی نہیں تھا۔ رانی سریتا دیوی نے جو داستان سنائی تھی، وہ دلچسپ اور پراسرار تھی لیکن اس میں خود رانی کا کردار بھی کم پراسرار نہیں تھا۔

ہردیپ سنگھ، رانی کے شوہر کے بڑے بھائی کا بیٹا تھا۔ بقول اس کے اس کا شوہر اور اس کا جیٹھ قتل ہو چکے تھے۔ ان کے قاتل کون تھے؟ اس کے بارے میں رانی نے ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا نہ ہی کسی خاص آدمی پر شبہے کا اظہار کیا تھا۔ کم از کم رانی کے ان

دشمنوں کی نشاندہی تو ہونی چاہئے تھی۔ کوئی نام تو سامنے آنا چاہئے تھا تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ وہ لوگ کون ہو سکتے ہیں۔ پھر ہردیپ کا معاملہ تھا۔ یہ ساری باتیں قابل غور تھیں۔ بقول رانی کے، راناجیپال ابھی لندن سے باہر تھے ورنہ ہردیپ کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا۔

بات میرے راستے سے ہٹ کر تھی اور اصولی طور پر جن حالات میں الجھا ہوا تھا ان حالات میں کسی نئی الجھن کو قبول نہیں کرنا چاہئے تھا۔ لیکن ایک جگہ آ کر یہ کہانی مجھ سے منسلک ہو جاتی تھی۔ وہ یہ کہ بھوج پتر پر رانی کا چہرہ تھا اور اس کی وجہ سے ہی میں رانی کی طرف متوجہ ہوا تھا اور پھر رانی نے اپنی یہ کہانی پیش کر دی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ میری زندگی کے ساتھ گزرے ہوئے تمام واقعات کہیں نہ کہیں رانی سریتا دیوی کے اس معاملے سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ بس یہ ذرا قابل غور بات تھی۔ بھوج پتر کا خیال آتے ہی میں نے دل میں سوچا کہ اب جب میں اپنے طور پر ان تمام معاملات میں اپنے آپ کو ملوث کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں تو پھر اس بھوج پتر سے بھی کنارہ کشی بیکار ہے۔ دیکھوں تو سہی یہ اس سلسلے میں کیا کہتا ہے۔ میں نے بھوج پتر نکال کر دیکھا اور واقعی حیران رہ گیا۔ چونکہ بھوج پتر پر چند الفاظ لکھے ہوئے تھے جو یوں تھے۔

"ٹھیک ہے، جاری رکھو۔"

گویا یہ میرے سوال کا جواب تھا۔ میں دیر تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے بھوج پتر پر لکھے ہوئے ان جملوں کو دیکھتا رہا۔ ایک بار پھر میں نے اپنے ذہن میں اپنا سوال دوہرایا۔

"کیا مجھے رانی سریتا دیوی کے ساتھ اس کی خواہشوں کی تکمیل کرنی چاہئے؟"

بھوج پتر پر جواب تو وہی لکھا ہوا تھا ٹھیک ہے جاری رکھو۔ لیکن حیرت انگیز طور پر ٹھیک ہے سے پہلے ہاں کے الفاظ کا اضافہ ہو گیا اور اب یہ جملہ یوں بنتا تھا۔

"ہاں، ٹھیک ہے۔ جاری رکھو۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور بھوج پتر اپنے لباس میں چھپا لیا۔ یہ واقعی بڑی حیرت انگیز چیز تھی۔ اس سے پہلے میں اس کے ساتھ لاپرواہی برتتا آیا تھا اور میں نے اسے کوئی حیثیت نہیں دی تھی۔ لیکن بہت سے سوالات کا جواب اس سے مل جاتا تھا اور یہ ایک دلچسپ بات تھی۔ پھر میں بستر پر لیٹ کر بہت دیر تک گاشربرم، شومندر اور اس کے قرب و جوار میں بکھرے ہوئے کرداروں کے بارے میں سوچتا رہا۔

ہیگ کو ایک بار پھر میرے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ تو یہ سوچ رہا ہوگا

جرمنی کے اس کیمپ میں مجھے پھنسا کر اس نے میرے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے ہیں۔ لیکن میرا وہاں سے ایک مکمل فرار اس کے لئے بڑی بدنصیبی کا باعث تھا۔ اب یہ اندازہ میں نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ میرے بارے میں کہاں تک جان سکے گا، یہ پتہ چلا سکے گا یا نہیں کہ میں لندن میں ہوں؟ ایک اور بات قابل غور تھی کہ وہ تختی جس کی تلاش میں ہیگ ہے، آخر کیا حیثیت رکھتی ہے؟ ایک طرف تو کچھ مذہبی لوگ اس کے چکر میں پڑے ہوئے تھے اور دوسری جانب ہیگ جیسا خطرناک آدمی جس کی دولت کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے ایک ایسے خزانے کی تلاش میں ہے جس کا تعلق اس تختی سے ہے اور جس کے بارے میں یہ سنا جا رہا ہے کہ وہ دنیا کا عظیم الشان خزانہ ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اصل قصہ کیا ہے۔

بہرحال بھوج پتر پر یہ الفاظ ابھرنے کے بعد میں نے بھی اپنے آپ کو مطمئن کر لیا تھا اور تو کوئی سہارا تھا نہیں جس کے بل پر اپنے ان فیصلوں میں تبدیلی کر سکتا۔ پتہ نہیں وہ کمبخت وردان سادھانی جو سمندر میں رواں دواں جہاز پر آ موجود ہوتا تھا، اب کہاں مٹ گیا تھا۔ کیمپ پر قید کے دوران بھی وہ مجھ تک نہیں آیا تھا۔ ہو سکتا ہے کوئی ایسی ہی صورتحال ہو۔ لاتعداد باتیں میرے علم میں کہاں تھیں۔ بہرطور یہ ایک سنگین صورتحال تھی۔ لیکن اب تو کوئی چیز میرے لئے سنگین نہیں رہی تھی۔ جس طرح کے حالات سے واسطہ پڑ چکا تھا وہ ایسے ہی تھے کہ ہر واقعہ کی سنگینی میرے لئے بالکل بے اثر تھی۔

دوسرے دن سریتا دیوی ٹھیک دس بجے میرے کمرے کے دروازے پر پہنچ گئیں۔ ان کی دستک سے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ آ گئی ہیں۔ ساری باتیں اپنی جگہ، یہ عورت اس قدر دلکش تھی کہ اسے دیکھ کر ہمیشہ ایک خوشگوار کیفیت کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے مسکرا کر اس کا خیر مقدم کیا تو وہ بولی۔

"میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ تمہارے چہرے پر برہمی کے آثار ہوں گے۔"

"کیوں۔ بیٹھئے آنٹی پلیز۔"

وہ بیٹھ گئی، پھر بولی۔ "بس دوسروں کے معاملے میں الجھنا اور وہ بھی ان خطرناک حالات میں کوئی معمولی کام تو نہیں ہوتا۔"

"آنٹی! پھر بھی میرا یہ خیال ہے کہ انسان کو کسی کی مشکل میں اس کی مدد کرنی چاہئے۔"

"تت...... تمہارا مطلب ہے کہ تم؟"

"ہاں، میں تیار تو پہلے ہی ہو چکا تھا، بس ذرا سی الجھن تھی۔ لیکن میں نے اپنے ذہن کو صاف کر لیا ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ...... مائی گاڈ...... میں تمہارے اس احسان کو کبھی نہیں بھولوں گی خاقان! باقی یہ مشکل کام ہے کہ کوئی کسی کے لئے خطرہ مول لے۔ بہرحال یہ وعدہ میں تم سے کرتی ہوں کہ خطرہ تمہارے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔"

میں ہنسنے لگا۔ میں نے کہا۔ "خطرہ تو ہے آنٹی۔"

"نہیں، نہیں ہے۔"

"آپ غور تو کیجئے ذرا۔"

"میں نے غور کر لیا ہے نا۔ میں ہوں نا تمہارے لئے ہر طرح سے۔"

"وہ تو میں مانتا ہوں۔ لیکن آپ یہ بتایئے کہ اگر کسی نے ہردیپ پر قاتلانہ حملہ کیا ہے اور اس کا دوست ہردیپ کے دھوکے میں قتل ہو چکا ہے تو کیا قاتل ہردیپ کو دوبارہ دیکھ کر یا ہردیپ کی شکل میں مجھے دیکھ کر یہ نہیں سوچیں گے کہ میں کون ہوں اور کیوں ہردیپ بنا ہوا ہوں؟ اور کیا وہ میرے گرد گھیرا ڈالنے کی کوشش نہیں کریں گے؟"

میرے ان الفاظ پر رانی سریتا سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہونے لگا۔ پھر اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"ہاں، یہ کسی حد تک ہے۔ تو پھر؟"

"نہیں سریتا دیوی! میں آپ کو صرف وہ حالات بتا رہا تھا جو آئندہ پیش آ سکتے ہیں ویسے کیا میں آپ سے یہ سوال کر سکتا ہوں کہ آپ کو ہردیپ کے دشمنوں یا پھر بالفاظِ دیگر ان دشمنوں کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہیں جنہوں نے آپ کے شوہر اور اس کے بڑے بھائی کو قتل کیا؟ پہلے بھی میں نے آپ سے یہ سوال کیا تھا کہ ہر عمل کی کچھ وجوہات ہوتی ہیں۔ لیکن اس وقت میں اس سوال کو دہرانے کا حق نہیں رکھتا تھا کیونکہ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر رہا تھا۔ لیکن اب...... اب باقاعدہ آپ کے ساتھ ملوث ہو چکا ہوں۔"

"مم...... مطلب یہ کہ ان حالات کا اندازہ لگانے کے باوجود تم میرے لئے ہردیپ بننے کو تیار ہو؟"

"ہاں۔ میں نے کہا نا وہ تو میں پہلے بھی تیار تھا بس تھوڑا سا سوچ بچار کرنا تھا۔ جو میں نے کر لیا ہے۔"

"اوہ...... مائی سن! کچھ باتیں آنے والے وقت کے لئے چھوڑ دی جاتی ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ رفتہ رفتہ بہت کچھ تمہارے علم میں آ جائے گا۔ فی الحال جتنا جانتے ہو اسی پر قناعت کرو۔"

میں مسکرا دیا۔ میں نے کہا۔ "کیسی دلچسپ بات ہے آنٹی! میں بے لوث اور بے غرض آپ کے لئے کام کر رہا ہوں اور آپ مجھے وہ باتیں بھی نہیں بتانا چاہتیں جو آپ کے علم میں ہیں۔"

میرے ان الفاظ پر رانی کے چہرے پر شرمندگی کے نقوش نظر آئے۔ میں نے خود ہی بات ٹالتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں ہے۔ میں آپ کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہوں اور مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"میں تمہاری شکر گزار ہوں۔"

"تو اب صورتحال آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بتایئے کیا کرنا ہے؟"

"ہمیں یہاں سے فارم ہاؤس چلنا ہوگا۔ تم اپنا کمرہ اسی طرح اپنے پاس رہنے دو۔ میں بھی اپنا کمرہ رکھتی ہوں۔ ہمیں کسی بھی وقت ان کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ لیکن فی الحال جب تک کہ کوئی خطرہ نہیں ہے ہم فارم ہاؤس میں ہی قیام کریں گے۔"

"ٹھیک ہے، جیسا آپ پسند کریں۔" میں نے اپنا سامان سمیٹنا چاہا تو وہ بولی۔

"بالکل نہیں، تمہاری جسامت ہردیپ جیسی ہے، ذرا بھی فرق نہیں ہے۔ تمہیں دنیا کی ہر چیز وہاں مل جائے گی۔ سب کچھ اسی طرح رہنے دو، اس طرح کسی کو شبہ بھی نہیں ہو گا۔ کیا خیال ہے، چلیں؟"

"ناشتہ کر لیا ہے آپ نے؟"

"ہاں کر لیا ہے۔ لیکن ہم جس جگہ جا رہے ہیں وہاں سارے انتظامات موجود ہیں۔"

"او کے۔"

میں نے بھوج پتر اپنے لباس میں ضرور چھپا لیا تھا اور دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ کسی بھی طرح اس کے بارے میں کسی کو نہیں معلوم ہونے دوں گا۔ یہ میرا بہترین ساتھی ہے۔ اور پھر میں رانی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ کمرے کی چابی کاؤنٹر پر دے کر میں باہر کی جانب

چل پڑا جہاں وہ ایک ٹیکسی لئے میرا انتظار کر رہی تھی۔ ہم دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر چل پڑے۔ لندن کی کہریلی فضا اور بہت ہی خوبصورت ماحول ہمارے سامنے تھا۔ ہندوستان کے بعد اسکندریہ پھر جرمنی اور اب لندن یہ سب کچھ میرے لئے بڑی دلکشی کا حامل ہوتا اگر ساتھ میں ذہنی سکون بھی ہوتا۔ اس وقت جو لمحات گزر رہے تھے وہ بھی برے نہیں تھے میرے لئے۔ رانی سریتا دیوی کی پراسرار کہانی کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے زندگی ایک نئی ڈگر کی جانب جا رہی تھی۔

ٹیکسی لندن کے حسین ماحول سے گزرتی ہوئی کسی قدر دیہی ماحول میں آ گئی۔ لیک ڈسٹریٹ لندن کا ایک نواحی علاقہ تھا اور جھیلوں کا یہ شہر اپنے حسن میں بے مثال تھا۔ بلندیوں اور نشیبوں کی طرف سفر کرتے ہوئے آخر کار ہم سڑک سے کٹ کر ایک ذیلی سڑک پر آ گئے جس کے اختتامی سرے پر ایک خوبصورت فارم ہاؤس نظر آ رہا تھا۔ بانسوں کا احاطہ بنایا گیا تھا اور اس میں ہندوستانی طرز کا دروازہ کاٹا گیا تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"کیا وہ فارم ہاؤس ہے؟"

"ہاں۔"

"اور یہ سڑک خاص طور سے بنوائی گئی ہے؟"

"ہاں۔"

میں نے دل میں سوچا کہ بات معمولی نہیں ہے۔ لندن جیسا شہر اور اس طرح وہاں اپنی پسند کی جگہ بنانا کسی معمولی حیثیت کی مالک شخصیت کا کام نہیں ہو سکتا۔

بڑے دروازے پر ایک چوکیدار کھڑا ہوا تھا۔ ہندوستانی ہی تھا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے ٹیکسی کو دیکھا تو رانی نے گردن نکال کر کہا۔

"دروازہ کھول دو دیال سنگھ! یہ میں ہوں۔"

چوکیدار ایک دم اچھل پڑا۔ اس نے بدحواسی میں کئی سلام داغ دیئے اور پھر دروازہ کھلنے لگا۔ ٹیکسی اندر داخل ہو گئی۔ ایک چوڑی سی روش بنی ہوئی تھی جس کے دونوں طرف انتہائی خوبصورت تختے تھے۔ بانسوں کے احاطے کے ساتھ ساتھ درخت لگائے گئے تھے جو کافی بڑے تھے۔ چھوٹے چھوٹے فوارے جگہ جگہ بنے ہوئے تھے جو ضرورت پڑنے پر ان پھولوں کی آبیاری کرتے ہوں گے۔ سنگ مرمر کی سفید بنچیں، کہیں راج ہنس کہیں

دیوی دیوتاؤں کے مجسمے۔ وہ ماحول پیدا کر دیا تھا اس فارم ہاؤس کو بنانے والوں نے کہ یقیناً مقامی لوگ اسے دیکھ کر عش عش کرتے ہوں گے اور ان پر کروڑوں روپیہ صرف کیا ہو گا۔

ٹیکسی اس عمارت کے سامنے رک گئی جس کے دونوں سمت سنگ مرمر کے راج ہنس پہرہ دے رہے تھے۔ رانی نیچے اتری۔ دو ملازم دوڑتے ہوئے آ گئے۔ سارے کے سارے ہندوستانی تھے۔ رانی نے کہا۔

"ڈرائیور کو کرایہ ادا کر دو۔ جتنا اس کا بل بنتا ہے اس سے دوگنا دے دو۔ آؤ۔" رانی نے مجھ سے کہا اور ہم دونوں وہ پانچ سیڑھیاں طے کرنے لگے جو ایک چبوترے پر جا کر ختم ہوتی تھیں۔ چبوترے پر جو پتھر لگایا گیا تھا وہ اس قدر شفاف تھا کہ چہرے کے نقوش دیکھ لو۔ آگے ایک دروازہ تھا۔ رانی نے وہ دروازہ کھول کر مسکراتی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔

"آؤ۔"

"رانی صاحبہ! بہت خوبصورت جگہ ہے یہ۔"

"شکریہ۔ آؤ۔" رانی نے کہا۔ ایک چھوٹی سی راہداری عبور کر کے ایک اور دروازہ آ گیا۔ ٹیکسی کا بل ادا کرنے کے بعد وہ دونوں ملازم بھاگے بھاگے یہاں آئے تھے اور یہ دوسرا دروازہ انہوں نے ہی پُر ادب انداز میں کھولا تھا۔ ہم ایک ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ ڈرائنگ روم کی چھت گنبد کے انداز میں بنی ہوئی تھی اور اس پر کوئی بیس فٹ قطر کا حسین ترین فانوس لٹکا ہوا تھا جس کی قیمت ہی لاکھوں ڈالر ہو گی۔ نیچے جو فرنیچر پڑا ہوا تھا وہ انتہائی خوبصورت تھا۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں شاہی خاندان کے محل میں گھس گیا ہوں۔

"بیٹھو...... تھوڑی دیر تک یہاں بیٹھتے ہیں۔ میں ملازموں کو تمہارا کمرہ تیار کرنے کے لئے کہہ دیتی ہوں۔ ویسے ایک بات کہوں؟"

"جی۔" میں نے کہا۔

"تم خاموش ہو۔ مجھ سے ہر طرح کے سوال کر سکتے ہو۔ اس جگہ کے بارے میں، یہاں کے لوگوں کے بارے میں۔ کیونکہ اب تمہیں یہاں کچھ وقت ہردیپ سنگھ کی حیثیت سے گزارنا ہو گا اور ہم ہر مسئلے کا حل تلاش کریں گے۔"

"کتنے ملازم ہیں یہاں؟"

"سات۔ دو عورتیں، پانچ مرد۔ ایک گیٹ پر چوکیداری کرتا ہے، ایک مالی ہے، دو کچن میں کام کرتے ہیں، ایک کیئر ٹیکر ہے، صفائی ستھرائی کا خیال رکھتا ہے۔ عورتیں بھی گھر کے اندرونی کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔ مطلب یہ کہ یہاں کا سارا کام ان سات افراد میں بٹا ہوا ہے۔ سوائے گیٹ کے چوکیدار کے جو اپنی ڈیوٹی پر مستعد رہتا ہے باقی چھ افراد ضرورت کا ہر کام کرلیا کرتے ہیں۔ تم ان میں سے تین کو دیکھ چکے ہو باقی لوگوں کو بھی میرے آنے کی اطلاع تو مل گئی ہو گی۔ لیکن جب تک میں انہیں طلب نہیں کروں گی وہ اندر نہیں آئیں گے۔ کچھ خصوصی ہدایات ہیں ان کے لئے۔"

"ایک بات بتایئے؟"

"ہاں۔"

"آپ جب ہندوستان سے آئی تھیں تو سیدھا فارم ہاؤس پہنچی ہوں گی۔"

"نہیں، پہلے میں نے یہاں ہوٹل میں کمرہ حاصل کیا تھا۔ اصل میں جن حالات میں گزر رہی ہوں ان میں احتیاط اول حیثیت رکھتی ہے۔ میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد میں فارم ہاؤس پہنچی تھی اور مجھے اس حادثے کا علم ہوا تھا۔"

"کیا یہاں ملازموں کو اس بات کا علم ہے کہ آپ نے ہلٹن میں اپنا کمرہ بک کرا رکھا ہوا ہے؟"

"کسی کو نہیں۔ یہاں تک کہ میں جب یہاں سے واپس ہوٹل گئی تھی تو فارم ہاؤس کی گاڑی تک میں نہیں گئی تھی۔ جبکہ یہاں پانچ گاڑیاں موجود ہیں۔"

"ٹھیک۔ اس سے مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ ملازموں میں کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے جسے آپ نے خصوصی طور پر......"

"دیکھو، ہردیپ کے قتل کے بارے میں تو سب ہی کو معلوم ہو چکا ہے۔ اب یہ ہے میں نے ان سے کوئی بحث نہیں کی لیکن ان میں سے تقریباً سبھی یہ بات جانتے ہیں کہ قتل ہردیپ سنگھ کا نہیں ہوا ہے بلکہ اس کا دوست مارا گیا ہے۔"

"اوہ...... یہ بات ان لوگوں کو معلوم ہے؟"

"ہاں ظاہر ہے۔ انہی کی مدد سے میں نے باقی کام کئے تھے۔ انہیں رازدار

ضروری تھا ورنہ یہ دیارِ غیر ہے، انگریزوں کا ملک ہے۔ میں خود مشکل میں پڑ جاتی۔"

"گویا آپ نے اس دوسرے قتل کی اطلاع کسی کو نہیں دی؟"

"بھئی دونوں لحاظ سے یہ ضروری تھا کہ میں کسی کو اس بارے میں اطلاع نہ دیتی۔ ایک طرف تو مجھے پولیس کے سوالات میں الجھنا پڑتا اور دوسری طرف رانا جسپال کے معاملے میں مار کھا جاتی۔ چنانچہ خاموشی سے سب کچھ کر دیا۔ بہرحال یہ گناہ تھا کہ میں نے اس لاش کو جلانے کی بجائے زمین میں دفن کرا دیا۔"

"اوہ...... کہاں؟"

"یہیں، اس فارم ہاؤس کے ایک حصے میں۔ کسی کو اس بارے میں پتہ نہیں چل سکتا۔"

"بڑی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کو یہاں کافی جدوجہد کرنا پڑی ہے۔"

"نہ کرتی تو کیا کرتی؟ دو ہی باتیں ہیں، جس مصیبت میں، میں گرفتار ہوئی ہوں اس میں ہر کام لمحوں کے اندر کرنا ضروری تھا۔ جہاں بھی کچی پڑتی، مار کھا جاتی۔ حالانکہ کتنی ہی بار میرا دل دُکھا ہے اور مجھے ایک تھکن کا احساس ہوا ہے۔"

"رانی صاحبہ! بڑی دلچسپ بات ہے۔ اچھا آپ یہ بتایئے، یہ ساری جدوجہد کس کے لئے کر رہی ہیں؟"

"مطلب؟"

"دیکھئے آپ نے مجھے اجازت دی ہے کہ میں آپ سے ہر طرح کے سوالات کر سکتا ہوں۔ آپ کی نہ کوئی اولاد ہے نہ اور کوئی ہے، آپ یہ سب کچھ کس لئے کر رہی ہیں؟"

رانی کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔ "انسان کی اپنی زندگی بھی کچھ ہوتی ہے نا۔ تمہارا کیا خیال ہے میں خودکشی کرلوں گی؟ جب تک جیتی ہوں کچھ نہ کچھ تو کر کے جینا ہے۔ پلیز! اس طرح کے سوالات نہ کرو مجھ سے۔ میرے دل پر چوٹ لگتی ہے۔"

"سوری آنٹی، سوری۔ خیال رکھوں گا۔ لیکن بس ایسے ہی ذہن میں یہ سوال آ گیا تھا۔"

اس نے مضمحل انداز میں گردن ہلا دی تھی۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اپنے برابر لگی ہوئی کالے رنگ کی ایک عجیب سی چیز پر ہاتھ رکھ دیا، دور کہیں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی تھی۔ یہ خوبصورت سی چیز جو بظاہر ڈیکوریشن پیس معلوم ہوتی تھی اصل میں ملازموں کو بلانے کے لئے کوئی گھنٹی تھی۔ دروازے سے جو لڑکی یا عورت اندر داخل ہوئی

اس کی عمر اٹھائیس سے لے کر تیس سال کے درمیان ہو گی۔ چہرے مہرے سے پڑھی لکھی معلوم ہوتی تھی۔ اندر آ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔

”جے شری! سب کو بلا لو۔ چوکیدار سے بھی کہو کہ کچھ دیر کے لئے دروازہ لاک کر کے اندر آ جائے۔“

”جی رانی صاحبہ!“ آنے والی نے جس کا نام جے شری لیا گیا تھا، گردن خم کر کے کہا اور پھر جدھر سے آئی تھی اسی طرف سے باہر نکل گئی۔ رانی کہنے لگی۔

”حالانکہ یہاں اس عمارت میں انتہائی موثر انتظامات ہیں، فارم ہاؤس کے بڑے گیٹ سے جب کوئی اندر داخل ہوتا ہے تو یہاں موجود تمام افراد کو پتہ چل جاتا ہے اور سب لوگ مستعد ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہردیپ سنگھ کے دوست کو قتل کر دیا گیا۔ بہرحال جو لوگ اس طرح کے کام کرتے ہیں وہ بھی معمولی نہیں ہوتے اور ان کے پاس مکمل انتظامات ہوتے ہیں۔ میں ان سب سے تمہارا تعارف کرائے دیتی ہوں تاکہ یہ محتاط رہیں۔“

”آپ کیا کہہ کر ان سے میرا تعارف کرائیں گی؟“

”یہی کہ تم ہردیپ ہو۔ بات اصل میں یہ ہے کہ یہاں رانا جسپال بھی آئیں گے۔ انہیں کسی قسم کا شبہ نہیں ہونا چاہئے۔“

”ٹھیک ہے، مناسب قدم ہے آپ کا۔ ویسے کیا یہ سب قابل اعتماد ہیں؟“

”یہ سارے کے سارے چندی گڑھ کے ہی رہنے والے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کے باپ دادا بھی ہماری ریاست میں ہمارے ملازم رہے ہیں۔ میں نے انہیں خاص طور سے وہاں سے یہاں بھیجا تھا کیونکہ یہ سارے کے سارے وفادار ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ پھر اطمینان کی بات ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ کچھ دیر بعد جن سات ملازمین کا رانی سریتا نے انکشاف کیا تھا وہ یہاں آ موجود ہوئے۔ دونوں عورتیں خاص طور سے قابل دید تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام جے شری تھا اور دوسری کا راج شری۔ دونوں جڑواں بہنیں ہی معلوم ہوتی تھیں۔ ایک ہی شکل و صورت، ایک ہی جسامت۔ بہرحال میں نے ان کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ وہ دونوں ملازمائیں تھیں۔ لیکن دلکش تھیں اور اس طرح صاف ستھری کہ دیکھنے میں ہی اچھی معلوم ہوں۔

رانی نے کہا۔ ”سنو، تم لوگوں کو حالات کا تھوڑا بہت اندازہ ہے۔ یہ ایک سرکاری

عہدیدار ہیں جو تحقیقاتی مشن پر آئے ہیں۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ کسی بھی بیرونی آدمی کو یہاں ہونے والے واقعات کے بارے میں ایک لفظ کی بھنک نہیں پڑنی چاہئے۔ اب بھی میری یہی ہدایات ہیں۔ رانا جسپال سنگھ، ان کی بیٹی یا ان کے متعلقین یہاں آئیں گے۔ تم پرنس ہردیپ سنگھ کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے۔ یہ صاحب جو ہیں یہ پرنس ہردیپ سنگھ ہیں۔ سمجھے؟ میں نے تم لوگوں کو مکمل اعتماد کے ساتھ یہ بات بتا دی ہے۔ ہر لمحے ان کا احترام پرنس کی طرح ہی کیا جائے اور کسی کو یہ شبہ نہ ہونے دیا جائے کہ یہ پرنس نہیں ہیں۔ سمجھے؟“

”جی رانی صاحبہ! آپ نے ہمیں حکم دیا، ہم نے اسے اپنے شریر میں اتار لیا۔ اب آپ بالکل چنتا نہ کریں۔“

”راج شری! تم انہیں ان کے کمرے میں لے جاؤ اور تمام چیزوں سے روشناس کرا دو۔“

”جی رانی صاحبہ!“

”ہردیپ، تم جاؤ۔ اور سنو، اب میں تمہیں ہردیپ کے سوا کچھ اور نہیں کہوں گی۔ تاکہ مجھے بھی عادت پڑ جائے۔ میں ذرا ان لوگوں کو کچھ اور ہدایت دینا چاہتی ہوں۔“

میں اس لڑکی کے ساتھ چل پڑا جس کا نام راج شری تھا۔ جے شری اور راج شری میں صرف اتنی ہی تمیز کی جا سکتی تھی کہ ان کے لباس الگ الگ تھے ورنہ جڑواں بہنوں میں وہ سب سے زیادہ حیرت ناک تھیں۔

بہرحال میں راج شری کے ساتھ اس محل نما عمارت کی مختلف راہداریوں سے گزرتا ہوا ایک بڑے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ میں مشرق نے اپنے خاصے اثرات قائم کئے ہوئے ہیں۔ ریاست قولی کی اس رانی کے پرکھوں نے بھی لندن جیسے شہر کے اس خوبصورت حصے میں جو عمارت تعمیر کرائی تھی۔ اسے خاص طور سے ہندوستانی طرزِ معاشرت کا نمونہ بنایا گیا تھا۔ عمارت بہت زیادہ پرانی نہیں تھی لیکن بے پناہ خوبصورت تھی۔

بہرحال میں اس وسیع و عریض کمرے میں داخل ہو گیا جہاں دنیا کا اعلیٰ ترین فرنیچر اور قیمتی ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ راج شری مجھے ایک ایک چیز کے بارے میں بتانے لگی۔ سونے کے لباس کی الماریاں الگ تھیں، اعلیٰ درجے کے سوٹوں کی الماری الگ۔ گھر

میں پہننے کے کپڑے الگ، جوتے، ٹائیاں، موزے اور پھر واش روم۔ دیواروں میں جگہ جگہ خوبصورت بٹن لگے ہوئے تھے جو دیواروں کی خوبصورتی کا ایک حصہ معلوم ہوتے تھے۔ لیکن پتہ یہ چلا کہ ان سے پوری عمارت میں کسی کو بھی اطلاع دی جاسکتی تھی۔ راج شری ایک ایک چیز کے بارے میں بتانے لگی تو میں نے ازراہِ مذاق کہا۔

”سب کچھ بتا دیا تم نے راج شری۔ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ پہلی بار اس کا سراپا میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ موٹی موٹی آنکھیں، پتھر کی دیویوں جیسے موٹے اور پتلے نقوش، ہونٹوں کی اعلیٰ تراش۔ ملازمہ کی حیثیت سے اگر وہ میرے سامنے نہ آتی اور خوبصورت لباس پہنا کر سامنے کی جاتی تو راجکماری ہی لگتی۔ اس وقت ایک احساس دل میں جاگا کہ انسان کے اندر بہت سے انسان چھپے ہوتے ہیں۔ ہم سطحی نگاہ سے جس چیز کو دیکھتے ہیں ہمارا ذہن اس کا عکس ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ انہیں ملازموں کی حیثیت سے میرے سامنے لایا گیا تھا، اگر کسی بڑی حیثیت سے سامنے لایا گیا ہوتا تو اس کی دلکشی کا انداز ہی اور ہوتا۔ اس نے میٹھی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کمار جی! ہم اپنے بارے میں کیا بتائیں۔ داسی ہیں آپ کی۔ نام تو ہمارا پتہ ہے آپ کو کہ راج شری ہے۔“

”جے شری تمہاری بہن ہے؟“

”ہاں۔ جڑواں بہن۔“

”میرا یہی اندازہ تھا۔ بہرحال راج شری! تم یہاں کیا کرتی ہو؟“

”اصل میں کمار جی، یہاں ہم ہی لوگ رہتے ہیں۔ بہت پہلے یہاں کبھی زیادہ لوگ آ جاتے تھے ہندوستان سے۔ لیکن اب قولی میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ بہت سے لوگ وہاں نہیں رہے۔ رانی جی تو بہت کم آتی ہیں۔ اس لئے ہم سب ہی یہاں اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ کسی کی کوئی خاص ذمے داری نہیں ہے۔ بس سب کا ایک کام ہے، اسے چمکائے رکھیں۔ اصل میں اس میں ہندوستانی ثقافت بھی جھلکتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مقامی لوگ مطلب یہ کہ بڑے لوگ ہندوستان میں رانی جی سے اجازت لیتے ہیں اور یہاں اس فارم ہاؤس کو دیکھنے اور کبھی کبھی یہاں ٹھہرنے آ جاتے ہیں۔ لیکن ایسا اس وقت ہوتا ہے جب رانی جی اس کی اجازت دیں۔ اس لئے ہم ہمیشہ اسے اسی طرح

چمکائے رکھتے ہیں۔“

”راج شری! تم کچھ پڑھی لکھی ہو؟“

”جی مہاراج! بس اتنی کہ کام چل جائے۔“

”گڈ...... چلو ٹھیک ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو میں تمہیں بلا لوں گا۔“

اس نے ایک بھرپور نگاہ مجھ پر ڈالی اور اس کے بعد باہر نکل گئی۔ لیکن یہ بھی میرے لئے ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ میں نے اس طرح مخاطب کیا تو اس کی بھی جرأت ہوئی کہ مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھے۔ بہرحال ساری باتیں اپنی جگہ تھیں، میں تو اس بھوج پتر کے اشارے پر یہاں آیا تھا۔ چونکہ میں نے طے کرلیا تھا کہ اب فضول باتیں چھوڑ کر صرف اپنے مفاد کے لئے کام کروں گا اور اب میں اسی نظریئے پر باقی عمل کر رہا تھا۔ زندگی میں ایک پراسرار دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ حالات کی سنسنی خیزی نئی کہانیاں جنم دے رہی تھی۔ چنانچہ میں ان کہانیوں میں کھو جانا چاہتا تھا۔

غسل وغیرہ کر کے گھر میں پہننے کا ایک لباس منتخب کیا اور پھر اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ راہداری میں مجھے راج شری مل گئی۔ اس نے ایک نگاہ مجھے دیکھا اور نجانے کیوں دیر تک مجھ پر نگاہیں جمائے رہی۔ میں نے کہا۔

”رانی صاحبہ کہاں ہیں؟“

”اپنے کمرے میں ہیں۔“

”مجھے ان کے کمرے تک لے چلو۔“

”آیئے۔“

رانی کا کمرہ، رانی ہی کا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دی گئی تو اندر سے آواز آئی۔ ”کون ہے...... آ جاؤ۔“

پہلے راج شری اندر گئی اور اس نے شاید میرے بارے میں بتایا تو رانی صاحبہ کی آواز ابھری۔ ”ارے ارے تو باہر کیوں کھڑا کر رکھا ہے انہیں؟ لے آؤ۔ اندر لے آؤ۔“

میں اندر داخل ہو گیا تو رانی نے مجھے سر سے پاؤں تک تعریفی نگاہوں سے دیکھا، پھر بولی۔ ”بھگوان کی سوگند، تم واقعی شہزادے لگ رہے ہو۔ ویسے بھی تمہیں دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا۔“

"ہاں۔ عجیب شہزادہ ہو میں۔ میرے بارے میں اگر سب کچھ جان لیں گی تو حیران رہ جائیں گی۔"

"میں تو تمہیں دیکھ کر ہی حیران رہ گئی ہوں۔ چلو چھوڑو، آؤ بیٹھو۔ اچھا کیا کپڑے وغیرہ تبدیل کر لئے۔"

"آپ کیا کر رہی تھیں؟"

"بس میرے پاس سوچوں کے علاوہ اب کیا رہ گیا ہے۔ سوچوں ہی میں ڈوبی ہوئی تھی۔"

"کیا پروگرام ہے، ہم کہیں باہر نکلیں گے؟"

"کیا تمہارا دل چاہ رہا ہے باہر جانے کو؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ ابھی وقت کافی باقی ہے۔"

"ہاں۔ کافی تو نہیں ہے، بس تھوڑا سا وقت ہے۔ جیسے ہی رانا جسپال آئیں گے، تمہاری مصروفیت شروع ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے، میں ہر مصروفیت کے لئے تیار ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ میں رانی سریتا دیوی سے باتیں کرتا رہا۔ انہوں نے چندی گڑھ کے بارے میں اور میں نے سیتا گڑھی کے بارے میں انہیں تفصیلات بتائیں۔ کلکتے میں اپنے تعلیمی دور کے بارے میں بھی بتایا۔

بہرحال رانی کی باتوں سے کسی بہت اہم بات کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد اس نے کہا۔ "میں ذرا جاؤں گی۔ ہو سکتا ہے رات کو میری واپسی نہ ہو۔ اگر واپس آ گئی تو ٹھیک ہے ورنہ کوئی ضرورت ہو تو تم مجھے ہوٹل فون کر سکتے ہو۔ نمبر تو ہے نا تمہارے پاس؟"

"جی۔" میں نے کہا اور رانی چلی گئی۔

اس خوبصورت فارم ہاؤس میں اب میں تنہا رہ گیا تھا۔ دل تو چاہا کہ یہاں کے ملازمین راج شری یا جے شری سے ہردیپ سنگھ کے قتل کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ پتہ تو چلاؤں ہوا کیا تھا۔ لیکن پھر ذہن نے اس کام سے روکا۔ اگر میں ایسی تفتیش کرنے میں لگ جاتا ہوں تو رانی سوچے گی کہ میں نے اس پر اعتبار نہیں کیا اور

اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کے چکر میں پڑا رہوں گا۔ اس طرح سے بے اعتمادی کا اظہار ہو گا۔ چنانچہ یہ میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ پھر بھی رات کے خوشگوار دھندلکوں میں باہر نکل کر ٹہلنا بہت اچھا لگا۔ پھولوں کی خوشبوئیں چاروں طرف ہوا کے ساتھ چکراتی پھر رہی تھیں۔ آسمان سے دھند اتری ہوئی تھی۔ یہ نیلی کہر لندن کی زندگی کا ایک حصہ تھی۔ لیکن بہت خوشنما محسوس ہوتی تھی۔ اب یہ پتہ نہیں کہ کتنا عرصہ اسے برداشت کیا جا سکتا تھا۔ کوئی میرے نزدیک نہیں آیا۔ میں نے البتہ ان لوگوں کو اپنے اطراف میں مستعد پایا۔ غالباً یہ مسلح بھی تھے۔ میرے ذہن میں ایک خیال اور آیا وہ یہ کہ جن لوگوں نے پرنس ہردیپ سنگھ کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی کہیں وہ دوبارہ اس طرف کا رخ نہ کریں۔ لیکن میرے پاس ایک مضبوطی موجود تھی۔ اپنے بیڈ روم میں آ کر میں نے بھوج پتر دیکھا، وہ بالکل صاف تھا۔ گویا اس پر کوئی نئی ہدایت یا کوئی نئی پیشین گوئی نہیں تھی۔ کمال کی چیز تھی یہ جادو کی قندیل بھی۔ میں نے احتیاط سے اسے اپنے تکیے کے نیچے محفوظ کیا اور پھر کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔

نجانے کتنی دیر تک نیند نہیں آئی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ ذہن پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ میں اسے نیند تو نہیں کہہ سکتا تھا، بس غشی یا نیم خوابی کی کیفیت ضرور طاری ہو گئی تھی۔ دروازے پر قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر میں نے اینہ کو دیکھا جو اپنے سرخ حسین لباس میں دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی۔ اینہ کو دیکھ کر میرے وجود میں مسرت کی لہریں گردش کرنے لگیں۔ وہ میرے قریب آئی اور میرے بستر پر بیٹھ گئی۔

"کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں اینہ! تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

"موت کی وادیوں میں۔" اس نے جواب دیا۔

"تو وہاں سے پلٹ کیسے آئیں؟"

"تمہارے لئے۔"

"میرے لئے؟"

"ہاں، تمہاری محبت مجھے تمہارے قریب کھینچ لائی۔"

"میں نے تمہیں بہت یاد کیا اینہ! یقین کرو میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔"

"میں جانتی ہوں، میرے اور تمہارے درمیان نجانے کیوں اتنا گہرا رشتہ قائم ہو گیا۔"

"آؤ اینہ! قریب آ گئی ہو تو اتنے فاصلے کیوں اختیار کئے ہوئے ہیں؟"

"تمہارے کہنے کا انتظار کر رہی تھی۔" اس نے اپنا سرخ لباس اپنے جسم سے جدا کر دیا اور میرے قریب آ کر میرے وجود میں سما گئی۔ اینہ کی ان گرم قربتوں نے مجھے سرشار کر دیا۔ میرے سانس بے ترتیب ہونے لگے۔ اینہ خود بھی بھرپور محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ ہم دونوں دنیا سے بیگانہ ہو گئے۔ اینہ کی قربتیں ہمیشہ ہی مجھے اپنے وجود سے بیگانہ کر دیتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں اس کی موت کو بھلا نہیں سکا تھا۔ وہ میرے وجود میں شامل تھی۔ اور میں آخر کار اس کے گرم وجود کو اپنے سینے سے لپٹا کر گہری نیند سو گیا۔

پھر اس وقت آنکھ کھلی جب اچانک ہی مجھے اپنے سینے پر دو ہاتھ چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔ کوئی مجھے اپنے آپ سے دور دھکیل رہا تھا۔ لیکن میرے ہاتھ کی گرفت اس کے گرد اس طرح سخت تھی کہ اسے دقت ہو رہی تھی۔ میرے حواس جاگے تو مجھے اس سڈول اور چکنے بدن کا احساس ہوا جو میرے ہاتھوں کی گرفت میں تھا...... میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا اور دفعتہً میرے جسم کو اس طرح کرنٹ لگا کہ میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ میری گرفت سے نکلی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ کچھ لمحوں کے لئے اسے اپنے بے لباس وجود کا بھی احساس نہیں رہا تھا۔ لیکن وہ اینہ نہیں تھی، وہ تو راج شری تھی...... راج شری جس کے چہرے پر گزری رات کا خمار منجمد تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ میں بھی حیران نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

راج شری نے چاروں طرف دیکھا، پھر اس کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اور کچھ تو اسے مل نہ سکا اس نے جلدی سے بستر کی چادر گھسیٹی اور اپنے بدن کے گرد لپیٹ لی۔ پھر اس کی روتی ہوئی آواز ابھری۔

"میرے کپڑے...... میرے کپڑے۔" اور پھر وہ اس طرح ایک طرف دوڑی کہ چادر میں الجھ کر زمین پر گر پڑی۔ بری طرح بدحواس ہو رہی تھی۔ چادر ایک بار پھر اس کے بدن سے اتر گئی۔ وہ اس طرف لپک رہی تھی جہاں ایک صوفے پر اس کا لباس پڑا ہوا تھا۔ اس نے جھپٹا مار کر اپنا لباس اٹھایا۔ چادر تو پیچھے ہی رہ گئی تھی۔ لباس لے کر وہ غسل خانے کی جانب دوڑی اور ایک بار پھر راستے میں گری۔ میں اس کی بدحواسی کو حیران نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ خود میرے حواس بھی ٹھکانے نہیں آئے تھے۔ یہ کیا ہوا؟

رات کا خواب میری آنکھوں میں در آیا۔ سرخ لباس میں ملبوس اینہ میرے پاس آئی تھی اور میری قربتوں سے لطف اندوز ہوئی تھی۔ حالانکہ مجھے اس کی موت کا علم تھا اور میں بار بار اس سے اس کی موت کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے اس کے وجود کا بھی احساس تھا۔ میرے فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ وہ راج شری ہو گی۔"

کچھ لمحوں کے بعد راج شری باہر نکل آئی۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اس نے چور نگاہوں سے مجھے دیکھا تو میں نے اس سے کہا۔

"راج شری! ادھر آؤ۔" وہ ٹھٹک کر رک گئی تو میں نے دوبارہ کہا۔ "سنا نہیں تم نے، ادھر آؤ۔"

وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آئی۔ گردن جھکی ہوئی تھی۔ دفعتہً ہی وہ میرے پیروں سے لپٹ گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔

"بھگوان کی سوگند کمار! بھگوان کی سوگند۔ ہم جان بوجھ کر ادھر نہیں آئے تھے۔ کسی پراسرار قوت کا شکار ہو گئے تھے ہم۔ بھگوان کی سوگند کمار! ہم سو رہے تھے کہ خواب دیکھا۔ کمار، ہم نے خواب دیکھا کہ آپ ہمیں بلا رہے ہیں، کچھ حکم دے رہے ہیں آپ۔ بھگوان کی سوگند، جھوٹ بولیں تو کتے کی موت مر جائیں۔ ہم نیند میں چلتے ہوئے یہاں تک آئے ہوں گے۔ ہمیں نہیں پتہ کہ خود یہاں آئے تھے یا ہمیں کوئی لایا تھا۔ کمار! بھگوان کی سوگند ہم جھوٹ نہیں بول رہے۔ ہمیں معاف کر دیں کمار، ہمیں معاف کر دیں۔" وہ بلک بلک کر رونے لگی تو مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ میں نے اس سے کہا۔

"میں نے تم سے کچھ کہا تو نہیں ہے راج شری۔"

"کمار! ہم سے بڑا پاپ ہوا ہے کمار، ہم مر جائیں گے۔ ہم جیتے نہیں رہیں گے۔"

"مگر کیوں؟" میں نے کہا۔

"کمار! ہم نے...... ہم نے اپنی اوقات سے بڑھ کر پاپ کیا ہے۔ کمار، ہم تو چرنوں کی دھول ہیں آپ کی کمار! ہمیں معاف کر دیں۔"

"اچھا، اچھا بابا اچھا۔ چلو میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ ٹھیک ہے؟ ذرا بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ ہوا ہے اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ میں بھی خواب کے عالم میں تھا تو تم یقین نہیں کرو گی راج شری۔ میں نے خواب میں اپنی...... مگر چھوڑو، ان کہانیوں سے کیا فائدہ۔ جو کچھ بھی ہوا ہے اچھا ہوا ہے یا برا ہوا ہے لیکن ایک بات کا

یقین رکھو میری زبان سے اس بارے میں کبھی کچھ نہیں نکلے گا۔ اور یہ مت سمجھنا کہ میں ایک عیاش طبع آدمی ہوں اور صرف یہ محسوس کر کے میں نے تمہیں اپنی قربت میں قبول کر لیا کہ تم خود اٹھ کر میرے پاس آ گئی ہو۔ تمہیں البتہ اس بات کا اندازہ ہونا چاہئے تھا کہ میں نے تمہیں ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔"

"ہم جانتے ہیں مہاراج، ہم جانتے ہیں کمار۔ دوش ہمارا ہی ہے۔"

"دوش کسی کا بھی ہے، تم اس بات کو کسی سے کہو گی نہیں۔ رانی صاحبہ کو اس کی بھنک بھی نہیں ملنی چاہئے۔ ورنہ پھر نتیجے کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔ اب جاؤ، کوئی آ بھی سکتا ہے اتنی صبح تمہیں میرے کمرے سے نکلتے دیکھ کر لوگوں کو ویسے ہی شک ہو جائے گا۔ جاؤ۔"

وہ لرزتے قدموں سے واپس چلی گئی اور میں ان انوکھے واقعات پر غور کرنے لگا وردان سادھانی، سیوک سندھورتی سارے کے سارے لوگ مجھے نیکیوں کی تلقین کر رہے تھے یہاں تک کہ میں نے خود بھی یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں اینہ کے بعد اب ایسے جال میں نہیں پھنسوں گا۔ جن خوفناک واقعات اور لمحات سے گزر کر مجھے اس زندگی تک آنے کا موقع ملا تھا اس کے بعد تو یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ میں اور کچھ نہیں ملا تو اس بھ پتر پر ہی انحصار کرنے لگا تھا۔ بہرحال جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ میرا لباس بھی حیرت انگیز طور پر غسل خانے میں ٹنگا ہوا تھا۔ غسل کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ آخر یہ ہوا کیا تھا؟ بستر پر لیٹا تھا اور بڑے پُر انداز میں لیٹا تھا۔ اینہ کا خواب آیا اور اس کے بعد اینہ کی جگہ راج شری نمودار ہوئی۔ یہ تو بڑا عجیب چکر تھا۔ لیکن پھر راج شری کے گداز وجود کا احساس ہوا اور پچھلی باتیں یاد آ گئیں۔ عالیہ زمان، ایلس فیوری، اینہ اور کچھ اور کردار جو میری زندگی میں گھس آئے تھے۔ حقیقت یہی ہے کہ میں یہی جملے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میری زندگی میں گھس آئے تھے، میں نے خود کسی کو تلاش نہیں کیا تھا۔ خدا جانے میری زندگی سے یہ اسرار کیوں چمٹ گئے ہیں اور یہ مجھے کہاں سے کہاں لے جائیں گے۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ جے شری اندر داخل ہوئی اور اس نے دونوں ہاتھوں مجھے پرنام کیا اور بولی۔ "رانی جی نے کہا ہے کہ ناشتہ ان کے ساتھ کر لیجئے گا۔"

"رانی جی رات کو واپس آ گئی تھیں؟"

"نہیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے آئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، چلو مجھے بتاؤ کہاں ہیں وہ؟" میں نے کہا اور جے شری کے ساتھ چل پڑا۔ لیکن میں نے چور نگاہوں سے جے شری کا چہرہ دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی خاص بات نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا نام جے شری ہے نا؟"

"جی مہاراج۔"

"اور وہ تمہاری بہن راج شری...... تم میں سے بڑا کون ہے؟"

"میں اس سے بیس منٹ بڑی ہوں مہاراج۔" جے شری نے کہا اور مسکرا دی۔

"کہاں ہے وہ؟" میں نے اصل سوال کیا۔

"بستر میں لیٹی ہے۔ بخار چڑھا ہوا ہے بیچاری کو۔ شاید موسم کا اثر ہو گیا ہے۔"

میں نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور راج شری کے بارے میں سوچتا ہوا اس خوبصورت ڈائننگ ہال میں داخل ہو گیا جو اس عمارت کے ایک خوبصورت گوشے میں تھا۔ رانی سریتا دیوی سفید سلک کے ڈھیلے ڈھالے لبادے میں کوہ قاف کی پری ہی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا سفید خوشنما وجود اپنی تمام تر نفاستوں کے ساتھ موجود تھا۔ پُرمحبت انداز میں آگے بڑھی اور میرے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور مجھے اپنے سینے سے لگایا۔ پھر میری پیشانی چومی اور میرا چہرہ اپنے چہرے کے سامنے کر کے مجھے دیکھنے لگی۔ میں بھی مسکرا دیا۔

"آپ رات کو وہیں ہوٹل میں رہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں بیٹھو۔ ہوٹل میں ہی رہی اور رات کو تین بجے تک تمہارے بارے میں سوچتی رہی۔" سریتا دیوی نے کہا۔

"کیا سوچتی رہیں آنٹی؟"

"جے شری! چلو ناشتہ لگاؤ۔ بھوک لگ رہی ہے۔"

جے شری گردن جھکا کر باہر نکل گئی۔

"بتایا نہیں آپ نے، کیا سوچتی رہیں آنٹی؟"

"بس، انسان چاہے آسمان کی بلندیوں پر پہنچ جائے، رہتا انسان ہی ہے۔ میں یہ سوچتی رہی کہ تم کس قدر پُرکشش اور پیارے نوجوان ہو۔ کاش تم میری اولاد ہوتے۔ کتنا فخر کرتی میں تم پر ماں باپ نہیں ہیں نا تمہارے؟"

"جی کبھی کا کھو چکا ہوں میں انہیں۔"

"ایک بات کہوں خاقان! دین دھرم انسان کے جیون کا ایک حصہ ہوتے ہیں اور بے شک ہر شخص اپنے دھرم کو اوپر رکھنا چاہتا ہے۔ اگر میں تم سے کہوں کہ اپنے دھرم کو میرے لئے مت بدلنا مگر مجھ سے دور بھی مت ہونا، کوئی بھی نام، کوئی بھی حیثیت اختیار کر لینا میرے پاس تو کیا تم میری بات مان جاؤ گے؟"

میں مسکراتی نگاہوں سے رانی سریتا کو دیکھتا رہا، پھر میں نے کہا۔ "جھوٹ بولوں یا سچ؟"

"نہیں، پلیز سچ۔"

"رانی صاحبہ! آپ کو میری زندگی کے جتنے حالات معلوم ہوئے ہیں، ان سے آپ نے کم از کم یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میں بھی ایک الجھا ہوا انسان ہوں۔ میری زندگی کی ڈور سلجھ جائے، مجھے یہ پتہ چل جائے کہ اس دنیا میں میرا کیا مقام ہے، فیصلہ تو تبھی کر سکتا ہوں نا اپنے مستقبل کے بارے میں۔ جذباتی طور پر کچھ بھی کہہ دوں، ایک بے حقیقت چیز ہوگی۔ اور کم از کم آپ جیسی شخصیت کو میں کسی بھی طرح کے دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ سمجھ رہی ہیں نا آپ؟"

رانی نے پیارا سا منہ بنا کر زور زور سے گردن ہلائی اور بولی۔ "ہاں سمجھ رہی ہوں۔ لیکن میری اس پیشکش کو تو ذہن میں رکھو گے نا؟"

"ہاں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر آپ پسند کریں تو میں ایک لمبے عرصے تک آپ سے جدا نہ ہوں۔ بات اصل میں یہ ہے رانی صاحبہ! کہ اس کی وجہ یہ نہیں ہوگی کہ میں آپ کی حیثیت سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ معافی چاہتا ہوں یہ الفاظ کہتے ہوئے کہ میں نے بھی شہزادوں ہی کی طرح زندگی گزاری ہے۔ بس سمجھ لیجئے کہ آپ کا یہ پیار اس دنیا میں اپنی تنہائی کا شکار ہو کر اگر میں آپ کے ساتھ رہنے پر آمادگی ظاہر کر دوں تو براہِ کرم میری حیثیت پر شک نہ کیجئے گا۔"

"ایک بار پھر دل چاہ رہا ہے کہ اٹھوں اور تمہیں دیر تک سینے سے لگائے رکھوں۔ مگر پہلے ناشتہ پھر کچھ اور۔" رانی سریتا نے کہا اور ناشتے کی جانب ہاتھ بڑھا دیئے۔ میں بھی اس کے ساتھ ناشتہ کرنے لگا۔ میں مصروف ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ سریتا کے ذہن سے محبت کا یہ بھوت اترتا چلا گیا۔ ناشتے سے فراغت تک وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ایک بات میں تمہیں بتاؤں، خود پرنس ہردیپ سنگھ بہت اچھا لڑکا ہے۔ لیکن کچھ

جذباتی سا ہے۔ حالانکہ خاقان، تم خود سوچو، جذبات ہی تو انسان اور جانور میں شناخت کرتے ہیں بلکہ یہ لفظ بھی میں غلط کہہ رہی ہوں، جانوروں میں بھی جذبات ہوتے ہیں جن کا مظاہرہ ہزاروں بار ہو چکا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا انداز ذرا مختلف ہوتا ہے اور ہم انہیں اپنی ترازو میں نہیں تولتے۔ میں نے بارہا اسے اپنی محبت کے ذریعے متاثر کرنا چاہا، یہ بتانے کی کوشش کی اسے کہ میں اسے چاہتی ہوں۔ لیکن کبھی اس نے مجھے اس طرح جواب نہیں دیا، بس سپاٹ رہتا۔ بالکل سپاٹ۔ پتہ نہیں کیوں۔ البتہ ایک دل کی بات میں تم سے اور کہوں جیسا کہ میں اپنا تجزیہ تمہیں بتاتی رہتی ہوں، انسان ہر حالت میں جواب چاہتا ہے۔ وہ اگر کسی سے پیار کرتا ہے تو چاہے کتنا ہی انحراف کرے لیکن جواب میں وہ اس سے پیار ہی چاہتا ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر اس کے دل میں بھی فاصلے پیدا ہونے لگتے ہیں اور یہ فاصلے ذہنی طور پر بہت دور لے جاتے ہیں۔ مجبوریاں الگ ہوتی ہیں اور محبت الگ۔ میں سمجھتی ہوں مجبوری کے ہاتھوں اگر کوئی عمل کرنا پڑے تو اس کا دل سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہوتا۔ جبکہ دل کے ہاتھوں اگر کچھ کرنا پڑے تو انسان کی کیفیت بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔ پرنس ہردیپ سنگھ کے بارے میں بھی بس تم یہ سمجھ لو کہ میں جذبات سے نہیں ضرورت سے سوچتی ہوں۔ اس کی زندگی اور اس کا روپالیہ سے منسلک ہو جانا میرے ایک بہت بڑے مقصد کی تکمیل کرتا ہے اور میں یہ دعویٰ کرتی ہوں کہ جب تمہیں اس مقصد کے بارے میں معلوم ہوگا تو تم بھی میری اس جدوجہد کی تصدیق کرو گے۔ میں اس لئے تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں کہ کم از کم ایک شخص تو ایسا ہو جس سے میرا دلی لگاؤ ہو اس احساس کے ساتھ کہ اس نے میرے مشکل وقت میں میری مدد بھی کی اور مجھے میری پسند کا پیار بھی دیا۔ میرے الفاظ سمجھ رہے ہو نا تم؟ میری پسند کا پیار یہ ہے کہ میں تمہیں اپنے بیٹے کی طرح چاہوں۔ کیا بات ہے، تم رک کیوں گئے؟ ناشتہ کرو۔"

میں رانی سریتا کی جذباتی کیفیت پر غور کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی مجھے اپنے دل کو بھی ٹٹولنا تھا۔ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے کیا میں اس پر عمل بھی کر سکوں گا؟ لیکن جو واقعات مجھ پر گزرے تھے، جتنے کردار میری زندگی میں آئے تھے ان میں ایک بات مشترک تھی۔ وہ یہ کہ اگر میں ان کی خواہش کے مطابق ان سے محبت کا اظہار کروں تو سب ٹھیک ہے ورنہ باقی کچھ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ وہی ایک طریقہ مناسب ہوگا۔

ناشتے سے فراغت حاصل ہوگئی۔ یہ سن کر مجھے افسوس ہوا تھا کہ راج شری بیمار ہوگئی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ راج شری کے پاس جاؤں اور اس سے اس کی طبیعت پوچھوں۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ راج شری کی قربت نے مجھے ایک عجیب سا سکون دیا تھا اور میں اس سے ناخوش نہیں ہوا تھا۔

بہر حال یہ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں اور میں خاصی الجھنوں کے عالم میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب مجھے نجانے کب تک ہردیپ کا کردار ادا کرنا پڑے گا۔ البتہ ایک اور تعجب خیز بات ہوئی تھی۔

واپس آنے کے بعد میں نے بھوج پتر پر آگے کی تصویریں دیکھنا چاہی تھیں۔ لیکن بھوج پتر کو رات کو میں نے تکیے کے نیچے رکھا تھا، وہ تکیے کے نیچے موجود نہیں تھا۔ میں نے اسے پورے کمرے میں ہی تلاش کر ڈالا اور دیوانوں کی طرح چاروں طرف دیکھنے لگا۔ الماری میں، باتھ روم میں، ہر جگہ دیکھا لیکن بھوج پتر کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ کہاں گیا؟ کہاں جا سکتا ہے؟ ابھی تک کمرے کی صفائی بھی نہیں کی گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ ان لوگوں سے جو میرے کمرے میں آتے ہیں اس بارے میں معلوم کروں اور ترکیب سے میں نے جے شری اور دوسرے لوگوں سے معلومات بھی حاصل کر لیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایک پتا میرے تکیے کے نیچے پڑا ہوا تھا، ان میں سے کسی نے اسے دیکھا تو نہیں ہے؟ سبھی نے انکار کر دیا تھا۔ تب میں نے سوچا کہ وہ پراسرار چیز میرے پاس آتی جاتی رہی ہے اور چونکہ وہ خاص طور سے مجھے دی گئی تھی اس لئے میری ہی ملکیت تھی۔ اب اگر وہ نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے میرے پاس سے چلے جانا تھا۔ اگر مجھے اس کی ضرورت ہوئی تو یقینی طور پر وہ پھر واپس آ جائے گا۔ بہر حال یہ میرے لئے فکر کی بات تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد سریتا میرے کمرے میں آ گئی۔

"ہیلو...... وہ کام ہو گیا جس کا ہمیں انتظار تھا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ابھی کچھ دیر قبل رانا جسپال کا فون آیا تھا۔ وہ فرانس سے واپس آ گیا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد ہمارے پاس پہنچ رہا ہے۔"

نجانے کیوں رانی سریتا کے ان الفاظ میں، میں نے ایک سنسنی سی محسوس کی تھی۔

اس کے بعد ہم رانا جسپال کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ ملازموں کو ہوشیار کر دیا گیا

تھا۔ اس بات کے امکانات بھی تھے کہ رانا جسپال اپنے ساتھ روپالیہ کو بھی لے کر آئے گا۔

پھر رانا جسپال کی رولز رائس کو ہم نے فارم ہاؤس کی عمارت میں داخل ہوتے دیکھا۔ رولز رائس رکی اور اس سے جو شخص نیچے اترا وہ لمبے چوڑے بدن کا ایک شاندار آدمی تھا۔ بہت ہی اسمارٹ اور چوڑے چکلے بدن کا مالک۔ سرخ و سفید چہرہ، بڑی بڑی مونچھیں۔ وہ صرف اپنے ڈرائیور کے ساتھ آیا تھا۔ رانی نے مجھے اشارہ کیا اور ہم دونوں اس کے استقبال کے لئے باہر نکل آئے۔ رانی صاحبہ نے بڑے پُرتپاک انداز میں رانا جسپال کا استقبال کیا اور رانا جسپال کی نگاہیں میری جانب اٹھ گئیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ رانی سے ملاقات کرنے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا اور پُرتپاک لہجے میں بولا۔

"آہ، پرنس ہردیپ! مائی سن، کیسے ہو تم؟"

مجھے دیکھ کر اس نے یہ اندازہ لگا لیا کہ میں ہی پرنس ہردیپ ہو سکتا ہوں۔ میں بغور اس کے چہرے اور اس کے عضلات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اصل میں یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا میں کہ رانا جسپال کہیں مجھے دیکھ کر چونکتا تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ کسی طرح اصل ہردیپ سنگھ کے چہرے کو پہچانتا ہو اور مجھے دیکھ کر حیران ہو جائے۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کے انداز میں بڑا پُرتپاک خیر مقدم تھا۔ میں نے بھی اس سے پُرجوش مصافحہ کیا، پھر ہم اسے لے کر اندر آ گئے اور رانا جسپال سے کہا۔

"غلطی مجھ سے ہوئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں جس کام کے لئے جا رہا ہوں اس میں کچھ گھنٹوں سے زیادہ نہیں لگیں گے مجھے اور میں واپس آ جاؤں گا۔ لیکن جن لوگوں سے مجھے ملنا تھا وہ وقت اور زبان کے پابند لوگ نہیں تھے۔ وہ صحیح وقت پر نہ پہنچے۔ لیکن ان کا انتظار کرنا بڑا ضروری تھا۔"

"آپ جس کام سے گئے تھے وہ کام ہو گیا رانا صاحب؟" سریتا دیوی نے رانا جسپال کو ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر بیٹھنے کی پیشکش کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، کام تو ہو گیا۔"

"اور ہماری بیٹی کیسی ہے؟"

"روپالیہ بالکل ٹھیک ہے اور آپ لوگوں سے ملنا چاہتی ہے۔"

"ہم اس سے ملاقات کے لئے خود بے چین ہیں۔" سریتا دیوی نے کہا۔ حالانکہ وہ

یہ بھی کہہ سکتی تھیں کہ رانا جسپال اسے لے کیوں نہ آیا۔ لیکن جس عزت و احترام کا مظاہرہ کرنا چاہئے تھا، وہی کیا جا رہا تھا۔ یہ کہنے والی بات نہیں تھی۔ رانا جسپال کی نگاہیں بار بار میری جانب اٹھ رہی تھیں اور جب میں اسے دیکھتا تو وہ دوسری جانب متوجہ ہو جاتا تھا گویا وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں کس طرح کا انسان ہوں۔ البتہ اس بات کا تو مجھے بھی پورا پورا یقین ہو گیا تھا کہ اسے پرنس ہردیپ کی اصل شخصیت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ بہرحال ہم لوگ باتیں کرتے رہے۔ رانا نے کہا۔

"رانی صاحبہ! یہ بتایئے کہ آپ کب ہمارے پاس آنے کے لئے وقت نکال سکیں گی؟"

"رانا صاحب! وقت نکالنے کی کیا بات کہی آپ نے۔ میں تو آئی ہی آپ کے لئے ہوں۔"

"ہاں، یقیناً۔ آپ تشریف لایئے۔ رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں گے۔ وہیں آپ کی ملاقات روپالیہ سے ہو جائے گی اور اس کے بعد ہم اور بہت سی باتیں کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

تھوڑی بہت خاطر مدارت کے بعد رانا جسپال رخصت ہونے لگا۔ بولا۔ "میں آپ لوگوں کے ساتھ اور بھی وقت گزارتا، خاص طور سے مجھے پرنس ہردیپ کی شخصیت بہت پسند آئی ہے۔ لیکن بعد میں سہی۔ اصل میں آنے کے بعد میں نے فوراً آپ سے رابطہ قائم کیا اور سوچا کہ پہلے آپ سے مل لوں پھر دوسرے کام کروں گا۔"

"بہت بہت شکریہ۔"

رانا جسپال کے جانے کے بعد رانی سریتا نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے خود بھی اس شخص کے بارے میں کچھ اندازہ لگایا؟"

"ذہین، زیرک اور سمجھدار آدمی ہے۔ لیکن میں پھر اپنی اسی تشویش کا اظہار کروں گا کہ اگر کسی وقت انہیں پتہ چل گیا کہ میں اصل ہردیپ نہیں ہوں؟"

"پلیز...... پلیز...... پلیز...... میں تو یہ چاہتی ہوں کہ تم یہ تصور اپنے ذہن پر مسلط کر لو کہ تم اصل ہردیپ ہو۔ اس کے بعد کے معاملات ہم بعد میں دیکھیں گے۔ میں بس کچھ وقت ٹالنا چاہتی ہوں۔"

میں ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا تھا۔

دو گھنٹے تک سریتا دیوی مجھے بریف کرتی رہی، ایک ایک چیز کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ میں کسی بھی سلسلے میں مار نہ کھاؤں اور مجھ سے کوئی سوال کیا جائے تو میں اس کا تسلی بخش جواب دے دوں۔ میں نے بھی اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کر لیا تھا۔ غرض یہ کہ یہ سارا سلسلہ جاری رہا۔ پھر رانی سریتا دیوی کسی کام سے چلی گئی۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ یہاں اس فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام کے علاوہ اور کوئی ایسی جگہ ہے جہاں وہ جاتی ہیں یا رات کو جہاں وہ رہی۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں رات گزارنے کی بظاہر تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ البتہ جب وہ چلی گئی تو میرے ذہن میں راج شری کا خیال آیا اور میں بے اختیار اس کی طرف چل پڑا۔ اس عورت نے مجھے امینہ کی موت کے بعد اپنی قربت دی تھی۔ جو کچھ ہوا تھا، نادانستگی میں ہوا تھا۔ لیکن بہرحال ہوا تو تھا۔ وہ اپنے کمرے میں تھی اور جے شری ہمدردی سے اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے اس کے پاس بیٹھی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے ایک افسوس کا سا احساس ہوا۔ جے شری مجھے دیکھ کر جلدی سے کھڑی ہو گئی تھی۔

"وہ...... پپ...... پرنس...... مم...... میں......"

"کوئی بات نہیں ہے جے شری! آپ بیٹھئے۔ ظاہر ہے آپ راج شری کی بہن ہیں۔"

"شکریہ پرنس، میں چلتی ہوں۔ آپ راج شری کے پاس آئے ہیں، بیٹھئے باتیں کیجئے۔" راج شری بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے اس سے بھی کہا۔

"نہیں راج شری! اگر تم نے تکلف کرنے کی کوشش کی تو چلا جاؤں گا یہاں سے۔ بیٹھی رہو آرام سے اور یہ کمبل اپنے بدن پر ڈالے رکھو۔" میں نے اس کے بستر کے قریب پہنچ کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا، اس وقت اسے بخار نہیں تھا۔ پھر میں نے اس کی گردن چھو کر دیکھی، راج شری کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ میں مسہری پر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ جے شری جا چکی تھی۔

"بخار کیوں آ گیا راج شری؟"

"بس کمار جی، مجھے نہیں معلوم۔"

"راج شری! میرے دل میں بڑی شرمندگی کا احساس ہے۔ لیکن جو کچھ ہوا ہے راج شری......"

"ہم جانتے ہیں مہاراج! دوش تو ہمارا ہی تھا۔"

"کیا واقعی تمہارا دوش تھا؟"

"مم...... مہاراج...... مم، میں......"

"نہیں، میرا مطلب ہے کہ جو کچھ ہوا ہے وہ بڑا ساحرانہ عمل ہے۔ نجانے کس طرح تم اپنے قدموں سے چل کر میرے پاس پہنچیں اور نجانے کیوں میں تمہاری طرف متوجہ ہو گیا۔" میں نے جان بوجھ کر اس سے امینہ کا تذکرہ نہیں کیا۔ کسی عورت کے لئے یہ اور تڑپا دینے والی بات تھی کہ اس کی قربت کسی اور کے دھوکے میں حاصل کی جائے۔ اس بے چاری کے پاس تو کچھ نہ رہا۔ چنانچہ یہ بتانا میں نے پسند نہ کیا کہ میں نے خواب میں امینہ کو دیکھا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"دیکھو راج شری! موجودہ زمانے میں اور خاص طور سے لندن جیسی جگہ پر بڑی کھلی آزادی ہے تو انسان آپس میں ہر طرح کے تعلقات قائم کر سکتے ہیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ لیکن راج شری، جو کچھ ہوا ہے بس سمجھ لو بالکل ایک اتفاق ہے۔ میں اس سلسلے میں ہر ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار ہوں اور میری خواہش ہے کہ تم مجھے گائیڈ کرو۔ مجھے بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

راج شری نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر آہستہ سے بولی۔ "ہم آپ سے کچھ کہنے کا ادھیکار نہیں رکھتے مہاراج! اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم خود دوشی ہیں۔ ہم ہی تو آپ کے پاس گئے تھے۔ آپ نے نہ ہمیں بلایا نہ آپ ہمارے پاس آئے۔ دوشی تو ہم ہی ہیں نا ہر طرح سے۔ پر اس کے باوجود آپ اتنی مہربانی سے کام لے رہے ہیں تو بس آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں بولو۔"

"آپ کو بھگوان کی سوگند، کسی سے یہ بات نہ کہیں۔ رانی جی سے بھی نہیں، کسی سے بھی نہیں۔ بولیں، وعدہ کرتے ہیں آپ؟"

عجیب سی بات تھی۔ پتہ نہیں راج شری کیا سوچ رہی تھی۔ لیکن بہرحال اس کی خواہش تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "اگر تمہاری بہن جے شری کو اس بات کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے تو بھی میری ذمہ داری نہیں ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اطمینان رکھو، میرے منہ سے کبھی اس رات کی کہانی نہیں نکلے گی۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔ دیر تک میں اسے دلاسا دیتا رہا۔ اب میں

اس سے کیا کہتا کہ اس کی عزت کی قیمت کیا ادا کروں۔ بہرحال بہت زیادہ دیر اس کے پاس بیٹھنا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ سریتا دیوی کسی بھی وقت آ سکتی تھی۔ اور جب راج شری یہ چاہتی تھی کہ میں یہ بات کسی سے نہ کہوں تو اس کی جانب التفات بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اپنے کمرے میں واپس آنے کے بعد میں بڑی دیر تک یہ سوچتا رہا کہ آخر ایسا کیوں ہوا ہے؟ اس کی کوئی وجہ تو بظاہر نہیں تھی۔ سریتا دیوی دوپہر کو آئی۔ ہم دونوں نے ساتھ کھانا کھایا۔ اس کے بعد سریتا نے کہا۔

"اب ایسا کرتے ہیں دو گھنٹے آرام کئے لیتے ہیں، اس کے بعد تیاریاں کر لیں گے۔"

کھانے کے بعد میں بھی اپنے کمرے میں آ گیا۔ بھوج پتر کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر میرے پاس سے غائب ہو چکا تھا۔ میں نے بھی سوچا کہ بھاڑ میں جائے سب کچھ۔ اب وقت کے ساتھ ساتھ تو چلنا ہی ہے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ چنانچہ میں بھی آرام کی نیند سو گیا۔

کوئی ساڑھے چار بجے آنکھ کھلی تو اٹھ کر تیاریاں کرنے لگا۔ رانی کو شاید یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میں جاگ گیا ہوں۔ چنانچہ وہ بھی اپنی تیاریوں میں مصروف رہی۔ ایک خوبصورت رنگ کا سوٹ جو یقینی طور پر پرنس ہردیپ سنگھ کا ہو گا اور میرے جسم پر اس طرح فٹ تھا جیسے میرے پورے بدن کا ناپ لے کر تیار کیا گیا ہو، میں نے پہنا اور اس کے بعد ہر قسم کے کیل کانٹے سے لیس ہو گیا۔ رانی خود بھی تیار ہو کر ہی میرے پاس آئی تھی اور اس نے تعریفی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"ایک بات کہوں؟" وہ ایک حسین مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"جی آنٹی؟"

"بھگوان کی سوگند، ہردیپ تمہارے سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ بھی اچھا اور سندر جوان تھا، بالکل اپنے باپ کی طرح۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے پتا جی بھی ایک کبرو جوان تھے۔ تم لحہ لحہ میرے دل و دماغ پر طاری ہوتے جا رہے ہو اور میں نہیں جانتی کہ کہاں تک پہنچو گے۔"

رانی سریتا نے خود بھی ایک انتہائی خوبصورت لباس پہنا ہوا تھا اور اپنی پُروقار شخصیت کے ساتھ وہ بہت دلکش نظر آ رہی تھی۔ نجانے کیوں خاموش سی ہو گئی تھی۔ ہم قیمتی کار میں بیٹھ کر چل پڑے۔ دیر تک رانی سریتا خاموش رہی پھر خود ہی بول پڑی۔

"اصل میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میری کوئی سنتان نہیں تھی۔ ساری زندگی اولاد کے لئے ترستی رہی۔ پھر میرے پتی قتل ہو گئے۔ بہت زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ میں نجانے کیسی کیسی کیفیتوں کا شکار ہو گئی۔ اور وہ ہردیپ، اگر وہ میرے پاس رہتا تو ہو سکتا ہے مجھے اس سے بہت زیادہ محبت ہو جاتی۔ دور رہنے والے خودبخود دل سے دور ہو جاتے ہیں۔ یا پھر یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ دل سے دور نہیں ہوتے، بلکہ یہ فاصلے زیادہ لمبے ہو جاتے ہیں۔ چھوڑو، میں بھی کیسی باتوں میں الجھ گئی۔ رانا جسپال جی یہاں لندن میں بڑا اچھا مقام رکھتے ہیں۔ اعلیٰ حلقوں میں ان کا بڑا نام ہے۔ مقامی حکومت ان کی بڑی عزت کرتی ہے۔ بس کیا بتاؤں تمہیں کیسے عجیب و غریب حالات ہیں۔ ویسے میرے ساتھ قولی چلو گے نا؟"

مجھے ایک دم احساس ہوا کہ رانی ذہنی طور پر کچھ بھٹک گئی ہے۔ شاید کسی گہری سوچ میں گم ہے اور یہ سوچ کر اچانک بول پڑی ہے کہ کچھ نہ کچھ بات کرنی چاہئے۔ تاکہ میں کسی شبہے کا شکار نہ ہو جاؤں۔ اب اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا دنیا کے بارے میں کہ لوگوں کی سوچ سمجھ سکوں۔ رانی نے اپنے سوال کا کوئی جواب نہیں طلب کیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ سوال اس نے جواب کے لئے کیا ہی نہیں تھا چنانچہ میں نے بھی کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اپنی طرف کے مناظر دیکھتا رہا۔

میرے ذہن میں یہی خیالات آ رہے تھے کہ دیکھیں یہ رانا جسپال کیا چیز ہیں اور رانی سریتا دیوی کے ہنگامے کب تک جاری رہتے ہیں۔ ویسے اس کے سوال پر بھی میں نے غور کیا تھا۔ وہ مجھے قولی لے جانا چاہتی تھی۔ ہندوستان...... کیا وہ ویسے واقعی خطرناک ثابت نہیں ہو گا؟ جبکہ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ انگریز حکومت اپنے اتنے بڑے افسر کے قاتلوں کو ہر قیمت پر تلاش کرے گی اور صورتحال میرے لئے سنگین ہو جائے گی۔ لیکن رانی بڑے پُراعتماد انداز میں کہہ رہی تھی کہ میرا کچھ نہیں بگڑے گا لیکن ہردیپ سنگھ کی حیثیت سے۔

بھوج پتر آیا اور غائب ہو گیا۔ اور نجانے وردان سادھانی کہاں غائب ہو گیا ہے۔ اب تو میرے بلانے پر بھی وہ نہیں آتا۔ بہرحال اب مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔

آخر کار رانی سریتا دیوی کی کار ایک شاندار عمارت کے احاطے میں داخل ہو گئی۔

چھوٹی چھوٹی عمارتوں کا شہر لندن کے مضافاتی علاقے میں اعلیٰ درجے کی عمارتیں رکھتا تھا اور یہ عمارت بھی ایسے ہی ایک علاقے میں تھی۔ احاطے میں بہت سے ملازم نظر آ رہے تھے جو خاص قسم کی وردی میں ملبوس تھے۔ ایک بہت ہی خوبصورت حصے میں نشست گاہ رکھی گئی تھی۔ یہ اصل عمارت سے عقبی حصے کی طرف سوئمنگ پول کا حصہ تھا جہاں رنگین شیڈ لگائے گئے تھے اور مدھم مدھم روشنیاں شام کے اجالے میں ہی کر دی گئی تھیں۔ لیکن اس سے ماحول میں ایک عجیب سا حسن پیدا ہو رہا تھا۔ رانا جسپال نے یہیں ہمارا استقبال کیا۔ لان میں اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ رانا جسپال نے چند انگریزوں سے میرا تعارف کرایا۔ رانی سریتا کا تعارف بھی کرایا گیا تھا۔ ہمیں اعلیٰ درجے کی نشستیں پیش کی گئیں۔ کچھ انگریز عورتیں اور مرد رانی سریتا دیوی سے باتیں کرنے لگے۔ مجھ سے بھی میرے بارے میں پوچھا گیا تو میں نے بتایا کہ میں سینٹ لوسیا میں رہتا ہوں۔

وہ لوگ مجھ سے سینٹ لوسیا کے بارے میں سوالات کرنے لگے اور مجھے جتنا بریف کیا گیا تھا، اس کے مطابق میں محتاط انداز میں ان کا جواب دیتا رہا۔ کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا تھا۔ میری نگاہیں کتنی ہی بار قرب و جوار میں روپالیہ کو تلاش کر چکی تھیں۔ روپالیہ کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ انگریز ماں کی بیٹی ہے جبکہ باپ ہندوستانی ہے۔ اچانک ہی سریتا دیوی نے کہا۔

"روپالیہ۔"

سامنے کے حصے سے ایک خوبصورت لڑکی چند اور ماڈرن لڑکیوں کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ لیکن روپالیہ کو دیکھ کر میرے دل کو شدید دھکا لگا تھا...... اور میں کھوئی کھوئی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ حیرت ناک...... پراسرار...... یہ پراسرار قوتیں میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ مرتے دم تک میرا پیچھا کرتی رہیں گی۔ روپالیہ، روپالیہ نہیں بلکہ کلاڈیا تھی۔ کرنل صغیر کی بیٹی جو خود بھی ایک انگریز ماں کی بیٹی تھی۔ میرے خدا...... آخر یہ کیا اسرار ہے؟ چند مخصوص کردار کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں؟ زندگی میں ان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کیا؟

روپالیہ قریب آتی چلی گئی۔ کلاڈیا کو میں نے کئی بار دیکھا تھا لیکن جتنی تفصیل سے آج دیکھ رہا تھا اس سے پہلے اتنی تفصیل سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے نقش میں ایک ایسی محبوبیت تھی اور چہرے کی جلد میں ایسی ملاحت تھی کہ دیکھنے والا دیکھتا رہ جائے۔ اتنے

شفاف چہرے کم ہی نظر آتے ہیں۔ بے شکن جیسے سنگ مرمر سے تراش دیئے گئے ہوں اور سنگ تراش نے ان چہروں پر اپنی بہترین مہارت کا مظاہرہ کیا ہو۔ انتہائی متناسب قد و قامت، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس سے پہلے میں نے جب بھی کلاڈیا کو دیکھا ایسے لباس میں دیکھا کہ میں اس کے چہرے اور جسمانی نقوش کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکا۔ لیکن آج جو وہ لباس پہنے ہوئے تھی وہ اس کی جسمانی موزونیت کا بھی اظہار کرتا تھا۔ اور ایک دم سے میرے ذہن میں وہی سناٹے در آئے جو شاید میری فطرت کا ہی ایک حصہ تھے۔ میں ان سناٹوں کو کسی پراسرار کیفیت کا نتیجہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک دلکش سڈول جسم کا تصور اور اس کو پا لینے کی خواہش میرے دل میں پھر سے مچلنے لگی تھی اور میں اس کے بارے میں مکمل طور پر غور کرنے لگا تھا۔

اسی وقت رانا جسپال اس کے قریب پہنچ گیا اور اسے لے کر ہمارے پاس آیا۔

"رانی سریتا دیوی، پرنس ہردیپ سنگھ۔" اس نے ہمارا تعارف کرایا تو روپالیہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگا لئے۔ سریتا دیوی نے میری طرف دیکھا تو میں نے بھی جلدی سے دونوں ہاتھ جوڑ لئے۔ ظاہر ہے مجھے پرنس ہردیپ کا کردار ادا کرنا تھا۔ رانا نے روپالیہ سے کہا۔

"یہ ہمارے آج کے خاص مہمان ہیں۔ تم انہیں کمپنی دو گی۔"

"جی پتا جی۔" روپالیہ نے مترنم آواز میں کہا اور میں اسے دیکھنے لگا۔ آواز بھی کلاڈیا ہی کی تھی۔ میری گہری نگاہیں اس کا جائزہ لے رہی تھیں اور میں اپنی آنکھوں کی معنی خیزیت سے اسے یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ بہرحال میں اس کا قدیم شناسا ہوں۔ لیکن روپالیہ کے معصوم چہرے پر کوئی نقش نمودار نہ ہوا۔ وہ دلآویز انداز میں بولی۔

"آیئے پرنس! آیئے پلیز۔"

"جی۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

"ہماری اس وقت کی ملاقات تو بہت سرسری رہے گی۔ کیونکہ یہ جو میری دوست آئی ہوئی ہیں، انہیں خود سے دور کرنا بڑا مشکل ہو گا اگر میں چاہوں بھی تو۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد میں آپ کو اپنی کوٹھی دکھانے کے لئے لے چلوں گی۔ آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"آیئے۔" اس کے بعد اس نے مجھے کئی لڑکیوں سے ملوایا لیکن اس کے انداز میں

کوئی ہلکا پن نہیں تھا۔ اس نے یہی کہا۔

"انڈین پرنس ہردیپ سنگھ۔ سینٹ لوسیا میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ پتا جی کے بہت گہرے دوست کی اولاد ہیں۔" چونکہ اس تعارف میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ لڑکیوں نے بھی مجھے پرخلوص انداز میں ویلکم کہا تھا۔ رانا جسپال اور سریتا دیوی ہم دونوں کی طرف سے بالکل بے خبر ہو گئے تھے اور دوسرے مہمانوں میں گم تھے۔ آخر کار موقع ملا تو میں روپالیہ کے ساتھ کوٹھی کے اندرونی حصے کی جانب چل پڑا۔ وہ سادگی سے مجھے بتانے لگی کہ رانا جسپال ہندوستان سے بہت محبت کرتے ہیں اور انہوں نے یہ کوٹھی قدیم ہندوستانی عمارتوں کے انداز میں بنوائی ہے۔ میں بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک بار میں نے ایک فانوس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مس کلاڈیا! یہ فانوس....."

"یہ پیرا گوئے سے میرے پتا جی خود لائے تھے۔"

"بہت خوبصورت فانوس ہے مس کلاڈیا۔"

"ہاں، اس میں کوئی شک نہیں۔"

میں نے دو بار اسے کلاڈیا کہہ کر مخاطب کیا تھا لیکن نجانے کیوں اس نے میرے الفاظ کی تردید نہیں کی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ شاید مجھ سے اس بارے میں سوال کرے۔ اپنے خوبصورت بیڈ روم میں لے جا کر اس نے مجھے بیٹھنے کی پیشکش کی اور بولی۔

"آپ پہلی بار میرے مہمان بنے ہیں۔ بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کروں؟"

"پہلی بار؟" میں نے حیرانی کا مظاہرہ کیا۔

"تو اور کیا؟"

"میں پہلی بار تو آپ کا مہمان نہیں بنا۔"

"کیا مطلب؟"

"ہماری ملاقات پہلے بھی ہو چکی ہے۔"

"سپنوں میں؟" اس نے سوال کیا۔

"نہیں، ایک بار کلکتہ میں..... ایک بار اسکندریہ میں۔"

"جی.....؟" وہ حیرت سے بولی اور میں ایک دم ہنس پڑا۔ اس وقت ماحول کو خراب کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

''آپ کی پیدائش کہاں کی ہے روپالیہ جی؟''

''یہیں لندن میں پیدا ہوئی ہوں۔''

''انڈیا آتی جاتی رہتی ہیں؟''

''ہاں، بہت سی بار۔ کپورتھلہ ہماری اصل رہائش گاہ ہے، میرا مطلب ہے پتا جی کے سارے عزیز کپورتھلہ میں ہی رہتے ہیں۔''

''ہاں، ہاں، ہاں۔ اچھا ٹھیک۔'' میں نے خوامخواہ گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ روپالیہ مجھ سے سینٹ لوسیا کی باتیں کرنے لگی۔ میں خاصا الجھ گیا تھا۔ وہ اپنے انداز سے کہیں ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی کہ وہ کلاڈیا ہے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس سے دوسری ملاقات بھی کروں گا۔ پھر ہم مہمانوں کے درمیان واپس آ گئے۔ رانا جسپال نے میری کلائی پکڑی اور مجھے دوستوں کے درمیان لے گیا۔ یہاں اس نے کھل کر لوگوں سے بات کی۔

''بھئی آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ بیٹی اگر راجہ کی بھی ہو تو پرائی ہوتی ہے۔ اس کو اپنا نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ماتا پتا کی سب سے بڑی خوشی یہ ہوتی ہے کہ ان کی بیٹی کسی اچھی جگہ جائے۔ پرنس ہردیپ ایک ہندوستانی ریاست قولی کے راجکمار ہیں۔ قولی بہت بڑی ریاست ہے اور چندی گڑھ کے اطراف میں ہے۔ پرنس ہردیپ کے پتا میرے بہترین دوست تھے۔ وہ اب اس سنسار میں نہیں ہیں۔ ان کی چچی، رانی سریتا دیوی نے فیصلہ کیا ہے کہ روپالیہ کو اپنی بہو بنائیں گی۔ یعنی میری بیٹی کو۔ آپ لوگ پرنس ہردیپ کو اسی نگاہ سے دیکھیں۔''

رانا جسپال سنگھ بلاشبہ ایک بڑا آدمی تھا۔ ہر چیز سے امارت ٹپک رہی تھی۔ لیکن بہرحال یہ تو ایک کھیل تھا جو رانی سریتا کھیل رہی تھی اور جہاں تک میرا تعلق تھا میں یہ بات جانتا تھا کہ اس کھیل کے پراسرار تار میری زندگی سے بندھے ہوئے ہیں اور بھوج پتر پر ابھر آنے والا چہرہ اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ رانی سریتا دیوی کا تعلق ان سارے معاملات سے بہت گہرا ہے۔ بہرحال یہ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں، میں اپنے طور پر غیر مطمئن نہیں تھا اور سوچ رہا تھا کہ خود کو تقدیر کے دھارے پر تو چھوڑ ہی دیا ہے، تقدیر کے ہر فیصلے کو خوش دلی کے ساتھ قبول کروں گا۔ یہی میرے لئے سب سے بہتر عمل ہو گا۔ غرض یہ کہ یہ ساری باتیں سوچ کر میں مطمئن تھا۔ رات کے کھانے کے بعد رانا جسپال نے ہمیں رخصت کیا۔ روپالیہ بھی ساتھ تھی۔ رانا جسپال نے کہا۔

''پرنس! میری طرف سے تمہیں اجازت ہے، جب دل چاہے یہاں آ سکتے ہو، روپالیہ سے مل سکتے ہو۔ سریتا دیوی! پرنس ہردیپ بہت اچھا لڑکا ہے، مجھے بے حد پسند آیا۔''

سریتا نے مسکرا کر گردن ہلا دی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی جس کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ واپسی پر اس نے کہا۔ ''اور کبھی کبھی انسانوں کو کچھ ایسی شخصیتیں مل جاتی ہیں جو اس کی توقع سے کہیں زیادہ آگے ہوتی ہیں۔ مجھے تو ایسا لگا ہے خاقان جمشیدی! کہ تم خاقان جمشیدی ہو ہی نہیں بلکہ پرنس ہردیپ ہو۔''

''آنٹی! میں تو اس وقت سے خوفزدہ ہوں جب پرنس ہردیپ میری جگہ آ کر لے گا۔''

''دیکھو...... میں تمہیں بتاؤں، زندگی جو ہے نا یہ ایک خطرناک کھیل ہے۔ تفصیل میں نہیں جاؤں گی۔ لاکھوں افراد لاکھوں بار ایسی لاکھوں مصیبتوں میں گرفتار ہوتے ہیں جن کے بارے میں ان کا خیال ہوتا ہے کہ بس یہی زندگی کا اختتام ہے اور وہ ان مشکلوں سے نہیں بچ سکتے۔ لیکن وقت کوئی نہ کوئی حل نکال لیتا ہے عام لوگ جو کچی ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ان کی سطح بہت ہلکی ہوتی ہے، اپنی مرضی کے خلاف پیش آنے والے واقعات سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ لیجئے زندگی گئی۔ بھئی زندگی جانی تو ہے، آج نہیں، کل نہ سہی پرسوں، کسی نہ کسی شکل میں جانی ہے۔ بس یہی سب سے بڑا خطرہ ہوتا ہے زندگی کو۔ اس کے علاوہ اور کیا ہوتا ہے، بتاؤ؟ یہ تو معمولی سی بات ہے۔ اگر یہ سوچ لیا جائے کہ ہمیں ہر مشکل سے گزرنا ہو گا اور اس یقین کے ساتھ کہ آخر کار یہ مشکل خود بخود ختم بھی ہو جائے گی، سب کافی ہے۔ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ تم بالکل فکر مت کرو، اپنے آپ کو آزاد چھوڑ دو۔ مزے لو زندگی کے۔ سب کچھ تمہارے چرنوں میں ہے۔''

ہم لوگ فارم ہاؤس پہنچ گئے۔ سریتا نے کہا۔ ''اب تم اندر جاؤ، میں یہیں سے واپس چلی جاؤں گی۔ نہ، نہ...... میرے بارے میں یہ مت پوچھو کہ میں کہاں جاؤں گی اور کیوں جاؤں گی۔ بات یہ ہے کہ اب تک بے شمار چیزیں تمہارے علم میں نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں مجھے وہ کرنے دو جو میں کرنا چاہتی ہوں۔ بس سمجھ لو کہ تمہارے اطراف مضبوط کرنا چاہتی ہوں اور تمہارے خلاف کوئی بات کبھی نہیں جائے گی۔ او کے؟''

''او کے۔'' میں نے گردن ہلا کر کہا اور رانی سریتا دیوی اسی وقت کار میں واپس چلی گئی۔

میں اندر پہنچ گیا تھا۔ جب میں اپنے بیڈروم میں داخل ہوا تو راج شری میرے پیچھے پیچھے اندر آ گئی۔ اسے دیکھ کر میں چونک پڑا تھا۔ ”ارے راج شری! تم؟“

”ہاں...... ظاہر ہے میں آپ کی داسی ہوں مہاراج! ہماری ڈیوٹی لگی ہے۔ میری بہن جے شری کسی کام سے گئی ہوئی ہے۔ آپ کی خاطر مدارات کی ذمہ داری تو مجھے ہی پوری کرنا ہو گی۔“

”جے شری کہیں گئی ہوئی ہے؟“

”ہاں۔“

”یہ بتاؤ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ بخار آ گیا تھا نا تمہیں؟“

”ٹھیک ہے۔ اب ٹھیک ہو گئی ہوں۔ ٹھیک تو ہونا تھا نا مجھے۔ ذرا دیر ہو گئی۔ آپ کے کپڑے رات کے پہننے والے رکھ دیئے ہیں۔ یہ بات مجھے معلوم ہے کہ آپ کھانا کھا کر آئے ہیں۔ دعوت پر گئے تھے۔“

”کہاں ہیں میرے کپڑے؟“

”واش روم میں۔“

”اچھا۔“

”کچھ پئیں گے، کافی وغیرہ؟“

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر کہا۔ ”ٹھیک ہے، کافی پلا دو۔ باقی ملازم کہاں ہیں؟“

”سب اپنی اپنی آرام گاہوں میں جا چکے ہیں۔ صرف چوکیدار اپنی ڈیوٹی پر مستعد ہے۔“

”او کے، کافی لے آؤ۔“ میں نے واش روم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا، پھر لباس وغیرہ تبدیل کر کے میں نے ٹوتھ برش وغیرہ کیا۔ دروازے سے باہر نکلا تو کافی کی سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں چکرا رہی تھی اور جے شری برتنوں کے پاس موجود تھی۔

”واہ...... تمہارے پاس جادو کا چراغ ہے۔“

”میرے پاس اپنے جیون کا چراغ بھی نہیں ہے، جادو کا چراغ تو بہت بڑی بات ہے کمار۔“ راج شری نے اداس لہجے میں کہا اور میں نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”مجھے ایسی باتیں پسند نہیں ہیں راج شری! تم اگر جانا چاہو تو جا سکتی ہو۔“ نجانے کیوں میرے لہجے میں خشکی پیدا ہو گئی۔ اس نے سہم کر مجھے دیکھا، پھر دونوں ہاتھ جوڑ

رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

”نہیں مہاراج! معاف کر دیجئے کمار جی! میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ آپ کو ناراض کروں۔ آگے ایسی بات نہیں کہوں گی۔“

”کافی بناؤ۔“ میں نے بھاری لہجے میں کہا اور وہ جلدی سے برتنوں پر جھک گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسو دیکھے تھے اور ایک لمحے کے لئے وہ مجھے قابل رحم لگی تھی۔ ظاہر ہے گھر کی ملازمہ تھی، اسے بہت زیادہ منہ لگانے کا نتیجہ میرے حق میں کیا نکل سکتا ہے یہ مجھے معلوم تھا۔ اس نے کافی بنا کر میرے سامنے رکھی اور ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ میں نے کافی کی پیالی اپنے سامنے سرکاتے ہوئے کہا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے راج شری! دل چاہے تو آرام کر سکتی ہو۔ میں تم سے ایک سوال کروں؟“

”جی کمار جی؟“ وہ بھرائے ہوئے انداز میں بولی۔

”دیکھو راج شری، جو کچھ ہوا ہے اس کے بارے میں تمہیں بھی علم ہے کہ میں قصوروار نہیں ہوں۔ تم خود بھی جانتی ہو کہ تم خود میرے پاس آئی تھیں۔ دیکھو برا مت ماننا، یہ بات میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم کسی ذہنی ہیجان یا حقیقی عمل کے ذریعے یہاں تک پہنچی تھیں اور تم یقین کرو میں بھی اسی عمل کا شکار ہو گیا تھا۔ بہرحال ہمارے درمیان جو یہ تعلق قائم ہوا ایک طرح سے بے معنی ہے۔ تم سمجھدار لڑکی ہو، اور بات کو اچھی طرح سوچ سکتی ہو۔ میں اگر تم سے صرف اپنی ہوس پوری کرتا رہوں تو بھی تمہیں کچھ نہیں ملے گا سوائے اس کے کہ اپنے آپ کو کھو دو گی۔ دیکھو راج شری! ایسی انوکھی کہانیاں کبھی کبھی ہی جنم لیتی ہیں کہ کسی راج کمار نے اپنی کسی داسی کی محبت میں گرفتار ہو کر راج پاٹ ٹھکرا دیا۔ اب ایک ایسی بات کہوں جو تمہارے سامنے نہیں کہنی چاہئے۔ تم جانتی ہو کہ میں پرنس ہردیپ نہیں ہوں۔ معلوم ہے نا تمہیں؟“

”ج...... جی...... جی کمار صاحب۔“

”اچھا بیٹھو...... بیٹھ جاؤ۔“ میں نے کہا اور وہ زمین پر بیٹھ گئی۔

”جو کچھ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں مجھے اس کا جواب دو گی؟“

”جی۔“

”اس وقت بھی تم یہاں موجود تھیں جب اصل پرنس ہردیپ یہاں آیا تھا۔ رانی سریتا

دیوی مجھے بتا چکی ہیں کہ تم تمام لوگ جو یہاں موجود ہو ان کے ایسے وفاداروں میں سے ہو جو جان دے کر بھی ان کے خلاف کبھی زبان نہیں کھولیں گے۔ میں نے ایک لفظ خاص طور سے کہا ہے۔ تم اس پر غور کرو۔"

"کون سا لفظ؟" اس نے آنکھیں اٹھا کر مجھ سے سوال کیا۔

"میں نے کہا تھا کہ رانی کے خلاف زبان نہیں کھولو گے۔ بے شک میں تم سے رانی کے خلاف ایک لفظ بتانے کے لئے ہی کہوں۔ لیکن میرے اور تمہارے درمیان ایک نامعلوم رشتہ قائم ہو چکا ہے، اس کے تحت تو میں تم سے کچھ سوال کر سکتا ہوں؟"

"آپ پوچھئے مہاراج! کوئی خاص بات پوچھنا چاہتے ہیں ہم سے؟" راج شری بولی۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پوچھئے۔ ہم جو کچھ بتا سکتے ہیں ضرور بتائیں گے۔"

"کیا پرنس ہردیپ سینٹ لوسیا سے یہاں آیا تھا؟"

"آئے تھے مہاراج۔"

"کون تھا اس کے ساتھ؟"

"ان کا دوست۔"

"جس رات یہاں ان کا قتل ہوا، تم لوگ کہاں تھے؟"

"ہم یہیں ہوتے ہیں، یہاں سے کہیں نہیں جاتے۔ ویسے اگر گھومنے پھرنے کا ارادہ ہو تو رانی صاحبہ ہمیں پوری پوری اجازت دیتی ہیں اور ہم سیر و تفریح کر آتے ہیں۔ رانی صاحبہ دل کھول کر ہمیں پیسے دیتی ہیں اور ہم اپنی ہر خواہش پوری کر لیتے ہیں۔ بے شک ہم یہاں داسیاں اور داس ہیں پر ہمیں ساری سہولتیں حاصل ہیں۔ رانی جی بہت اچھی ہیں، ہمیں یہاں کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔"

"جب رانی یہاں نہیں ہوتی تو صرف تم ہی یہاں ہوتے ہو، میرا مطلب ہے اگر تمہیں کوئی پریشانی ہو تو تم کیا کرتی ہو؟"

"ہم کچھ بھی نہیں کرتے۔ پرلوک ناتھ جی خود ہی ہمارا خیال رکھتے ہیں۔"

"پرلوک ناتھ؟"

"ہاں۔"

"یہ کون ہیں؟"

"آپ نہیں ملے ان سے؟"

"نہیں۔"

"ہائے رام۔ رانی سریتا دیوی نے بھی آپ کو ان کے بارے میں نہیں بتایا؟"

"نہیں۔"

"ارے اب کیا ہوگا۔ ہمارے منہ سے تو یہ نام اس لئے نکل گیا تھا کہ آپ ان کے بارے میں ضرور جانتے ہوں گے۔"

"راج شری! تم مجھے موقع دے رہی ہو کہ تمہارے سلسلے میں، میں اپنے آپ کو بے گناہ سمجھوں۔ تم میری اس قدر قربت حاصل کرنے کے باوجود مجھے کوئی اہمیت نہیں دے رہیں۔ یعنی اگر کوئی چیز میرے کام آ سکتی ہے تو مجھے اس بارے میں نہیں بتا رہیں۔"

راج شری نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا، پھر بولی۔ "اور کتنا صاف صاف کہو گے کہ تم ہمیں جوتے کی نوک پر مارتے ہو۔ تم نے کھل کر کہہ دیا ہے کہ تاریخ میں ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں کہ کسی راج کمار نے اپنی کسی داسی کو اپنا جیون ساتھی بنا لیا ہو۔ خیر یہ بات تو ہم خواب میں بھی نہیں سوچتے کہ کبھی کسی لمحے ہم تمہارے جیون ساتھی بن سکیں گے۔ پر اتنا ادھیکار تو ہمیں دو کہ ہم اپنے مالک کی وفاداری ہی نبھا سکیں۔ کیا ملے گا ہمیں سب کچھ تمہیں بتا کر۔ داسی ہیں، داسی رہیں گے۔ پھر کیوں بتائیں ہم تمہیں ایسی باتیں جن کی طرف سے ہماری رانی جی کی ممانعت ہو۔" اس کے لہجے میں کسی قدر تلخی آ گئی۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"ٹھیک ہے، مت بتاؤ۔ اور کوئی سوال کروں یا خاموش ہو جاؤں؟"

"پرلوک ناتھ جی رانی صاحبہ کے منیجر ہیں۔ بس اسی سمے یہاں آتے ہیں جب رانی جی انہیں بلاتی ہیں۔ کون ہیں، کیا کرتے ہیں، کہاں رہتے ہیں، مستقل قیام لندن میں ہے یا لندن سے باہر؟ اس بارے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ جوان آدمی ہیں، مطلب یہ کہ چالیس سال کے ہوں گے۔ لمبے تڑنگے ہیں، نرم بولتے ہیں۔ مگر چہرے سے بہت خطرناک لگتے ہیں۔ اور کچھ......؟" وہ بدستور تلخی سے بولی۔

"ہردیپ سنگھ کے ساتھ جو آدمی یہاں آیا تھا، کیا تمہیں اس بات کا علم ہے کہ وہی یہاں قتل ہوا؟"

"ہاں...... بعد میں جب رانی صاحبہ نے اس کا اصل چہرہ دیکھا تو یہی پتہ چلا کہ وہ

ہردیپ سنگھ نہیں ہے۔"

"اس کے چہرے پر ہردیپ سنگھ کا میک اپ کس نے کیا تھا؟"

"میں نے نہیں کیا۔" راج شری نے کہا اور ہذیانی انداز میں ہنس پڑی۔

"میں پوچھ رہا ہوں کہ کس نے کیا؟ اب یہ بتا دو، جس رات ہردیپ سنگھ کا دوست یہاں قتل ہوا اور ہردیپ سنگھ غائب ہو گیا، پرلوک ناتھ جی یہاں آئے تھے؟"

"پتہ نہیں۔" راج شری خشک لہجے میں بولی۔

"اوہو...... تم نے اپنا انداز بدل لیا۔ اس کا مطلب ہے کہ اب تم سے کوئی سوال کرنا بیکار ہے۔ او کے، سوری راج شری! تمہیں اتنی تکلیف دے کر مجھے افسوس ہوا ہے۔ اور ایک بات میں تمہیں بتاؤں، پرلوک ناتھ جی کے بارے میں، میں زبان نہیں کھولوں گا، یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔"

اس نے ایک تند نگاہ مجھ پر ڈالی اور اس کے بعد بولی۔ "ہمارے لئے اب کیا حکم ہے؟"

"جانا چاہو تو جا سکتی ہو۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ میں اسے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اپنے اندر پیدا ہو جانے والی غصے کی اس لہر کو ختم کر دیا جو اس کے اس طرح چلے جانے سے پیدا ہو گئی تھی۔ ٹھیک تھی، اپنی جگہ غلط نہیں تھی وہ۔ بہرحال عورت تھی اور فاحشہ نہیں تھی۔ کبھی کبھی انسان کچھ مانگے بغیر کسی کا مقروض ہو جاتا ہے۔ قرض دینے والا تو یہی سوچے گا کہ اس کے سامنے اس کا مقروض بیٹھا ہوا ہے یا اگر یہ بات میں غلط سوچ رہا ہوں یا غلط الفاظ دے رہا ہوں تو یوں کہنا چاہئے کہ کچھ ایسے عمل ہوا کرتے ہیں جو خواہ مخواہ کچھ رابطے پیدا کر دیتے ہیں اور ان رابطوں کی ادائیگی بھی کرنا ہوتی ہے۔ میں نے اس کی پذیرائی نہیں کی تھی۔ یہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر میں اس کی جانب دونوں ہاتھ پھیلا دیتا تو وہ کسی درخت سے ٹوٹے ہوئے پکے پھل کی مانند میرے بازوؤں میں آ گرتی۔ بہرحال کچھ بھی تھا، بیچاری عورت تھی۔ البتہ اب ایک نیا نام اس کے ذریعے میرے سامنے آ گیا تھا اور یہ تھا پرلوک ناتھ۔

رانی کے لئے اصل میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا تھا میں، جو اسے ناگوار گزر جائے۔ فی الحال تو وہ میرے لئے تحفظ کا ایک بہترین ذریعہ بن گئی تھی۔ کیونکہ اب باقی لوگ تاریکی میں جا سوئے تھے یعنی وہ جو میرے ہمراہ یہاں تک آئے تھے۔ میرا ان سے

ہر طرح کا رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ چنانچہ گیرون، مارک وغیرہ سے کوئی رابطہ دوبارہ قائم کرنے کی کوشش حماقت کے سوا کچھ نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ مفرور تھے اور پتہ نہیں ان کا کیا بیک گراؤنڈ ہو۔ رانی کو اپنی مٹھی میں رکھنا ضروری تھا اور اس کے ساتھ یہاں لندن سے بھی نکل جانا ضروری تھا کیونکہ کبھی کسی بھی لمحے کوئی مصیبت آ سکتی تھی۔ رانی نے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہندوستان جا کر وہ میری بھرپور حفاظت کرے گی اور مجھے کسی مشکل میں نہ پڑنے دے گی۔ ورنہ اب میں یوں بھی کر سکتا تھا کہ اب رانی کے بارے میں ہلٹن سے معلومات حاصل کر سکتا تھا کہ راتوں کو وہ ہلٹن میں اپنے کمرے میں ہی ہوتی ہے یا کہیں اور؟ اور یہ شخص پرلوک ناتھ، ساری باتیں پراسرار تھیں۔

رانی سے دوسرے دن ہی ملاقات ہوئی۔ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ میرے ساتھ بیٹھ کر بے تکلفی سے بولی۔

"سنا ہے خاقان! رانا تو تم پر لٹو ہو گیا ہے۔ وہ اتنا خوش ہے کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ کہہ رہا تھا کہ شان و شوکت اس کی کمزوری ہے اور وہ خوبصورت اور شاندار لوگوں سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ پرنس ہردیپ کو اس نے بہت چھوٹی عمر میں دیکھا تھا، کہنے لگا کہ پرنس اتنا شاندار نکلے گا یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ بھی بتایا اس نے کہ روپالیہ بھی بہت خوش ہے اور اس نے فوراً اپنے دل کی بات کہہ دی ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے تمہاری منگنی اس سے کر دی جائے۔ میرا خیال ہے ہمیں یہ کام کر دینا چاہئے۔"

"آپ اسے مناسب سمجھتی ہیں؟"

"مائی سن! میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد تو یہی ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ اور میں آپ کے مقصد میں اپنے بھرپور تعاون کا وعدہ کر چکا ہوں اور آپ کا ردِعمل بھی ٹھیک ہی ہے آنٹی۔ آپ نے میری بھرپور مدد کی ہے، میرے سارے مسائل بھی آپ کے سامنے ہیں۔ ظاہر ہے مجھے اس وقت آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ ایسے عالم میں تو آپ جو چاہیں میں وہی کروں گا۔"

رانی چونک کر مجھے دیکھنے لگی پھر بولی۔ "ارے ارے...... تمہارے یہ الفاظ تو کچھ اور کہہ رہے ہیں، مقصد نہیں سمجھا پائی میں۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی یا تمہاری اس سوچ میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے؟"

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ بس ایسے ہی اصل میں انسان جب کسی کو اپنا حتمی محور پاتا ہے تو اس بات کا خواہش مند ہوتا ہے کہ اسے ایک قریبی مقام دیا جائے، ہر بات سے اسے آگاہ رکھا جائے۔ آپ کو پتہ ہے کہ میں اس سے محروم ہوں۔ مجھے ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم کہ روپالیہ سے منگنی آپ کے کس کام آسکتی ہے۔ آپ یقین کریں اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو مجھے اپنا یہ فرض سرانجام دے کر بڑی خوشی ہوتی۔"

میں نے رانی کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو مجھے احساس ہوا کہ اس کے چہرے کے عضلات کچھ سرد ہو گئے ہیں۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "اور میں تم سے اپنی مجبوریوں کا تذکرہ کر چکی ہوں۔ سوری جان! ابھی میں تمہیں اور کچھ نہیں بتا سکتی۔ بولو، میری ہدایت پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو یا نہیں؟"

"ارے ارے...... آپ نے پوچھا تو میں نے بتا دیا۔ آپ کے لہجے سے ناراضگی ٹپک رہی ہے۔ یہ بہتر نہیں ہے میرے لئے بھی اور آپ کے لئے بھی۔"

میں نے اپنے ان جملوں میں رانی کی خشک مزاجی کا جواب دے دیا تھا۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی، پھر ٹھنڈی سانس لے کر اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی۔

"تم سے دوبارہ بات کروں گی۔ پتہ نہیں کیوں ہماری ملاقات کے یہ لمحات کچھ خشک سے ہو گئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور باہر نکل گئی۔

※☆※

پھر مجھے روپالیہ کا فون موصول ہوا۔ رانی نے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ اس کا رویہ میرے ساتھ پہلے جیسا ہی ہو گیا تھا۔ روپالیہ کی آواز فون پر سنائی دی۔

"پرنس ہردیپ سنگھ؟"

"بول رہا ہوں۔ آپ؟"

"میں روپالیہ ہوں۔"

"ہیلو روپالیہ! کیسی ہیں آپ؟"

"ٹھیک ہوں۔ ملیں گے نہیں آپ مجھ سے؟"

"کیوں نہیں۔ بتائیے کب فرصت ہے آپ کو؟"

"ہر وقت فرصت ہے آپ سے ملاقات کے لئے۔ پتا جی بھی کہہ رہے تھے کہ کیا بات ہے ہردیپ سنگھ دوبارہ نہیں آئے۔"

"روپالیہ جی! میں ابھی تھوڑی دیر کے بعد آپ کو فون کروں گا اس کے بعد پروگرام طے کرلیں گے۔"

"جی نہیں، فون نہیں کریں گے آپ بلکہ آ جائیں گے۔"

"آپ کو اطلاع دے کر ہی آؤں گا۔"

"چلئے ٹھیک ہے۔" روپالیہ نے جواب دیا۔

میرے ذہن میں خود بھی یہ سوال تھا کہ روپالیہ سے تنہائی میں ملاقات کروں اور جائزہ لینے کی کوشش کروں کہ وہ روپالیہ ہے یا کلاڈیا؟ بڑی عجیب مماثلت تھی۔ کلاڈیا بھی ایک انگریز ماں کی بیٹی تھی اور ایک مسلمان باپ کی جبکہ روپالیہ بھی انگریز ماں کی بیٹی ہے اور ایک ہندو باپ کی بیٹی بقول سب کے۔ لیکن نجانے کیوں میرا دل یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ وہ روپالیہ ہے۔ کلکتے میں کرنل صغیر سے ہمارے جس قدر بھی تعلقات رہے تھے ان سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ کلاڈیا ایک پراسرار کردار ہے۔ کتنی ہی بار وہ مجھے مختلف انداز میں

ملی۔ مگر اس کا یہ نیا روپ میرے لئے بڑا حیران کن تھا۔ بہرحال فون بند کرنے کے بعد میں نے راج شری کو بلا کر رانی سریتا کے بارے میں پوچھا۔

"اپنے کمرے میں ہیں وہ۔" راج شری نے جواب دیا اور میں کمرے میں پہنچ گیا۔

"آؤ...... مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تم مجھ سے ناراض ہو۔ حالانکہ میرا خیال ہے کوئی ایسی بات تو نہیں ہوئی ہمارے درمیان۔"

"آپ اس خیال کو دل سے نکال دیجئے۔ آپ کیوں سوچ رہی ہیں کہ میں آپ سے ناراض ہوں؟"

"پلیز ہونا بھی نہیں۔"

"وہ روپالیہ کا فون آیا تھا ابھی تھوڑی دیر پہلے۔"

"اچھا، خیریت؟"

"مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔"

"تو ملو۔ بلکہ تمہیں جانا چاہئے تھا۔ میں نے تو تم سے کہہ دیا ہے کہ اب ہمیں اسی روشنی میں عمل کرنا ہے۔ تم مل لو روپالیہ سے۔"

"اس وقت میں اسی لئے آپ کے پاس حاضر ہوا تھا۔"

"نہیں، نہیں۔ جاؤ پلیز۔ اور سنو ذرا ہوشیار رہ کر۔ حالانکہ وہ بڑی سادہ سی لڑکی ہے، مجھے اس کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ لیکن پھر بھی احتیاط ہمیشہ فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔"

"آپ اطمینان رکھئے۔"

"مجھے اطمینان ہے۔ اب ایسی بات بھی نہیں کہ مجھے تم پر اطمینان نہ ہو۔" رانی سریتا نے کہا۔ میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا اور تھوڑی تیاریاں کرنے کے بعد باہر نکل آیا۔

باہر آیا تو کار تیار تھی۔ رانی نے ڈرائیور کو ہدایت کر دی تھی۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ ابھی خود بہت زیادہ ذہانت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کسی نہ کسی کا ساتھ ضروری تھا۔ رانی نے ڈرائیور کو شاید یہ بھی بتا دیا تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی تھی۔ میں خاموشی سے بیٹھا باہر کے مناظر دیکھتا رہا۔ آخر کار گاڑی روپالیہ کے خوبصورت مکان کے سامنے رک گئی۔ میں ڈرائیور سے مزید کچھ کہے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ ظاہر ہے اسے تمام تر ہدایات رانی سریتا نے ہی دے دی تھیں۔ روپالیہ میرا انتظار کر رہی

تھی۔ ایک خوبصورت لباس میں وہ بے انتہا حسین لگ رہی تھی۔ لیکن ایک بار پھر اس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت جو لباس وہ پہنے ہوئے تھی، میں نے اسے بالکل اسی لباس میں اسکندریہ میں دیکھا تھا۔ اس وقت جب وہ مجھے انتہائی مشکل حالات میں ملی تھی۔ بالکل یہی لباس اس کے بدن پر تھا۔ ایک بار پھر میرے ذہن میں سارے شبہات تازہ ہو گئے کہ وہ روپالیہ نہیں کلاڈیا ہے۔ سو فیصدی...... سو فیصدی۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ چکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ چکر میری زندگی کا وہی پراسرار چکر ہے جس نے مجھے مستقل طور پر چکر میں ڈال رکھا ہے۔ دیکھیں یہ چکر کب تک چلتا رہتا ہے۔

روپالیہ نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا تھا۔

"آپ...... لباس کے معاملے میں بہت ہی خوش ذوق ہیں پرنس! میری تمام دوست لڑکیاں آپ کے لباس کی بھی تعریف کر رہی تھیں۔"

"شکریہ کلاڈیا۔" میں نے کہا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولی۔

"کیا نام لیا آپ نے میرا؟"

"روپالیہ۔"

"روپالیہ تو نہیں کہا تھا آپ نے مجھے بلکہ شاید پہلے بھی آپ نے یہی نام لیا تھا۔ وجہ پوچھ سکتی ہوں؟"

"وجہ پوچھیں گی یا......؟" میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"یا......؟"

"یا مجھے داد دیں گی؟"

"اپنے آپ کو کلاڈیا کہنے پر؟" وہ مسکرا کر بولی۔

"چلئے اسی بات پر سہی۔"

"کیا آپ کو یہ نام بہت زیادہ پسند ہے؟"

"ایسا ہی سمجھ لیں۔"

"مگر میرا نام تو روپالیہ ہے۔"

"ہاں ہاں، میں کب منع کر رہا ہوں اس بات سے۔"

"آئیے نا، اندر آئیں۔ پتا جی بھی کہہ رہے تھے کہ کیا بات ہے، شاید پرنس تم سے متاثر نہیں ہوئے۔ ورنہ ملنے ضرور آتے۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کہاں ہیں انکل جسپال؟"

"اس وقت تو نہیں ہیں، کہیں گئے ہوئے ہیں۔ آیئے۔" وہ مجھے لئے ہوئے ایک خوبصورت گوشے میں پہنچ گئی۔

"کہئے...... کیسے بلایا آپ نے مجھے؟"

"ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ آپ آئے نہیں تھے، میں نے سوچا کہ آپ کو یاد دلا دوں کہ ہماری ملاقات ہوئی ہے اور لندن میں آپ ہمارے مہمان ہیں۔"

"شکریہ اس یاددہانی کا۔"

"پتا جی نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر چاہیں تو میں آپ کو لندن گھماؤں۔ ویسے سینٹ لوسیا کیسی جگہ ہے، مجھے تو اس کے بارے میں بالکل معلومات نہیں ہیں۔"

"بہت عمدہ جگہ ہے۔ ایک سادہ سی زندگی ہے وہاں۔"

"آپ کو سادہ زندگی پسند ہے؟"

"اور آپ کو؟"

"مجھے بھی پسند ہے۔"

"آپ یہ بتایئے آپ نے کون کون سے ممالک دیکھے ہیں؟"

"بہت کم۔ یوں سمجھ لیجئے نہ دیکھنے کے برابر دیکھے ہیں۔ اصل میں آپ کو ہمارے بارے میں بہت زیادہ نہیں معلوم۔ اس بات کا تو آپ کو پتہ ہے کہ میری ماتا جی انگریز تھیں۔"

"ہاں بالکل، مجھے معلوم ہے۔"

"پتا جی کے خاندان والوں کا یہ خیال تھا کہ انہوں نے ایک انگریز عورت سے شادی کر کے اچھا نہیں کیا۔ خاندان کی مان مریادائیں ختم کر دی ہیں انہوں نے۔ حالانکہ پتا جی نے انہیں سمجھایا کہ ان کی دھرم پتنی مختلف مزاج کی ہیں، مگر کسی نے مان کر نہ دیا۔ پتا جی نے ماتا جی کو یہ بات بتائی تو ماتا جی نے کہا کہ وہ چنتا نہ کریں، ایک دن رانا جسپال کے پریوار کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ برائی کسی انسان کی نسل میں نہیں ہوتی بلکہ اس کی ذات میں ہوتی ہے۔ ماتا جی نے اس کے بعد سارے طور طریقے وہی اپنائے جو پتا جی کے پریوار کے تھے۔ آپ دیکھ لیجئے میں ایک انگریز عورت کی بیٹی ہونے کے باوجود آج بھی اپنے باپ کو پتا جی کہتی ہوں اور مجھے ہندی بھی بہت اچھی آتی ہے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" میں نے پُراعتراف لہجے میں کہا۔ پھر میں نے اسے دیکھ کر کسی قدر

چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اسکندریہ دیکھا ہے آپ نے؟"

"نہیں۔ میں مصر کبھی نہیں گئی۔"

"سوچ لیجئے۔" میں نے دوبارہ کہا اور اچانک ہی مجھے یوں لگا جیسے اس کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی ہو، ایک چور کی سی کیفیت۔ لیکن ایک لمحے کے اندر اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور بولی۔

"نہیں، اسکندریہ کبھی نہیں گئی میں۔ کیوں پوچھ رہے ہیں آپ یہ سوال؟"

"نہیں بس ایسے ہی۔ ویسے میرا خیال ہے اسکندریہ کے نام سے آپ کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آ کر گزر گیا ہے۔"

"پتہ نہیں۔ اگر ایسا ہوا ہے تو کیوں ہوا ہے۔"

"چھوڑیئے ان باتوں کو اور سنایئے، مجھے بلانے کی کوئی خاص وجہ تھی؟"

"نہیں بس آپ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ معاف کیجئے میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں آپ سے۔"

"ضرور پوچھئے۔"

"آپ کو پتہ ہے کہ ہمارے بڑے ہمارے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ وہ ہمیں زندگی بھر کے لئے یکجا کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔"

"آپ خوش ہیں اس بات سے؟"

"اگر یہی سوال میں آپ سے کروں تو؟"

"پہلے سوال کا جواب دیا جاتا ہے۔ خیر اگر آپ مجھ سے ہی یہ سوال کرنا چاہتے ہیں تو میں کہتی ہوں ہاں، میں خوش ہوں۔"

"ہندوستان دیکھا ہے تم نے؟"

"کئی بار۔ ہمارا پورا پریوار چندی گڑھ میں ہے۔"

"ایک بات بتائیں گی آپ؟"

"ہاں پوچھئے۔"

"یہ پرلوک ناتھ جی آپ کے کیا لگتے ہیں؟"

"پرلوک ناتھ؟"

”ہاں، ایسے ہی پوچھ لیا تھا میں نے۔“

”نہیں، میرا خیال ہے میں تو کسی پرلوک ناتھ کو نہیں جانتی۔ مگر آپ کو یہ نام کس نے بتایا اور کون ہے یہ؟“

”بس ایسے ہی ایک ٹیلی فون آیا تھا جس میں کسی پرلوک ناتھ نے مجھے مخاطب کر کے کہا تھا کہ وہ روپالیہ کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔“

”پھر کچھ بتایا انہوں نے میرے بارے میں؟“

”نہیں، پھر فوراً ہی ٹیلی فون بند کر دیا۔ میرا خیال ہے کسی نے مذاق کیا ہوگا۔“

”پتہ نہیں۔ میں نہیں جانتی۔“ روپالیہ نے جواب دیا۔ پھر اس نے میری کافی خاطر مدارت کی میں اب بھی اس کی طرف سے مشکوک تھا۔ بظاہر وہ بڑی معصوم اور سادہ سی لڑکی تھی لیکن نجانے کیوں مجھے کبھی کبھی اس کے چہرے پر ایک معنی خیز کیفیت نظر آتی تھی اور اس کیفیت نے مجھے پاگل بنا رکھا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا فیصلہ کروں۔ اس کے بیڈ روم میں ایک بہت ہی خوبصورت تصویر ایک حسین فریم میں لگی ہوئی تھی۔ خاصی بڑی تصویر تھی۔ میں اس پر غور کرنے لگا اور میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بہت خوبصورت تصویر لگی ہے یہ روپالیہ جی۔“

”ہاں، مجھے بھی اتنی ہی پسند ہے۔“

”نجانے کیوں میرا یہ دل چاہ رہا ہے کہ میں آپ سے یہ مانگ لوں۔“

وہ ہنس پڑی، پھر بولی۔ ”تو کیا ہو گیا۔ مانگ لیجئے نا۔“

”دیں گی آپ یہ مجھے؟“

”شرمندہ کر رہے ہیں......“ وہ جیسے کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر خاموش ہو گئی۔

بہت دیر تک ہم دونوں ساتھ رہے۔ پھر میں نے کہا۔ ”تو پھر کیا ارادہ ہے؟“

”ہمارے ساتھ باہر چلئے نا۔“

”ٹھیک ہے، چلئے جہاں آپ کا دل چاہے۔“

روپالیہ خوش ہو گئی۔ میری کار باہر موجود تھی۔ میں نے اسے پیشکش کی کہ وہ میرے ساتھ ہی چلے۔ اور پھر ہم دونوں لندن کی سیر کو چل دیئے۔

میں نے بہت سی بار روپالیہ پر توجہ دی اور خود ہی اس شرمندگی کا شکار ہو گیا کہ بلاوجہ بے چاری پر شک کر رہا ہوں۔ وہ ایک سادہ سی، معصوم سی لڑکی ہے۔ اس کی باتوں میں سو فیصدی

بچپن تھا اور لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کلاڈیا ہے۔ لیکن چہرے کے ان نقوش کو کیا کرتا جو بار بار مجھے شبے کا شکار کر دیتے تھے۔ پھر میں نے دل میں سوچا کہ بلاوجہ اپنا دماغ کھپا رہا ہوں۔ اگر وہ کلاڈیا ہے بھی تو پتہ چل جائے گا کہ خود کو روپالیہ کیوں بنایا ہوا ہے اس نے اور خود اس نے بنایا ہے یا پھر کوئی اور ہی ہے جس نے اس کی شخصیت کو مشکوک کر دیا ہے۔

بہرحال کچھ نہ کچھ تو تھا۔ یہ بات کسی نہ کسی شکل میں آنے والے وقت میں پتہ چل ہی جائے گی۔ روپالیہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ پھر کافی وقت ہو گیا اور میں نے اس سے کہا۔

”کیا کہتی ہیں اب آپ؟“

”جانا تو ہے۔ اور ویسے بھی ہمارے بارے میں کسی کو نہیں معلوم کہ ہم لوگ کہاں ہیں۔ پتا جی کہیں میرے لئے پریشان نہ ہو جائیں۔“

”کیا آپ نے اندر موجود لوگوں کو یہ بات نہیں بتائی تھی کہ آپ میرے ساتھ جا رہی ہیں؟“

”نہیں نہیں، سب کو پتہ ہے۔ دیکھا تھا انہوں نے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

”ٹھیک ہے، پھر پریشانی کی کیا بات ہے؟“

”کیا آپ میرے ساتھ کچھ اور وقت گزارنا چاہتے ہیں؟“

”نہیں، یہ مطلب نہیں ہے۔ ظاہر ہے میں یہ بالکل نہیں چاہوں گا کہ رانا صاحب ہمارے کسی عمل سے پریشان ہوں۔“

”بس ذرا پتا جی کچھ محتاط قسم کے آدمی ہیں۔ ورنہ اور تو کوئی ایسی بات نہیں تھی۔“

میں نے اسے اس کی کوٹھی پر چھوڑا تو وہ بولی۔ ”آیئے۔ ہو سکتا ہے پتا جی آ گئے ہوں۔“

ایک لمحے کے لئے سوچ کر میں اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ لیکن اندر پہنچ کر پتہ چلا کہ رانا صاحب بدستور غائب ہیں اور اس وقت بھی گھر پر موجود نہیں تھے۔ وہ بولی۔

”چلئے یہ اچھا ہوا پتا جی موجود نہیں ہیں۔“

میں چلنے لگا تو وہ بولی۔ ”اور وہ تصویر جو آپ نے مانگی تھی؟“

”میں یہ سوچ کر خاموش ہو گیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اسے نہ دینا چاہتی ہوں۔“

”اب ایسی باتیں نہ کریں آپ۔ بھلا میری مجال ہے کہ آپ کو کسی چیز کے لئے منع کر دوں؟ اور پھر میری تصویر ہے، اچھا ہے نا آپ کے من میں رہے گی۔“

”صرف تصویر؟“ میں نے وہ جملہ پورا کر دیا جو وہ سننا چاہتی تھی۔ اس کے چہرے پر

باقاعدہ شرم کے آثار نمودار ہوئے۔ پھر اس نے کہا۔

''میں تصویر لا کر دیتی ہوں۔''

تصویر اس نے میرے حوالے کر دی اور میں اسے لے کر چل پڑا۔ اصل میں اس تصویر کے نقوش پر بھی غور کرنا چاہتا تھا۔ دیکھوں تو سہی کہ اس چہرے پر کیا تاثرات ہیں۔ روپالیہ اپنے آپ کو کتنا چھپانا جانتی ہے؟ اور پھر اس نے خود کو چھپایا ہے بھی یا پھر یہ میری غلط فہمی ہے۔

بہرحال کچھ دیر کے بعد میں واپس آ گیا تو تصویر میں نے اپنے بیڈروم کے کارنس پر سجا دی تھی اور لباس وغیرہ تبدیل کرنے بیٹھ گیا تھا۔ معمول کے مطابق رانی سریتا اس وقت بھی موجود نہیں تھی۔

ذہن میں مختلف گتھیاں اُلجھتی رہتی تھیں۔ اب یہ نیا نام پرلوک ناتھ میرے علم میں آیا تھا۔ پتہ نہیں یہ پرلوک ناتھ کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ رانی سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ رانی نے ابھی تک اس نام سے گریز کیوں کیا ہے؟ مجھے اس کے بارے میں بتایا کیوں نہیں؟ روپالیہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

میری نگاہیں روپالیہ کی تصویر پر پڑیں۔ بڑی جاندار تصویر تھی۔ اس میں اس کے چہرے کا ہر نقش نمایاں تھا لیکن ایک ایک نقش چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ روپالیہ ہی کلاڈیا ہے۔ اور یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کلاڈیا نے یہ روپ کیوں اختیار کیا ہے؟ کرنل صغیر کی بیٹی اور یہاں ہندو لڑکی جو رانا جسپال سنگھ کی بیٹی تھی، ان کے درمیان کیا رابطہ ہے؟ دنیا میں یکساں چہرے والے بے شمار لوگ ہوا کرتے ہیں لیکن اتنی یکسانیت کہ انسان یقین کی منزل سے نکل جائے پتہ نہیں اتنی یکسانیت ہوتی ہے یا پھر یہ سب بے وقوف بنانے والی باتیں ہیں۔

بہت دیر تک یہ خیالات ذہن کو الجھاتے رہے اور آخر کار میں نے انہیں دماغ سے جھٹک دیا۔ خواہ مخواہ خود پر دیوانگی سوار کرنے والی بات تھی جو ہونی نہیں چاہئے تھی۔

تمام معمولات سے فراغت حاصل کر کے آرام کرنے لیٹ گیا۔ دلی آرزو تھی کہ گہری نیند آ جائے۔ لیکن نجانے کتنی دیر گزری تھی پلکوں کی اس غنودگی کو کہ دروازہ کھلا اور اس کے بعد راج شری اندر داخل ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر کچھ اس طرح کے تاثرات تھے جیسے وہ گہری نیند سو رہی ہو۔ لیکن اس کے چلنے کا انداز بالکل ٹھیک تھا۔ میں تعجب بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ میرے قریب آ گئی اور میرے پیروں کے نزدیک بیٹھ گئی۔ پھر اس نے ہاتھ آگے بڑھائے اور میرا ایک پاؤں اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔ پھر اس کا چہرہ آہستہ آہستہ جھکا اور اس نے میرے پاؤں کا انگوٹھا چوم لیا۔ کیف و سرور کی ایک عجیب سی لہر میرے سارے وجود میں سرایت کر گئی۔ ایک عجیب سا احساس دل میں پیدا ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں اسے اپنے آپ میں سمو لوں۔ ذہن بری طرح اس کی اس حرکت سے متاثر ہو گیا تھا۔ آہستہ آہستہ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کیف و سرور کا ایک انوکھا احساس دل کو مٹھی میں جکڑے لے رہا تھا کہ اچانک ہی میری نگاہ کلاڈیا کی اس تصویر پر پڑی اور مجھے یوں لگا جیسے اس کے نقوش بدل گئے ہوں۔

کلاڈیا کی آنکھوں کی پتلیاں گردش کر رہی تھیں...... اور ان آنکھوں میں قہر و غضب کی بجلیاں کوندر ہی تھیں۔ میں پورے دعوے اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کلاڈیا کی یہ تصویر اس وقت متحرک تھی اور اس کے چہرے پر شدید غصے کے آثار نمودار ہوتے جا رہے تھے۔ میں ایک جھٹکے کے ساتھ سنبھل گیا۔

کلاڈیا کی تصویر کا یہ انداز مجھے بڑا عجیب لگا تھا۔ میں نے راج شری پر سے نگاہیں ہٹا لیں اور کلاڈیا کی تصویر کی آنکھوں کے سحر نے جیسے مجھے خود میں پیوست کر لیا۔ تبھی ایک نامانوس آواز میرے کانوں میں ابھری۔

''یہی تو سب کچھ ہے۔ یہیں تو غلطیاں کر رہے ہو۔ منزل تک پہنچتے ہو اور اس کے بعد ایک جھٹکے سے دور جا پڑتے ہو۔ ابھی تک نہیں سوچا تم نے اس بارے میں۔ بار بار تمہیں منع کیا گیا کہ خود کو اشبھ بھاوناؤں میں نہ ڈالو۔ لیکن لگتا ہے یہ اشبھ بھاوناائیں تمہارے خون کا ورثہ ہیں۔ یہیں سے تو تمہیں بچنا ہے۔ اگر یہ خون کا ورثہ بھی ہیں تو تمہیں اس جال سے نکلنا ہے۔ اس جال میں پھنسے رہو گے تو جیون بھر اپنی منزل نہیں پاؤ گے۔''

آوازیں بدل رہی تھیں۔ کبھی یہ آواز ایک دم سے تبدیل ہو کر وردان سادھانی کی آواز بن جاتی تھی، کبھی ایک اجنبی نسوانی آواز جو ناقابل فہم تھی جو واقعی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں ششدر رہ گیا تھا۔ اب یہ آواز میرے ذہن پر حاوی ہو گئی تھی جو مجھے راج شری کی قربت سے روکنا چاہتی تھی۔

میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ راج شری کو اپنے آپ سے دور کر دیا اور اپنا پاؤں پیچھے کھینچ لیا۔ راج شری چونک پڑی تھی۔ میں نے اسے آواز دی۔ ''راج شری......''

اور وہ چونک کر اس طرح آنکھیں پھاڑنے لگی جیسے نیند سے جاگ گئی ہو۔

”کیوں آئی ہو یہاں؟“ میں نے کہا اور وہ چاروں طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس کے منہ سے ایک سسکی جیسی آواز نکلی۔ اس نے میرے کمرے کو دیکھا اور بولی۔

”ہائے رام...... یہ میں...... یہ میں یہاں کیسے آ گئی؟“

”راج شری! میں اب بھی یہ نہیں کہوں گا کہ تم جان بوجھ کر ناٹک کر رہی ہو۔ لیکن میری جگہ کوئی بھی ہوگا، سوچے گا یہی جو میں سوچوں گا۔ بہتر ہے کہ تم خود ہی اپنے آپ کو سنبھالو اور ایسے راستے پر چلنے سے گریز کرو جو بعد میں تمہیں بیمار ڈال دے۔ تم ایک بار پھر یہاں آئی ہو۔ اور دیکھو، میں انسان ہوں، لمحوں میں بھٹک جانے والا انسان۔ میں اپنے آپ کو کسی بھی شکل میں ایک ایسا انسان نہیں کہہ سکتا جو پوتر ہو، جو بہت زیادہ پاک بنتا ہو۔ جاؤ، اپنے کمرے میں واپس جاؤ ورنہ کل پھر بخار میں مبتلا ہو جاؤ گی۔ میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تم میری منزل نہیں ہو اور نہ میں کوئی ایسی مثال قائم کرنا چاہتا ہوں اور نہ کر سکتا ہوں جس میں کسی کو اپنے قریب لے آیا جائے۔“

راج شری کے چہرے پر ایک عجیب سی بے بسی پھیل گئی۔ پھر وہ مرے مرے قدموں سے باہر نکل گئی۔ میں نے ایک ڈری ڈری نگاہ روپالیہ کی تصویر پر ڈالی۔ تصویر مجھے مسکراتی نظر آئی تھی۔

حقیقتاً یہ تصویر اس انداز میں مسکراتی ہوئی نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر ایک شگفتگی بے شک تھی لیکن اب جو کچھ مجھے نظر آ رہا تھا وہ پہلے سے بہت مختلف تھا۔ میں نے ایک عجیب و غریب انداز میں ہوش سنبھالا تھا، میرے ماضی کی کہانی بہت ہی حیران کن تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر کبھی اپنے ماضی پر بھی نگاہ ڈال لی جاتی تو ایک پراسرار قصہ تیار ہو جاتا تھا۔ میری پیدائش ہی پراسرار حالات میں ہوئی تھی۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ والد صاحب ذرا مختلف انداز کے آدمی تھے۔ ہمدان جمشیدی کی زندگی سیر و شکار میں گزری اور جب انہیں بیوی ملی تو انہوں نے اسے اپنا شکاری ساتھی بنا لیا۔ چونکہ خاص قسم کے زمیندار تھے جن کا مزاج ذرا الگ اور مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کسی ایک مرکز پر قناعت نہیں کی بلکہ مرکز نگاہ بدلتے رہے۔ لیکن میری والدہ کا جو مقام تھا وہ الگ ہی رہا اور شاید انہیں کبھی والد صاحب سے یہ شکایت نہیں ہوئی کہ وہ ان کی عدم توجہی کا شکار رہی ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ میں بھی شکار کے دوران میں اس دنیا میں نمودار ہوا۔ لیکن یہ کوئی ایسی پراسرار بات نہیں تھی۔

پھر والد صاحب نے مجھے اپنی لائن پر لگا لیا۔ ان کے سیر و شکار کی زندگی میں بھی کوئی ایسی انوکھی واردات نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے پراسرار قوتیں میرا پیچھا کریں۔ بس آغاز وہیں سے ہوا تھا جب میں بالکل ہی اتفاقیہ طور پر شو جی کے مندر میں پہنچا تھا اور دھرم شالہ میں دیوا ستھان میں بدھا کے مجسمے کی گود میں جا بیٹھا تھا۔ پتہ نہیں وقت کی کون سی دھار وہیں سے بگڑ گئی تھی اور حالات نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ جن میں وردان سادھانی، سیوک سندھورتی، ناشرہ اور نجانے کیسے کیسے انوکھے نام شامل ہو گئے تھے۔

دنیا میں بہت کم لوگوں کے ساتھ ایسا ہوا ہوگا۔ بس پھر اس کے بعد پراسرار طاقتیں میرے اردگرد پھیل گئیں۔ کلکتے میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ حالانکہ والد صاحب کو ان تمام باتوں سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی، وہ مجھے صرف ایک شکاری بنانا چاہتے تھے۔ دولت، جائیداد، زمینیں اتنی تھیں کہ اب بھی اگر میں ہندوستان پہنچ جاتا تو ظاہر ہے میری ہر چیز مجھے واپس مل جاتی، میں ایک عالیشان حکمران کی حیثیت سے وقت گزار سکتا تھا۔ لیکن کیا، کیا جاتا ان پراسرار قوتوں کا، وہ لوگ مجھے مہتر بدھ بنانا چاہتے تھے۔ پتہ نہیں یہ کمبخت کیا بلا تھی، میں تو سمجھ ہی نہیں سکا۔ جو جو تجربات مجھ پر بیت چکے تھے اور جس طرح مجھے بدھ پگوڈوں میں جانا پڑا تھا، گاشر برم کی پہاڑیوں میں عجیب و غریب خانقاہوں میں جو پراسرار لمحات مجھ پر بیتے تھے اور پھر وہ بھوج پتر جو مستقبل کا حال مجھے بتاتا تھا۔ وہ لوگ تو مجھے ایک دیوتا، ایک اوتار کا مقام دینا چاہتے تھے لیکن میں اپنی فطرت کو کیا کرتا۔

جس ماحول میں جنم لیا تھا اس ماحول کو تو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ بنانے والے جو کچھ بنانا چاہتے تھے وہ میں نہیں بن سکا اور اب تک بھٹک رہا تھا۔ اور پھر اتنے سارے دوسرے کردار جیسے کلاڈیا یا پھر جس طرح میں اسکندریہ سے مصیبتوں میں گرفتار ہو کر یہاں تک پہنچا تھا اس کے بعد رانی سریتا کا مل جانا اور اس کی ایک الگ کہانی اور پھر جگہ جگہ کلاڈیا۔

مجھے یہ احساس ہوا کہ جس طرح وردان سادھانی میرا پیچھا کرتا رہا ہے اسی طرح کلاڈیا بھی مجھ سے دور نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس دوران بے شمار کردار آئے۔ آغاز ایلس فیوری سے ہوا تھا مگر انجام ابھی نہیں ہوا تھا۔ اینہ اور اس کے بعد راج شری۔ میرے دل سے قریب جو کردار تھے ان میں اینہ سرفہرست تھی اور صحیح معنوں میں اس کے لئے میرے دل میں تڑپ تھی۔ لیکن اب اس کا وجود باقی نہیں رہا تھا۔ یہ تمام چیزیں اور یہ تمام کردار میری ذات پر

مسلط تھے۔ مجھے یہ احساس ہوا کہ کلاڈیا ضرورت سے زیادہ ہی میرے پاس ہے اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہ سارے کے سارے مجھے عورت کے قرب سے روکنا چاہتے تھے اور میرے دل و دماغ کی صفائی کے خواہشمند تھے۔

کبھی کبھی تو ان تمام سوچوں پر ہنسی آتی تھی۔ ارے بابا میں جس باپ کی اولاد ہوں وہ اسی طرح کا انسان تھا۔ کہاں کہاں تم لوگ میری دیکھ بھال کرو گے؟ کہاں کہاں تم لوگ مجھے بچاتے اور سنبھالتے رہو گے؟ میں تو لمحوں لمحوں میں بگڑنے والا ہوں۔ سنا مس کلاڈیا آپ نے۔ روپالیہ بن کر آئیں یا آسمانی مخلوق، میں تو یہ کہتا ہوں کہ ان تلوں میں تیل ہی نہیں ہے۔ نتیجے کا انتظار میرے باپ نے بھی نہیں کیا تھا اور میرے لئے بھی یہ مشکل ہے۔ راج شری بے چاری تو ویسے ہی قابل ہمدردی ہے، اسے تباہ و برباد کرنا بے شک ایک غلط عمل ہو گا۔ لیکن اس کے علاوہ محترمہ کلاڈیا! بچ کر رہئے، کہیں روپالیہ کی حیثیت سے آپ دھوکا نہ کھا جائیں۔ اور اب تو آپ سے میری منگنی بھی ہونی والی ہے۔ بہتر ہے کہ خود اپنے آپ کو سنبھالیں۔ کہیں میں آپ کی طرف ہی راغب نہ ہو جاؤں۔ اور میں آپ سے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔

میں نے یہ بات دل میں سوچی تھی اور صرف ازراہِ تمسخر کلاڈیا کی تصویر کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اب کلاڈیا کے چہرے پر مسکراہٹ کا نام و نشان نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ ایک ناخوشگوار سا انداز تھا۔ حیرانی کے باوجود میرے حلق سے ایک قہقہہ نکل گیا۔

''میں نے تو آپ کو اپنی فطرت بتائی ہے میڈم! ناراض ہوں یا کچھ بھی کریں، بات میں نے بالکل سچ کہی ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھ سے بچ کر رہیں۔ میرے وجود میں ایک اور بھی ہے جس نے آج تک میرے اقدامات کے سلسلے میں فیصلے کیے ہیں اور ہو سکتا ہے کسی وقت اس کا فیصلہ آپ کے بارے میں بھی ہو جائے۔ خیر، یہ تو ایک الگ بات ہے۔ لیکن اب یہ فیصلہ کیا ہے میں نے کہ یہ کھیل کچھ بھی ہو میں اس میں بھرپور حصہ لوں گا اور سریتا دیوی کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوں گا بے خوفی سے۔ آج تک جن جن چیزوں کے بارے میں خوف کرتا رہا ہوں، وہ بے مقصد ہیں۔ جناب وردان سادھانی، سیوک سندھوری، میڈم کلاڈیا اور جو کوئی بھی میرا ہمدرد ہے، آپ لوگ یہ غور کر لیجئے کہ جانا ہے مجھے ہندوستان۔ اور نہ صرف ہندوستان جاؤں گا بلکہ سیتا گڑھی بھی جاؤں گا اپنی جنم بھومی۔ اور اس کے بعد...... اس کے بعد......''

میری آنکھیں خوابوں میں ڈوب گئیں۔ بچپن کے وہ سہانے مناظر، ہمدان جمشیدی صاحب کے ساتھ سیر و سیاحت، شکار کی وہ تمام باتیں مجھے یاد آنے لگیں اور میں خوابوں میں ڈوب گیا۔

※☆※

رانی سریتا دیوی جو کھیل بھی کھیل رہی تھی، مجھے اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ حالانکہ اتنا میں ضرور جانتا تھا کہ جو کچھ وہ کر رہی ہیں، بے مقصد نہیں ہے۔ اس کے پس منظر میں کوئی خاص بات ہے۔ لیکن اب صورتحال بدل چکی تھی۔ میں اس خاص بات سے بھی متاثر نہیں تھا۔ بلاوجہ اپنے اوپر ایک خوف مسلط کر لیتا کبھی کسی کا، کبھی کسی کا۔ دشمنوں میں میرا بدترین دشمن ہیگ تھا جو بہرحال میرے ہاتھ نہیں لگ سکا تھا۔ انسان کو ان تمام چیزوں کی گنجائش تو رکھنا ہی ہوتی ہے۔ ضروری تو نہیں ہے کہ حالات آپ ہی کی مرضی کے تابع ہوں۔ دوسرے بھی تو بہر طور تقدیر بھی رکھتے ہیں اور عمل بھی کرتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حالات بدترین سے بدترین ہوئے ہیں لیکن ہیگ میرے ہاتھ نہیں آ سکا تھا۔ اور اس کی تقدیر نے اسے ہمیشہ میرے چنگل سے بچا لیا تھا۔ جبکہ میں نے اپنی زندگی کا بہترین وقت اسی کے لئے صرف کر دیا تھا اور نجانے کیسے کیسے کرداروں نے اس کی مدد کی تھی۔

سریتا دیوی نے بڑی خوشی کے عالم میں مجھے بتایا۔

''رانا جسپال نے منگنی کی تاریخ طے کر دی ہے۔ میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہمارے درمیان گفتگو ہوئی اور انہوں نے منگنی طے کر دی۔''

''یہ سب آپ ہی کا کام ہے سریتا دیوی!''

''اچھا ایک بات بتاؤ، برا تو نہیں مانو گے میری بات کا؟''

''بھلا آپ کی بات کا میں برا مان سکتا ہوں؟''

''میں تم سے یہ بات کہہ چکی ہوں کہ تم میرے دل کی گہرائیوں میں اترتے جا رہے ہو اور اس کی بنیادی وجہ تمہارا پیارا کردار ہے۔''

''شکریہ رانی جی! آپ خود بھی تو اتنی ہی اچھی ہیں۔ جتنے پیار اور مہربانی سے آپ مجھ سے پیش آتی ہیں، نجانے میرے دل میں کیسے کیسے جذبے جاگ اٹھتے ہیں آپ کے لئے۔''

میں نے مکاری کا مظاہرہ کیا اور یہ کہنے میں بالکل عار نہیں محسوس کرتا کہ یہ سو فیصدی مکاری ہی تھی۔ ورنہ سریتا دیوی کے لئے میرے دل میں ایسی کوئی جذباتی کیفیت نہیں تھی۔

"آج سے پانچویں دن ہمیں منگنی میں شرکت کرنا ہوگی۔ ہم چند افراد جائیں گے اور منگنی ہو جائے گی۔ اور اس کے بعد بہت خوبصورت وقت گزرے گا۔ ہم ہندوستان واپس جائیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"جی۔"

"تم دیکھنا تو سہی کہ چندی گڑھ پہنچنے کے بعد ہوتا کیا ہے۔ میں تمہیں ایک شاندار روپ دوں گی۔ ناز کرو گے تم اپنے آپ پر۔"

میں دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔ میں نے سوچا کہ سریتا جی! وقت نے مجھ سے بہت کچھ چھین لیا ہے ورنہ میں آپ کو بتاتا کہ میں کیا ہوں۔

بہر حال ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ راج شری اس دن سے میرے سامنے نہیں آئی۔ جے شری البتہ میری خدمت پر مامور رہی اور جے شری نے کوئی ایسا عمل نہیں کیا جس سے مجھے کوئی دقت ہوتی۔ کلاڈیا کی تصویر میری خوابگاہ میں موجود تھی اور میں یہ بات کہنے میں عار نہیں محسوس کرتا کہ جب بھی میری کوئی اُلجھن ہوتی میں اس تصویر سے مدد حاصل کر لیتا۔ بہر حال مجھے اس سے بڑا فائدہ ہو رہا تھا۔

وہ دن آ گیا جب منگنی ہونی تھی۔ سریتا دیوی نے لندن کے ایک بہت بڑے جیولر سے انتہائی قیمتی ہیرے کی انگوٹھی خریدی تھی اور اس کے ساتھ ہی ہیروں کے پانچ سیٹ خریدے گئے تھے۔ دولت کی ان کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔

پھر ایک نیا کردار میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ رانی سریتا دیوی نے اس سے میرا تعارف پرلوک ناتھ کہہ کر کرایا تھا۔ دُبلے پتلے بدن کا مالک انتہائی شاطر چہرے والا آدمی تھا۔ اس کی دونوں آنکھوں میں دو دنیائیں بسی ہوئی تھیں۔ ذرا بھی غور کر لیا جاتا ان آنکھوں پر تو لگتا تھا جیسے کسی شیطان کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

"ہیلو پرنس!" اس نے مسکرا کر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"ہیلو۔"

"میرا نام پرلوک ناتھ ہے۔"

"پرلوک؟"

"ہاں۔"

"میرے خیال میں پرلوک تو عدم آباد کو کہتے ہیں۔" میں نے کہا تو وہ ہنس پڑا۔

"عدم اور وجود یہی دو کہانیاں انسان کی زندگی پر مسلط ہیں۔ یا تو وہ عالم وجود میں ہوتا ہے یا عدم آباد پہنچ جاتا ہے۔"

"مگر پرلوک ناتھ جی، آپ کا نام عدم آباد کیوں ہے؟"

"یہ میرا اصل نام نہیں ہے۔" پرلوک ناتھ نے ایک مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اچھا......؟"

"ہاں۔"

"تو پھر؟"

"اصل نام تو میں نے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ یہ میری صفت ہے۔"

"پرلوک؟"

"ہاں۔ وجود سے عدم تک پہنچانا میرے لئے آسان ترین کام ہے۔"

"رانی جی سے آپ کا کیا واسطہ ہے؟"

"منیجر ہوں ان کا۔" اس نے کہا اور ہنس پڑا۔ اس ہنسی میں بہت سے طنز پوشیدہ تھے۔

"گویا آپ ان کے راستے صاف کرتے ہیں؟"

"نہیں بھائی! بھنگی نہیں ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی ہر مشکل کا حل میرے پاس ہے۔ ان کی زندگی کی کتاب چیک کرتا ہوں، یہ سمجھ لو۔"

"ہوں ہوں......ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ لیکن پرلوک ناتھ جی! کبھی پہاڑ دیکھا ہے؟"

"اونٹ بھی دیکھا ہے۔" پرلوک ناتھ نے میری بات کا برا مانے بغیر اصل بات سمجھ کر کہا۔

"کیا خیال ہے ان دونوں چیزوں کے بارے میں؟"

"فرسودہ کہانیاں ہیں بیوقوفوں کی بنائی ہوئی۔ پہاڑ ایک بے جان چیز ہے جبکہ اونٹ متحرک ہوتا ہے۔ اپنی بلندیوں کے بارے میں وہ بے شک سوچتا ہے اور اپنے آپ کو بلند و بالا سمجھتا ہے لیکن کسی پہاڑ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہئے کیونکہ وہ اس پہاڑ کی بلندیاں طے کر سکتا ہے جبکہ پہاڑ اس کی بلندیوں کو نہیں چھو سکتا۔"

"عجیب منطق ہے۔"

"ہر منطق عجیب ہی ہوتی ہے۔"

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ویسے ایک بات بتائیے؟"

"جی جی پرنس!"

"ہمارے لئے بھی کچھ کریں گے؟"

"آپ ہی کے لئے تو سب کچھ کر رہا ہوں۔"

"ایسے نہیں۔"

"پھر؟"

"تمام معاملات سے ہٹ کر۔"

"دیکھئے اس سنسار میں ہر شخص سب سے پہلے اپنا مفاد دیکھتا ہے اس کے بعد کچھ اور۔"

"کیا مطلب؟"

"شعر ہے ایک کہ

اپنی ذات سے عشق ہے سچا
باقی سب افسانے ہیں

تو بات یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص ایک کسوٹی اپنے سامنے رکھتا ہے، اپنے مفادات کی کسوٹی۔"

"اگر آپ کی کسی فرمائش میں، آپ کے کسی عمل میں میرا مفاد پوشیدہ ہوا تو میں آپ کے کام ضرور آؤں گا۔"

"یہی تو میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا تو وہ ایک دم چونک گیا، پھر سنبھل کر بولا۔

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی ایسا مشترکہ مفاد سامنے آیا جس میں میرا اور آپ کا دونوں کا فائدہ ہو تو کیا آپ میرا ساتھ دینا پسند کریں گے؟"

اب وہ محتاط نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا، پھر مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "خطرناک آدمی معلوم ہوتے ہو۔ جینا بھی جانتے ہو اور سودے کرنا بھی۔ ہاں، خیال رکھنا اس چیز کا، اگر کہیں ہمارا مشترکہ مفاد ہوا اور کسی کو کوئی بڑا نقصان نہ پہنچا تو میں تم سے سودا کر سکتا ہوں۔ باقی ساری باتوں کو بھول جاؤ۔"

"تو پھر ہاتھ تو ملاتے جائیے۔"

"دیکھو دوست! اگر تم ہاتھ ملانے کو کوئی جذباتی معاہدہ سمجھتے ہو تو سب سے بڑی حماقت یہی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں بھی وہ شعر کہا گیا ہے کہ

دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا"

"شاعری سے بہت دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔"

"خود بھی ایک شاعر ہوں۔"

"پرلوک کی کہانیاں سناتے ہو گے۔"

"تخلص بھی پرلوک ہی کرتا ہوں۔"

"واہ، بہر حال اچھے آدمی ہو۔ مزہ آیا تم سے مل کر۔"

"اور تم بھی اتنے ہلکے نہیں ہو جتنا لوگوں نے تمہیں سمجھا ہے۔ میں نے اچانک ہی تمہارے وزن کو محسوس کیا ہے۔" پرلوک ناتھ نے کہا اور مسکراتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ میں دیر تک اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔

رانی سریتا دیوی ان تمام معاملات میں بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ اس طرح بھاگ بھاگ کر وہ سارے انتظامات کر رہی تھی جس طرح کوئی اپنا کر سکتا ہے۔

آخر کار وقت مقررہ پر ہم رانا جسپال کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ لندن جیسے قیمتی شہر میں ایسی عالیشان رہائش گاہ کا تصور عام لوگ نہیں کر سکتے تھے۔ رانا جسپال بھی عام آدمی نہیں تھا، لندن کے بڑے بڑے صاحب حیثیت لوگ وہاں مدعو کئے گئے تھے اور خوبصورت عمارت کو دلہن بنا دیا گیا تھا۔ جتنا انداز تھا میرا اتنے ہی شاندار بلکہ اس سے کہیں زیادہ شاندار انتظامات کئے گئے تھے۔ ایک لمحے کے لئے دل پر ایک عجیب سا بوجھ سوار ہوا۔

یہ منگنی جس حیثیت کی حامل بھی ہے لیکن بہر حال مجھے کسی لڑکی کی انگلی میں انگوٹھی پہنانی ہے۔ ایسے تصورات سے نجانے کتنے لوگوں کی جذباتی وابستگی ہوتی ہے۔ مگر میرا تو ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو میرے لئے جذباتی ہوتا۔ میری زندگی عجیب ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے سانسوں پر کسی نے قبضہ کر لیا ہو اور میں ایک عمر قیدی ہوں جو صرف اپنی قید کے دن کاٹ رہا ہوتا ہے۔

ان جذباتی احساسات کو میں نے فوراً ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ رانا جسپال اور اس کے ساتھیوں نے ہمارا پُرجوش خیر مقدم کیا اور بڑے احترام کے ساتھ خاص طور سے بنائی ہوئی جگہ پر جا کر بٹھایا۔ ہم لوگ بیٹھ گئے۔ رانی سریتا دیوی بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ کچھ لمحے وہ

میرے پاس رکیں اور اس کے بعد مہمانوں سے ملنے جلنے لگیں۔ کوئی آدھے گھنٹے تک اسی طرح وقت گزرا اور اس کے بعد روپالیہ آ گئی۔

بہت سی لڑکیوں کے جھرمٹ میں وہ آ رہی تھی۔ ان میں انگریز لڑکیاں بھی تھیں، ہندو بھی تھیں۔ رانا جسپال نے غالباً ہندوستان سے بھی اپنے مہمان بلائے تھے کیونکہ کچھ نئے چہرے بھی نظر آ رہے تھے۔ آخر کار روپالیہ کو میرے پاس لایا گیا۔ وہ انتہائی حسین لباس میں ملبوس تھی اور کسی قدر شرمائی شرمائی سی نظر آ رہی تھی۔ میں نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اور دوسرے لمحے مجھے چکر آ گیا...... جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا وہ بہت غیر یقینی تھا۔ میں نے آنکھیں زور سے بند کر لیں۔ انہیں بھینچ لیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ دوسرے لوگ میری اس کیفیت کو دیکھیں گے تو نجانے کیا سوچیں گے۔ لیکن میری یہ کیفیت بالکل فطری تھی کیونکہ اس وقت کی روپالیہ بالکل بدلی ہوئی تھی۔ یہ وہ چہرہ ہی نہیں تھا جو میں دیکھتا چلا آیا تھا۔

ایک انتہائی دلکش لڑکی سبک سبک، حسین حسین نقش و نگار والی۔ لیکن یہ کلاڈیا کا چہرہ نہیں تھا۔ اپنے نقش و نگار، اپنی سبک روی لئے ہوئے یہ چہرہ میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ لیکن یہ بات ناقابل فہم تھی۔ باقی تمام لوگ بالکل مطمئن نظر آ رہے تھے۔ رانی سریتا دیوی بھی بالکل ہی مطمئن تھی۔ لیکن...... لیکن سب کیا ہے؟ اچانک ہی سریتا نے میرے شانوں پر دباؤ ڈال کر کہا۔

"ہردیپ، اٹھو۔ روپالیہ کا سواگت کرو۔" مجھے ایک دم جیسے ہوش آ گیا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ روپالیہ میرے برابر صوفے پر بیٹھ گئی لیکن میرے ہوش و حواس اب بھی غائب تھے۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کیسے ہو گیا؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ لاکھوں سوالات میرے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ اب انسان تو تھا، اپنے آپ کو کیسے سنبھال سکتا؟ پرلوک ناتھ ہی میرے قریب آیا اور اس نے انگوٹھی کا بکس میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"پرنس ہردیپ سنگھ! لیجئے یہ انگوٹھی اپنی منگیتر کی انگلی میں ڈال دیجئے۔"

انگوٹھی پہنانے کی رسم پوری ہوئی۔ میں نے روپالیہ کی انگلی میں انگوٹھی ڈال دی تھی لیکن اس دوران بھی میری نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کرتی رہی تھیں۔ نہیں تھی، بالکل نہیں تھی۔ اس میں تو کلاڈیا کی کہیں سے ایک جھلک نہیں تھی۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ باقی تمام لوگ مطمئن ہیں۔ کیا صرف میری ہی آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے؟ دفعتہً ہی میرے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا۔ یہ اگر کوئی پراسرار عمل ہے تو مجھے کسی قسم کے ہلکے پن کا مظاہرہ نہیں کرنا

چاہئے۔

روپالیہ میری منزل تو نہیں تھی۔ یہ تو ایک واقعہ تھا جو بس ہو رہا تھا۔ ہاں بس ذرا سا تبدیل شدہ چہرہ میرے لئے الجھن کا باعث تھا۔ یہ کیسے ہو رہا ہے؟ اور یہ تمام لوگ کیسے مطمئن نظر آ رہے ہیں؟ بڑی مشکل سے اپنے اعصاب قابو میں کئے، خود کو سنبھالا۔ ہر طرف ہنسی خوشی کی برسات ہو رہی تھی۔ ہر شخص خوش نظر آ رہا تھا۔ بہت ہی دلچسپ لمحات گزر رہے تھے۔ روپالیہ بڑی مطمئن اور مسرور نظر آ رہی تھی اور میں بار بار اس کا چہرہ دیکھنے لگتا تھا۔

یہ بدلی ہوئی شکل والی لڑکی بھی بہت دلکش تھی بلکہ کسی بھی طرح کلاڈیا سے کم نہیں تھی بلکہ کچھ زیادہ ہی دلکش تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ کلاڈیا میری منزل تھی اور نہ یہ۔ یہ تو صرف رانی سریتا دیوی کا شوق تھا جو وہ نجانے کس مقصد کے تحت یہ سب کچھ کر رہی تھی۔ بہرحال اب میں نے اپنے آپ کو اعصابی طور پر سنبھال لیا تھا۔ اس بات کی تحقیق بھی ہو جائے گی۔

تقریب کے ہنگامے جاری رہے۔ آرکسٹرا مدھم دھنیں بکھیر رہا تھا۔ مہمان خوش نظر آ رہے تھے۔ رانا جسپال بہت زیادہ خوش تھے۔ مجھے سینکڑوں تحائف پیش کئے گئے اور خود رانی کی طرف سے بھی بے شمار لوگوں نے روپالیہ کے لئے تحائف پیش کئے تھے۔

تقریباً ساڑھے بارہ بجے کا وقت ہو گیا۔ مہمان رخصت ہونے لگے تھے۔ روپالیہ میرے ساتھ ہی تھی اور بڑی مطمئن اور مسرور نظر آ رہی تھی۔ پھر ہمیں کچھ لمحوں کی تنہائی ملی تو روپالیہ نے کہا۔

"ایک بات کہوں پرنس؟"

میں نے چونک کر اسے دیکھا، آواز تک اجنبی تھی۔ بڑی دلکش اور کھنکتی ہوئی آواز۔

"ہاں کہئے؟"

"کچھ عجیب سا لگ رہا ہے مجھے۔"

"کیسا؟" میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کچھ عجیب سی کیفیت کا شکار ہیں۔"

"وضاحت کرو گی؟" میں نے کہا۔

"ہاں، مجھے یوں لگ رہا ہے آپ اتنے خوش نہیں ہیں جتنی...... جتنی......"

"جی...... جتنی؟"

"جتنی میں ہوں۔"

"آپ خوش ہیں؟"
"ہاں کیوں نہیں۔" وہ اعتماد سے بولی۔
"چلئے...... آپ تو خوش ہیں۔"
"مطلب یہ کہ آپ خوش نہیں ہیں۔"
"کیوں نہیں روپالیہ جی۔ ظاہر ہے ہم دونوں کی مرضی سے یہ منگنی ہوئی ہے۔"
"پھر آپ عجیب عجیب سے کیوں ہو رہے ہیں؟"
"اچھا ایک بات بتایئے۔"
"ہاں پوچھئے؟"
"کیا اس سے پہلے میں آپ کو کچھ مختلف محسوس ہوا تھا؟"
"زیادہ تو نہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے یہ میری سوچ ہو۔ اصل میں انسان بہت سے معاملات میں بڑے مختلف احساسات کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی بہت ہی انوکھی بات ہوئی ہے اور ہر شخص کو اس انوکھے پن کا اظہار کرنا چاہئے۔ اب جیسے میں تو آپ کے ساتھ بہت اچھا محسوس کر رہی ہوں بلکہ یوں لگ رہا ہے جیسے ہم جیون کے سو سال گزار چکے ہوں اور ان سو سالوں کی رفاقت ہماری رہبر ہو۔ ہم اسی انداز میں سوچ رہے ہوں۔" میں ہنسنے لگا۔ وہ بھی ہنسنے لگی اور بولی۔
"کیا سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے آپ کو بوڑھا کر دیا۔"
"نہیں...... میں ایسے نہیں سوچ رہا۔ آپ کی باتیں بہت خوبصورت ہیں۔ اچھا ایک بات بتایئے روپالیہ جی!"
"ہاں پوچھئے؟"
"پہلے ملاقاتیں کتنی ہو چکی ہیں ہماری؟"
"غالباً چار یا پانچ۔"
"آپ نے اس وقت میں اور ان پہلی ملاقاتوں میں میرے اندر کوئی تبدیلی پائی؟"
"نہیں۔ اسے تبدیلی نہیں کہہ سکتے۔ بس میں نے کہا نا وہی بات ہے کہ میں سوچ رہی ہوں کہ بہت ہی انوکھی بات ہے اور یہ انوکھی بات ہم دونوں کے دل و دماغ پر مسلط ہے۔ غالباً مجھے وہ چیز آپ کے چہرے پر نظر نہیں آ رہی۔ اب ضروری تو نہیں ہے کہ ہر شخص کا سوچنے کا انداز وہی ہے۔ میں مختلف انداز میں سوچ رہی ہوں۔ آپ مرد ہیں، مختلف انداز

میں سوچ رہے ہیں۔"
"بہر حال چھوڑیئے ان باتوں کو۔ کیا کہا جا سکتا ہے۔"
"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ اوہو، دیکھئے کون آ رہا ہے۔"
رانا جسپال اور سریتا دیوی اس طرف آ رہے تھے۔
"چلئے پرنس ہردیپ سنگھ! اپنے سسر جی سے اجازت لیجئے۔ اب چلیں۔ دیکھئے ایک بجنے والا ہے۔ ان لوگوں کو بھی آرام کرنا ہوگا۔"
"ہماری چنتا نہ کریں۔ آپ اگر جانا چاہتی ہیں تو بے شک جایئے۔"
"اور ہردیپ؟"
"نہیں میرا مطلب ہے......" رانا جسپال نے کہا اور سریتا کا قہقہہ بلند ہو گیا۔
"گھبرا گئے رانا صاحب؟"
"نہیں نہیں، گھبرانے کی کیا بات ہے؟ اب تو یہ گھر بھی ہردیپ کا ہے۔ جب دل چاہے آ کر رہیں۔"
"چلو ہردیپ، چلو۔ کہیں تم بھی پھسل ہی مت جانا۔" سریتا دیوی نے مذاق کرتے ہوئے کہا اور اس کے بعد ہم نے واپسی کی اجازت طلب کر لی۔ میں بڑی زبردست سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ظاہر ہے اس بات کی وضاحت تو مجھے کرنا ہی تھی اور اس کے لئے سریتا کے علاوہ اور کوئی میرے ذہن میں نہیں تھا۔
کار میں، میں اور سریتا دیوی ساتھ ساتھ تھے۔ ڈرائیور، ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ پرلوک ناتھ نے وہیں سے رخصت حاصل کر لی تھی۔ دوسرے مہمان بھی وہیں سے چلے گئے تھے۔ میں نے سریتا دیوی سے کہا۔ "ایک بات نہیں بتائیں گی مجھے آنٹی؟"
سریتا نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "کیا؟"
"آپ کے خیال میں کچھ نہیں ہوا؟"
"مطلب کیا ہے تمہارا، منگنی ہوئی اور کیا ہوا؟"
"میں سنجیدہ ہوں واقعی۔"
"منگنی کے سلسلے میں؟"
"نہیں، تعجب کی بات ہے سریتا دیوی، تعجب کی بات ہے۔ آپ کو میرے دماغ میں کوئی خرابی نظر آ رہی ہے۔"

"کہنا کیا چاہتے ہو ہردیپ! بعض اوقات ضرورت سے زیادہ خوشی انسان کو عجیب و غریب باتیں کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

"کیوں؟"

"آپ اتنی شانِ بے نیازی سے کام لے رہی ہیں کہ میری عقل میرا ساتھ چھوڑتی جا رہی ہے۔"

"اب تم میری عقل خبط کرنے کے چکر میں ہو۔ واقعی کوئی سنجیدہ بات ہے یا تم مذاق کر رہے ہو؟"

"نہیں، میں مذاق نہیں کر رہا۔"

"کیا ہوا...... کیا بات ہے؟"

"آپ کو روپالیہ میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی؟"

"بہت سندر لگ رہی تھی۔ وہ ہے بھی پیاری۔ کسی اور تبدیلی کی بات کر رہے ہو؟"

"وہ روپالیہ ہی تھی؟" میں نے کہا اور سریتا دیوی چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

"کوئی مذاق کر رہے ہو؟ بڑے سنجیدہ سنجیدہ سے لگ رہے ہو۔ اتنی سنجیدگی سے تم مذاق کرتے نہیں ہو۔ کیا بات ہے؟"

"آنٹی، وہ روپالیہ ہی تھی؟"

"کون؟"

"وہی جسے میں نے انگوٹھی پہنائی تھی۔"

"ہاں۔ تو پھر؟"

"آنٹی! وہ روپالیہ نہیں تھی۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ وہ روپالیہ نہیں تھی۔" میں نے کہا اور سریتا دیوی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"میری سمجھ میں واقعی کچھ نہیں آ رہا۔ تم نے تو مجھے ایک عجیب سی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ مطلب کیا ہے تمہارا اس بات کا؟"

"آہ...... تب شاید میں ہی پاگل ہوں گیا ہوں آنٹی۔ وہ روپالیہ نہیں تھی۔"

"پھر کون تھا؟"

"میں نہیں جانتا وہ چہرہ میرا اجنبی تھا۔ میں حیرت سے پاگل ہو گیا تھا جب میں نے اس کی شکل دیکھی تھی آنٹی۔ یہ وہ روپالیہ نہیں تھی۔"

سریتا دیوی پھٹی پھٹی نگاہوں سے میرا جائزہ لینے لگی پھر بولی "تمہیں کیا ہوا ہے...... کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"آپ یقین کر لیں، جس روپالیہ سے میں تین چار پانچ بار مل چکا ہوں یہ وہ روپالیہ نہیں تھی۔"

سریتا دیوی عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی، پھر بولی۔ "اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ اگر تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو تو میں تم سے درخواست ہی کر سکتی ہوں کہ پلیز اس طرح کا مذاق نہ کرو۔ میں برداشت نہیں کر پا رہی۔"

"میں مذاق نہیں کر رہا آنٹی۔ جس روپالیہ سے میں پہلے دن ملا تھا اور...... اور......" میں نے اپنی زبان کو احتیاط کے ساتھ سنبھال لیا۔ ظاہر ہے کلاڈیا کے بارے میں، میں تفصیل نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ "آنٹی! وہ روپالیہ بالکل مختلف تھی۔ ایک الگ چہرہ تھا بالکل۔"

"کوئی بھی نہیں کہہ سکتا۔ پہلے دن جب روپالیہ سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی تو میں تم سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی اور پھر رانا جسپال کی بیٹی کو میں آج سے نہیں کافی عرصہ پہلے سے جانتی ہوں۔"

"آپ کے خیال میں آنٹی! اس میں کوئی تبدیلی نہیں تھی؟"

"بس آج وہ مختلف ڈریس میں تھی۔ انڈین ڈریس میں۔ اس سے پہلے بھی وہ تمہیں ہندوستانی لباس میں ملی تھی۔ لیکن آج اس نے جو میک اپ کیا ہوا تھا وہ مختلف تھا۔ لیکن بہرحال تھی وہ روپالیہ ہی۔ مجھے بڑی حیرت ہے۔ اچھا مجھے یہ بتاؤ اس دوران تم اس کے ساتھ رہے، تمہیں وہ مسلسل اجنبی محسوس ہوتی رہی؟"

"ہاں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

دفعتہً میں اچھل پڑا اور میں نے کہا۔ "آنٹی، ایک بات۔ میں اپنی بات کا ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔"

"ہاں بتاؤ، کیسا ثبوت؟"

"آنٹی! میں روپالیہ سے ایک تصویر مانگ کر لایا تھا۔"
"ہاں میں نے تمہارے کمرے میں دیکھی ہے۔"
"اس تصویر میں روپالیہ کا اصل چہرہ ہے اور...... اور......"
ہاں اور کیا؟"
"نہیں، میرا مطلب ہے اگر وہ تصویر الگ ہوئی تو آپ یہ بات مان لیں گی؟"
"ماننے کی تو خیر بات ہی نہیں۔ چونکہ میں روپالیہ کو جانتی ہوں۔ وہ تم سے پہلے بھی ملی تھی اور یہ وہی روپالیہ تھی۔ دوسری کوئی ہو ہی نہیں سکتی رانا صاحب اس طرح کے آدمی نہیں ہیں۔ اور پھر ہم سب کی نگاہیں تو تھیں نا۔ ہم پاگل تو نہیں ہیں۔"
"آنٹی! وہ روپالیہ نہیں تھی۔ آپ تصویر میں دیکھ لیجئے اور اس کے بعد فیصلہ کر لیجئے۔"
"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ چلو چلتے ہیں۔ ہو جائے گا یہ فیصلہ بھی۔"
آخر کار ہم واپس اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ میں مضطربانہ انداز میں سریتا دیوی کا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا اور اس کے بعد میں نے کہا۔
"دیکھئے...... اب دیکھئے ذرا یہ تصویر۔" یہ کہہ کر میں نے تصویر کی جانب اشارہ کیا اور خود بھی اس کی طرف دیکھا۔ لیکن اس کے بعد آنکھیں بند کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ اپنے دماغ کا علاج ہی کرانا ضروری تھا۔ کیونکہ اس وقت جو تصویر دیوار پر نظر آ رہی تھی وہ کلاڈیا کی تصویر نہیں تھی بلکہ اسی لڑکی کی تصویر تھی جس کے ہاتھ میں، میں نے منگنی کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ یہ کلاڈیا بالکل نہیں تھی۔ وہ کلاڈیا جو مجھے ہر بات پر سرزنش کرتی تھی، مجھے گھورتی تھی، میرے لئے ہنستی تھی مسکراتی تھی، آہ...... یہ کیا قصہ ہے؟
سریتا دیوی غور سے میری صورت دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ "شاید تم کچھ تھک گئے ہو۔ پلیز...... تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ اب جاؤ، لباس تبدیل کرو۔ میں تمہیں ویلیم بھیجتی ہوں، وہ لے لو، پُرسکون ہو جاؤ گے۔"
میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلا دی تھی اور اس کے بعد میں غصیلی نگاہوں سے کلاڈیا کی تصویر کو دیکھنے لگا تھا۔ پھر میں نے کہا۔
"کلاڈیا! کلکتہ میں تم سے میری ملاقات ذرا مختلف انداز میں ہوئی تھی۔ تم کرنل صغیر کی بیٹی تھیں اور اس وقت میرے اور تمہارے درمیان ایسے روابط نہیں رہے تھے جن کی بنا پر میں تم سے بہت زیادہ متاثر ہوتا۔ لیکن پھر تم نے جس طرح میرا پیچھا کیا، وہ میرے لئے

ناقابل فہم رہا۔ میں نہیں جانتا کلاڈیا کہ تمہارا کردار کیا ہے، کیا چاہتی ہو تم؟ دیکھو کلاڈیا، مجھے اس طرح تنگ مت کرو۔ میں بہت تھکا ہوا انسان ہوں۔ اتنے عجیب و غریب اور پریشان کن حالات سے گزر چکا ہوں کہ اب میرے دماغ میں مزید ایسے دھماکے سہنے کی صلاحت نہیں رہی ہے۔ پلیز......"
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ جے شری دودھ کا گلاس اور ویلیم کی گولیاں لئے ہوئے اندر آئی تھی۔
"میڈم نے بھیجی ہیں۔"
"لاؤ......" میں نے اس کے ہاتھ سے گلاس اور گولیاں لے لیں اور پھر اچانک ہی مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے اسے روکا۔ "جے شری، بات سنو۔"
وہ چونک کر رک گئی۔
"جے شری! میں تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔"
"جی پوچھئے؟"
"یہ تصویر دیکھو۔" میں نے تصویر کی جانب اشارہ کیا اور اب جو میں نے اس تصویر کو دیکھا تو وہ کلاڈیا ہی کی تصویر تھی۔ جے شری سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے کلاڈیا کی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔
"جی آگے کہئے راجکمار؟"
"نہیں جے شری، شکریہ۔ جاؤ۔" میں نے تھکی تھکی آواز میں کہا اور وہ مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی باہر نکل گئی۔
"پتہ نہیں کیا ہے سب کچھ۔ پتہ نہیں کیا ہے۔ کلاڈیا! باز آ جاؤ۔ یہ اندازہ تو مجھے ہو چکا ہے کہ تم پراسرار قوتوں کی مالک ہو۔ لیکن میرا مشن بہت مختلف ہے۔ اب مجھے اپنے مشن میں کامیابی حاصل کرنے دو۔ میں اس سارے طلسم سے نکل جانا چاہتا ہوں جس نے میری زندگی کے راستے بدل دیئے ہیں۔ کلاڈیا پلیز...... پلیز......" میں نے مسہری پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

***

اس کے بعد تقریباً ایک ہفتہ لندن ہی میں گزر گیا۔ اس دوران روپالیہ روزانہ ہی میرے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ ہم دونوں سیر و سیاحت کو نکل جاتے تھے۔ روپالیہ نے کئی بار مجھ سے کہا

تھا کہ وہ نجانے کیوں میرے اندر کچھ تبدیلی سی محسوس کر رہی ہے۔ لیکن ظاہر ہے میں اس بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے مسکرا کر بات ٹال دی تھی۔ اب اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

بہرحال اسی طرح سے یہ ہفتہ گزر گیا۔ روپالیہ اب باقاعدہ مجھ سے اقرارِ محبت کرنے لگی تھی اور اس بات پر بہت زیادہ متردّد تھی کہ ہندوستان جا رہا ہوں۔ وہ اس بات کی خواہشمند تھی کہ اسے جلد از جلد میری قربت حاصل ہو جائے۔ آخر کار تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ رانا جسپال بہت افسردہ تھا اور اس نے چلتے ہوئے سریتا دیوی سے کہا تھا۔

”سریتا جی! ان بچوں کو اب ہم ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں رکھ سکتے۔ آپ بھی جلد ہی پروگرام بنائیں۔ ویسے آپ نے یہ ایک اچھا فیصلہ کیا ہے کہ اب ہردیپ کو سینٹ لوسیا نہیں بھیج رہیں۔ اب انہیں ہندوستان ہی میں اپنے ذمہ داریاں سنبھالنے کا موقع دیجئے۔“

”آپ چنتا ہی نہ کریں رانا جی۔ بہت جلد ہم کوئی مناسب فیصلہ کر لیں گے۔“ رانی سریتا دیوی نے کہا۔ پرلوک ناتھ بھی اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ ایئر پورٹ پر موجود تھا۔ نجانے کیوں یہ شخص مجھے کوئی غیر انسانی مخلوق لگتا تھا۔

بہرحال ہمارے سفر کا آغاز ہو گیا۔ ایک بار میں سمندری راستے سے سفر کرتا ہوا اسکندریہ اور پھر وہاں سے نجانے کہاں کہاں پہنچا تھا اور اب پھر ہندوستان واپس جا رہا تھا۔ اُس وقت جو حالات تھے وہ بہت مختلف تھے۔ لیکن اس وقت صورتحال خاصی پُراعتماد تھی۔ حالانکہ رانی سریتا کیا، جن پُراسرار حالات میں، میں گھرا ہوا تھا ان میں کوئی بھی میری مدد نہیں کر سکتا تھا لیکن بات وہی آ جاتی ہے کہ جب تک انسان خود اپنی مدد کرنے کا فیصلہ نہ کرے کوئی دوسرا اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ رانی سریتا کا جو بھی کھیل تھا، میں جانتا تھا کہ وہ خاصا پُراسرار ہے اور یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا کوئی گہرا پس منظر ہے۔ لیکن بہرحال جب میں واپس ہندوستان جا رہا تھا تو میرے اندر ایک دوسرا ہی انسان جنم لے چکا تھا اور میں دوسروں سے زیادہ اس پر بھروسہ کر کے ہندوستان واپس جا رہا تھا۔

آخر کار ہم ہندوستان پہنچ گئے۔ رانی سریتا دیوی کی حیثیت کے بارے میں تو کوئی شک وشبہ نہیں رہا تھا۔ اس کا شاندار استقبال کیا گیا تھا اور میری بھی کافی پذیرائی کی گئی تھی۔ ایک بات میرے لئے ذرا قابل غور تھی، وہ یہ کہ کیا مقامی لوگوں میں سے کوئی مجھے نہیں جانتا تھا؟

میرا مطلب ہے ہردیپ سنگھ کو۔ ظاہر ہے اس طرح تو یہ رسک نہیں لیا جا سکتا تھا۔ لیکن پتہ نہیں رانی جی نے کیا چکر چلایا تھا۔ کسی نے کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا اور ہم لوگ چندی گڑھ پہنچ گئے۔

ریاست چندی گڑھ میں رانی کا محل بے حد شاندار تھا۔ قدیم طرز کی یہ حسین عمارت قابل دید تھی۔ میرے لئے بہترین انتظامات کئے گئے تھے۔ غلام گردشیں اور غلام، بہت ساری باندیاں، یہ سمجھ لیا جائے کہ درحقیقت ایک عالی شان محل میں ایک شہزادے کی پذیرائی ہو رہی تھی۔

بہرحال دو تین دن اسی طرح گزر گئے۔ مجھے محل کی سیر بھی کرائی گئی۔ میں نے خود بھی محل کا جائزہ لیا۔ میری آنکھیں وہ متجسس چہرے تلاش کر رہی تھیں جو مجھے دیکھ کر حیران ہوں۔ لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ ابھی تک کسی حیرانی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا تھا۔

ویسے زیادہ لوگوں سے میری واقفیت بھی نہیں کرائی گئی تھی۔ رانی نے مجھے مخصوص رکھا تھا۔ اور یوں نواحات کی سیر کرائی گئی اور میں اس علاقے کی خوبصورتی سے بہت متاثر ہوا تھا۔ میرے ذہن میں ماضی کی یادیں ہر وقت گردش کرتی رہتی تھیں اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ یہ بات تو طے تھی کہ رانی کے اشاروں پر چلنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ اپنے طور پر بھی کچھ سوچنا تھا۔ میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے رانی کی اصلیت کا پتہ چل جائے کہ آخر وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ اس کی کیا مجال تھی کہ وہ مجھے میری مرضی کے خلاف یہاں روک سکتی۔ لیکن جس کھیل کا آغاز لندن سے ہوا تھا میں اس کی پوری تفصیل جاننا چاہتا تھا اور یہی چیز مجھے یہاں روکے ہوئے تھی۔

جہاں تک روپالیہ کا تعلق تھا تو اس کے سلسلے میں ویسے ہی ایک انوکھا کھیل ہو چکا تھا۔ روپالیہ کا ٹیلی فون روزانہ آتا تھا اور ایک بیوقوف لڑکی جس قسم کی باتیں کر سکتی تھی، وہی باتیں کرتی رہتی تھی۔ میں اسے بیوقوف اس لئے کہتا تھا کہ لندن جیسی جگہ پرورش پانے کے باوجود وہ ایک خالص ہندوستانی تھی۔ جبکہ اس قدر جذباتیت انسان کو کچھ نہیں دیتی۔ زندگی تو کھیل ہی کھیل ہے۔ بس کون کس کے بارے میں سوچے اور ان سوچوں سے کیا نتیجہ نکلے اس کے لئے کیا کہا جا سکتا ہے۔

آخر کار حالات نے خود اپنے اندر تبدیلی پیدا کی اور کھیل تھوڑا سا بدلا۔ اس دوران میں محل کا اچھی طرح سے جائزہ لے چکا تھا۔ اس کے بہت سے گوشے میری نگاہوں کے

سامنے تھے۔ وہاں کے حالات کا بھی مجھے اندازہ تھا۔ میرے اوپر کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں تھی بلکہ ایک طرح سے مجھے اس محل یا حویلی میں پوری پوری آزادی دے دی گئی تھی۔

چنانچہ اس رات بھی میں اپنی خوابگاہ میں بہت دیر تک اس کھڑکی کے پاس کھڑا رہا تھا جو حویلی کے عقبی حصے میں کھلتی تھی۔ اس طرف ایک وسیع و عریض باغ تھا جس میں پھولوں کے اونچے اونچے کنج لگے ہوئے تھے۔ پھولوں کی مہک پوری حویلی میں چکراتی پھرتی تھی۔ خاص طور سے رات کے وقت رات کی رانی تو قیامت ڈھا دیتی تھی۔ چند لمحوں کے لئے کھڑکی کھول دی جاتی تو ہوا کے جھونکے پورے کمرے کو خوشبو میں بسا دیتے۔ مجھے یہ خوشبو بے حد پسند تھی۔ چنانچہ اکثر میں رات کو کھڑکی کھول دیا کرتا تا کہ ہلکی ہلکی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی رہے۔ باہر کا دروازہ اندر سے بند کر لیا کرتا تھا۔

اس رات بھی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں پوری طرح سویا نہیں تھا بس نیم غنودہ کیفیت تھی۔ خیالات کے سلسلے کہاں پیچھا چھوڑتے ہیں اور یہ خیالات میری زندگی کا حصہ بن گئے تھے۔ بس بہت کچھ سوچتا تھا اپنے بارے میں ان دنوں۔ سیتا گڑھی بہت یاد آتی تھی۔ میں ان تمام کرداروں کو یاد کر رہا تھا جو میرے قریبی عزیز تھے۔ یہ بھی یاد کر رہا تھا کہ کون مجھ سے کتنی محبت کرتا تھا۔ خیر اصل چیز تو والدین ہوتے ہیں جو نہ رہے تھے۔ لیکن اب بھی میرے ایسے بہت سے عزیز و اقارب وہاں موجود تھے جو مجھے چاہتے تھے۔ ان کی یاد دل میں چٹکیاں لے رہی تھی اور میں ان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہی سوچتے سوچتے نیند آنکھوں میں آگھسی تھی۔

پھر نجانے کتنی دیر گزری تھی کہ دفعتہً ہی مجھے کچھ ایسی آہٹوں کا احساس ہوا جو اجنبی تھیں اس احساس کے ساتھ ہی میں نے اپنے چہرے پر ایک گرم بھاپ محسوس کی۔ کسی کے سانس کی بھاپ تھی۔ یہ نہ وہم تھا نہ خواب۔ کیونکہ خواب دیکھنے والی نیند ابھی تک طاری نہیں ہوئی تھی اور وہم یوں نہیں ہو سکتا تھا کہ ہوش و حواس جاگ رہے تھے اور پورے ہوش و حواس کے عالم میں، میں نے اس بھاپ کو محسوس کیا تھا۔

میری آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔ کوئی چہرہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ بالوں کی کچھ لٹیں میرے چہرے کو چھو رہی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی لڑکی ہے۔ جیسے ہی میری آنکھیں کھلیں چہرہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے نقوش میری آنکھوں میں واضح نہیں ہو سکے تھے۔ لیکن ہیولا مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا اس سے مکمل طور پر یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کوئی نوجوان لڑکی

ہے۔ بمشکل تمام میرے منہ سے نکلا۔

"کک...... کون ہے؟"

لیکن میری بات کا جواب دینے کی بجائے وہ تیزی سے واپس پلٹی اور اس کھڑکی کی جانب دوڑی۔ میں پھرتی سے اٹھ گیا تھا۔

"رُکو...... رُک جاؤ...... بات سنو۔ کون ہو تم...... رُکو تو سہی۔ رُکو...... رُک جاؤ۔" میرے منہ سے نکلا۔ لیکن اب وہ دوڑنے لگی تھی۔ ایک لمحے کے اندر اندر وہ کھڑکی پر پہنچی اور پھر غڑاپ سے کھڑکی میں داخل ہو کر دوسری طرف کود گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑا تھا۔ کھڑکی سے باہر کوئی پندرہ گز کے فاصلے پر وہ ایک سمت دوڑ رہی تھی۔ بے اختیاری میں، میں نے بھی کھڑکی کی دوسری طرف چھلانگ لگائی اور بری طرح زمین پر گر پڑا۔ لیکن پھر اٹھا اور دوبارہ اٹھ کر دوڑنے لگا۔ باہر تاروں کی مدھم چھاؤں میں لڑکی کے دوڑتے ہوئے ہیولے کو میں بخوبی دیکھ رہا تھا۔ اس کی رفتار بہت زیادہ تیز نہیں تھی لیکن اس وقت میں نے اس پر غور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی ایک سمت مڑ گئی۔ میں نے بھی ادھر ہی کا رخ کیا۔

حویلی کا یہ حصہ آگے جا کر پرانی حویلی سے جا ملا تھا۔ لڑکی اسی طرف جا رہی تھی۔ میں نے اسے آواز نہیں دی تھی کیونکہ حویلی میں رات کو چوکیدار گشت کیا کرتے تھے۔ لڑکی حویلی کے بوسیدہ حصے کی طرف جا رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ ایسی جگہ رُکی جہاں اینٹوں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ وہ احتیاط سے اس ڈھیر پر چڑھنے لگی۔ یہ حویلی سے باہر نکلنے کا راستہ تھا اور میں نے پہلی بار ہی دیکھا تھا۔ لڑکی کو میں ٹوٹی حویلی کے دوسری طرف اب بیرونی حصے میں دیکھ سکتا تھا۔ وہ بدستور بھاگی جا رہی تھی۔ لیکن نجانے کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس سے زیادہ تیز رفتاری سے دوڑ سکتی ہے لیکن دوڑ نہیں رہی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے اپنے پیچھے لگائے رکھنا چاہتی ہو۔

ایک لمحے کے لئے میں محتاط ہو گیا۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ ہو سکتا ہے وہ جان بوجھ کر مجھے اپنے پیچھے لگا کر کہیں لے جانا چاہتی ہو۔ لیکن یہ احتیاط بے معنی تھی۔ میں تو مشکل حالات میں گھرا ہی ہوا تھا۔ اگر کوئی مجھے قتل بھی کرنا چاہتا ہے تو کم از کم یہ تو پتہ چلنا چاہئے کہ وہ کون ہے۔ ڈر کر رک جانا تو ایک بے معنی سی بات ہوگی۔ ذہن میں خلش ہی رہے گی کہ وہ کون تھا۔

چنانچہ میں دوڑتا رہا اور اس تک پہنچنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

میں نے خاص طور سے محسوس کی تھی کہ لڑکی کی رفتار ویسے تو اچھی خاصی تیز تھی لیکن جب میں کوشش کر کے اس کے قریب پہنچنا چاہتا تھا تو اچانک ہی وہ اپنی رفتار تیز کر دیتی۔ بلکہ یوں لگتا جیسے وہ ایک دم فارورڈ ہو گئی ہو۔ میں کافی دور نکل آیا تھا اور پھر کافی فاصلے پر کولی کے کھنڈرات نظر آنے لگے۔ رانی سریتا دیوی نے مجھے چندی گڑھ کے نواحات کی سیر بھی کرائی تھی۔ ویسے بھی چندی گڑھ بہت بڑی جگہ نہیں تھی۔ ان کھنڈرات کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ بڑے تاریخی کھنڈرات ہیں اور چندی گڑھ کی تاریخ میں کولی کا ذکر بڑے پراسرار الفاظ میں آتا ہے۔ اس وقت وہی کھنڈرات میری نگاہوں کے سامنے آ گئے تھے اور لڑکی انہی کھنڈرات میں داخل ہو رہی تھی۔

میں محتاط انداز میں ان کھنڈرات تک پہنچ گیا اور اس کے بعد اندر داخل ہو گیا۔ درحقیقت اندر کا منظر بے حد بھیانک تھا۔ بات وہی ہو جاتی ہے، انسان خطرناک سے خطرناک ماحول سے گزرتے وقت گزر جاتا ہے تو بہت کچھ ذہن سے نکل جاتا ہے۔ ہشمان ذکری کی وہ رہائش گاہ جہاں اس نے چیتے پالے ہوئے تھے میرے لئے بڑی دہشت ناک تھی۔ لیکن اب اس وقت یہ کھنڈرات بے حد خوفناک لگ رہے تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے زندگی میں اس سے خوفناک جگہ پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔ میرے قدم رُک گئے اور میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگا۔

دفعتہً ہی مجھے یوں لگا جیسے کسی نے کھنک دار سکوں کو اچھالا ہو۔ ایک چھناکے کی آواز تھی۔ میں چونک پڑا اور نفسیاتی طور پر میرے قدم اسی آواز کی جانب اٹھ گئے۔ دو ہی باتیں ہوتی ہیں، اگر انسان بزدل ہوتا ہے تو شروع ہی سے محتاط رہتا ہے اور ایسے عمل سے بچنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے لئے کسی بھی شکل میں نقصان دہ ثابت ہو۔ اور اگر اس کے اندر تھوڑی بہت ہمت ہوتی ہے تو پھر بات کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔ میں بھی اگر خوف محسوس کرتا تو اصولی طور پر مجھے لڑکی کے پیچھے آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ اور جب میں یہاں تک آ گیا تھا تو پھر مجھے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ میں اس آواز کی جانب بڑھ گیا۔

چار پانچ سیڑھیاں تھیں اور اس کے بعد ایک وسیع و عریض چبوترہ۔ آگے دو در بنے ہوئے تھے۔ چمکدار سکوں کی چھنکار انہی دروں کی طرف سے آئی تھی۔ میں برق رفتاری سے آگے بڑھ کر ان دروں میں سے ایک در کے اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک دالان جیسی جگہ تھی اور تاریکی کے باوجود مدھم مدھم نظر آ رہی تھی۔ عین سامنے ایک روشن دروازہ کھلا ہوا تھا۔

دروازے کے دوسری جانب مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ حیرت ناک بات تھی۔ حالانکہ اندر سے دل بار بار کہہ رہا تھا کہ خاقان جمشیدی، کسی جال میں پھنسنے جا رہے ہو۔ تمہارے لئے ایک باقاعدہ جال بچھایا گیا ہے۔ لیکن وحشت کہہ رہی تھی کہ بے خطر آتش نمرود میں کود جایا جائے۔

چنانچہ میں آگے بڑھ کر اس در میں داخل ہو گیا۔ اب آواز دینے میں کوئی دقت نہیں تھی۔ میں نے چیخ کر کہا۔

”تم جو کوئی بھی ہو، رک جاؤ۔ اگر تم مجھے یہاں تک لانا چاہتی تھیں تو دیکھو میں بے خوف و خطر یہاں آ گیا ہوں۔ ڈرتا نہیں ہوں میں کسی بھی چیز سے۔ تم میرے سامنے آؤ۔ مجھے بتاؤ کہ مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟ اگر مجھے کوئی جسمانی نقصان پہنچانا چاہتی ہو تو بھی میں حاضر ہوں، وجہ ضرور پوچھوں گا تم سے۔ اور اگر...... سنو سنو...... میری بات سنو...... میری بات تو سن لو۔ تمہیں مجھ سے مایوسی نہیں ہو گی۔ تم جو کچھ بھی چاہتی ہو میں اس میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“

لیکن اب ہر آواز مفقود ہو گئی تھی۔ میں روشن در سے آگے بڑھا ہی تھا کہ لڑکھڑا گیا۔ وہ سیڑھیاں تھیں جو نیچے چلی گئی تھیں۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اندر مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور مجھے حیرت تھی کہ یہ روشنی کیسی ہے کیونکہ ان کھنڈرات میں، میں نے الیکٹرک لائن نہیں دیکھی تھی۔ میں سیڑھیاں اترتا چلا گیا اور پھر ایک وسیع و عریض تہہ خانے میں پہنچ گیا جہاں دیواروں پر مشعلیں روشن تھیں۔ میری نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ تب میں نے وہاں ایک مسہری نما جگہ دیکھی۔ اس مسہری پر کوئی کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ خیر دل میں خوف و دہشت تو نہیں پیدا ہوا تھا لیکن ان پراسرار حالات نے تھوڑا سا الجھا ضرور دیا تھا۔ میں اپنی جگہ کھڑا اس جگہ کو دیکھتا رہا اور پھر میرے قدم آہستہ آہستہ اس جانب اٹھ گئے۔ لڑکی کا اب یہاں کوئی وجود نہیں تھا۔ میرے دل میں یہی خیال آیا تھا کہ ممکن ہے اب وہ لڑکی یہاں آ کر بستر پر لیٹ گئی ہو۔ وہ جو کوئی بھی تھی بہرطور میرے ذہن میں اس کے لئے تجسس تھا اور میں اس کی اصلیت جاننا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ پھر میں نے مدھم لہجے میں کہا۔

”دیکھو...... تم جو کوئی بھی ہو میں ایک بار پھر تم سے درخواست کرتا ہوں کہ کوئی الٹی سیدھی حرکت کرنے کی بجائے مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ یہ بھی بتاؤ کہ مجھے یہاں تک

لانے سے تمہاری کیا غرض ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے تعاون کروں گا۔ بالکل بے فکر رہو، میں تم سے مکمل تعاون کروں گا۔"

اچانک ہی کمبل اوڑھنے والے وجود نے اپنے چہرے سے کمبل ہٹایا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ایک نوجوان کا چہرہ ہے۔ اچھا خاصا خوش شکل نوجوان تھا لیکن عجیب و غریب کیفیت کا شکار۔ اس کی حیران نگاہیں میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ غالباً میری آواز نے اسے جگا دیا تھا۔ میں نے ایک بھرپور نگاہ سے اسے دیکھا اور اس کے بعد اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ مجھے تو اس لڑکی کی تلاش تھی۔

نوجوان کچھ دیر تک حیرانی سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "کیا بات ہے، اس وقت کیوں آئے ہو؟ کوئی نیا کھیل؟"

میں گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ پھر میں نے کہا۔ "اٹھ کر بیٹھنا پسند کرو گے دوست؟"

"دوست؟" وہ حیرت سے بولا۔

"کیوں...... اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟"

"مذاق اڑا رہے ہو نا؟"

"مذاق؟"

"تو اور کیا۔ یہاں کوئی ایسا ہے جو مجھے دوست کہہ سکے۔"

"اوہو...... اس کا مطلب ہے کہ یہاں تمہارے بہت سے دشمن ہیں۔"

"تم ان سے اجنبیت کا اظہار کیسے کر رہے ہو؟"

"اس لئے کہ میں انہیں نہیں جانتا۔"

"کوئی نیا مذاق۔ چلو ٹھیک ہے، کیا حرج ہے۔ ہم تو ہیں ہی پنچنگ بیگ۔ جس کا دل چاہے ہم پر مشق کر سکتا ہے۔"

"اٹھ کر بیٹھو۔" میں نے کہا اور اس نے کمبل اپنے بدن پر سے ہٹا دیا۔ پھر اس مسہری پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ قمیض پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اچھے تن و توش کا مالک تھا۔ اس نے اپنے پیروں کو دیکھا اور پھر میری طرف۔ اس کے بعد بولا۔

"جی فرمایئے؟ ویسے یہ بتانا پسند کریں گے آپ کہ وقت کیا ہوا ہے؟"

"صحیح وقت نہیں معلوم دوست۔ لیکن ایک ڈیڑھ کے قریب ہے۔"

"اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ اس سے پہلے آپ لوگوں میں سے کوئی اس وقت نہیں آیا۔ کیا میرا آخری وقت آ پہنچا ہے؟"

"غلط فہمیوں کا شکار ہو۔ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانے نہیں آیا اور نہ ہی میں جان بوجھ کر یہاں آیا ہوں بلکہ...... بلکہ......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔

"کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟ تابعدار ہوں۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"بتایا نہیں گیا؟"

"دیکھو مجھ سے تعاون کرو۔ میں نہیں جانتا تم کون ہو۔ بظاہر تو یوں لگ رہا ہے جیسے تم یہاں قیدی ہو۔"

"آپ اس پراسرار تہہ خانے میں کیسے تشریف لائے جس کے بارے میں کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ کس طرح یہ کھلتا ہے کس طرح بند ہوتا ہے؟"

"کیا......؟"

میں اچھل پڑا۔ ایک دہشت کی لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہاں اس قید خانے میں مجھے قید کرنے کے لئے لایا گیا ہو۔ یہ شخص جو کہہ رہا ہے اگر وہ سچ ہے تو اب تک تہہ خانے کا دروازہ بند ہو جانا چاہئے تھا۔ میں آندھی طوفان کی طرح واپس پلٹا اور اس کے بعد تہہ خانے کے دروازے تک پہنچ گیا۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے یہ جائزہ لیا کہ دروازہ کیسے کھلتا ہے اور کیسے بند ہوتا ہے۔ کئی منٹ تک غور کرنے کے بعد مجھے ایک ایسی کیل نظر آئی جو دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی کیل ہو سکتی تھی۔ باہر ہی پتھر کے ایک حصے میں یہ کیل بنی ہوئی تھی۔ میں نے اسے ٹٹول کر دیکھا تو دروازہ ایک سل کے ذریعے بند ہو گیا۔ کیل کو دبایا، دروازہ کھل گیا۔ اندر سے نہ یہ کھل سکتا تھا نہ بند ہو سکتا تھا۔ یہ تھی اس کی تکنیک۔ لیکن وہ لڑکی غائب تھی ابھی تک۔ نجانے کیوں اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ اگر مجھے بھی یہاں قید کیا جانا تھا تو اصولی طور پر یہ دروازہ باہر سے بند کر دینا چاہئے تھا۔ کوئی اور ہی چکر ہے۔ میں واپس پلٹا تو اس نوجوان کو میں نے اپنے بالکل پیچھے سیڑھی پر کھڑے ہوئے پایا۔ اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"میں زخمی ہوں۔ تم سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بہت دن سے کھلا آسمان دیکھنے کی آرزو

ہے۔ مجھے بتاؤ کیا تم مجھے اس کی اجازت دو گے؟ ورنہ پھر سیدھی سیدھی بات کرو کہ تمہیں رانی سریتا نے یہاں بھیجا ہے۔“

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا، پھر اچانک ہی مجھے کچھ خیال آیا۔ تہہ خانے سے باہر نکل جانا ہر حالت میں فائدہ مند ہے۔ صورتحال کچھ بھی ہو اس چوہے دان میں آ کر صورتحال خراب ہو سکتی ہے۔ وہ شخص بھی باہر آنے کا خواہش مند تھا۔ لمحہ بھر سوچتے رہنے کے بعد میں نے اس سے کہا۔

”آؤ......“

اُس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ ہلکی سی لنگڑاہٹ کے ساتھ سیڑھیاں طے کرنے لگا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ کچھ سوچ کر میں نے وہ کیل دبائی اور دروازہ بند ہو گیا۔ وہ کہنے لگا۔

”یہ دروازہ باہر ہی سے کھلتا ہے اور باہر ہی سے بند ہوتا ہے۔ ایک آدمی کبھی تہہ خانے میں نہیں آتا، دو ہوتے ہیں۔ ایک باہر کھڑا رہتا ہے دوسرا اندر آتا ہے۔“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ میرے ساتھ لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا اور اب انہی کھنڈرات میں مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں رُک کر میں اس سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کر سکوں۔ لڑکی کا اب نام و نشان بھی نہیں تھا۔ میں اس کی جسامت اور حلیے پر غور کرنے لگا۔ لیکن اب اتنا ماہر بھی نہیں تھا کہ سب کچھ معلوم کر لیتا۔

بہرحال کھنڈر کے ایک حصے میں پہنچ کر میں نے اس سے کہا۔ ”جانے کو تو ہم راتوں رات یہاں سے کافی دور نکل سکتے ہیں۔ کیا تم پیدل چلنے کی پوزیشن میں ہو؟“

”دیکھو، میں جانتا ہوں یہاں اس قید خانے میں مجھے صرف اسی لئے زندہ رکھا گیا ہے کہ وہ مجھ سے مختلف معاملات میں معلومات حاصل کرتی رہتی ہے ورنہ کبھی کا ختم کر دیا جاتا۔ میری عمر دیکھو...... میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میرے دونوں پیر زخمی کر دیئے گئے ہیں اور ان پر اکثر ضربیں لگائی جاتی رہتی ہیں تاکہ میں بھاگ نہ سکوں۔ لیکن میں چل سکتا ہوں۔ زندگی بچانے کے لئے میں چل سکتا ہوں۔“

نجانے کیوں اس شخص کی آواز میں مجھے ایک درد انگیز کیفیت محسوس ہوئی تھی۔ صورتحال میں ایک دم تبدیلی رونما ہوئی تھی اور مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اپنی اس حیثیت کو برقرار رکھوں جو ہردیپ سنگھ کی حیثیت تھی یا پھر موجودہ صورتحال کو بدل دوں؟ اب جو کچھ بھی ہوگا وہ دیکھا

جائے گا۔ میں کچھ نہ کچھ تو کرتا ہوں۔ اس نوجوان کے بارے میں، میں یہی کہہ سکتا تھا کہ اس تک میری رہنمائی کی گئی ہے۔ رہنمائی کرنے والا کوئی بھی ہو مجھے اس کی رہنمائی کو قبول کر لینا چاہئے۔ دل اندر سے یہی کہہ رہا تھا اور آج تک دل ہی کی تو بات مان کر ذلیل و خوار ہوتا رہا تھا۔ چنانچہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد میں نے کہا۔

”آؤ...... یہاں سے چلتے ہیں۔ یہ جگہ خطرناک ہو سکتی ہے۔“

”میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا میرے دوست!“ اس نے کہا اور میں اسے سہارا دے کر کھنڈرات سے باہر جانے والے راستے کی طرف چل پڑا۔

دو تین بار میں نے اس نوجوان کی شخصیت پر غور کیا۔ قید میں ہونے کی وجہ سے اس کا حلیہ بری طرح بگڑا ہوا تھا لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک پڑھا لکھا اور مہذب نوجوان ہے۔ شکل و صورت کا بھی بہت اچھا ہے، جسامت بھی بری نہیں ہے۔ پتہ نہیں کن حالات کا شکار ہوا اور رانی سریتا نے اس کے ساتھ یہ برا سلوک کیوں کیا تھا؟ رانی سریتا ویسے تو ایک پراسرار شخصیت تھی لیکن ایسی کسی بات کی توقع اس سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ بہرحال ان کھنڈرات سے دور نکل جانا ضروری تھا۔ چنانچہ میں اسے سہارا دیئے ہوئے آگے لے جاتا رہا۔ راستے میں، میں نے اس سے سوال کیا۔

”تمہارے دونوں ٹخنے زخمی ہیں؟“

”ہاں...... ایک مخصوص طریقے سے میرے ٹخنوں کی ہڈیاں اتار دی گئی ہیں۔ ان پر سوجن ہے۔ وہ ایک انتہائی کمینہ صفت بوڑھا ہے جو غالباً ہڈیوں کے جوڑوں کا ماہر معلوم ہوتا ہے۔ کمبخت پیروں کو پکڑ کر بار بار جھٹکے دیتا ہے اور تم یہ سمجھ لو کہ میں تکلیف کی وجہ سے موت کی آرزو کرنے لگتا ہوں۔“

میں نے اس کے پیروں پر سے کپڑا ہٹا کر اس کے ٹخنوں کو دیکھا، واقعی کافی سوجے ہوئے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کے لئے چلنا بہت مشکل کام ہے لیکن پھر بھی اس کو یہاں سے اتنی دور لے جانا چاہتا تھا کہ اگر وقت پڑنے پر ہماری تلاش بھی ہو تو رانی ہمیں تلاش نہ کر سکے۔ اب یہاں تک عمل کر تو ڈالا تھا چنانچہ اس عمل کو آگے بڑھانا ضروری تھا۔ نتیجہ اچھا نکلے یا برا۔ میں ہندوستان پہنچ گیا تھا اور رانی کے حوالے سے پہنچا تھا۔ رانی کے ذریعے مجھے بھرپور تحفظ حاصل ہو سکتا تھا لیکن نجانے رانی کا کھیل کیا تھا۔

بہرحال یہ بات طے تھی کہ مجھے کسی نے حویلی سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا کیونکہ صدر

دروازے سے آیا ہی نہیں تھا۔ اگر صورتحال میری مرضی کے مطابق نہ ہوئی اور مجھے رانی ہی کا سہارا لینا پڑا تو پھر رانی سے کوئی بہانہ کر دوں گا۔ کوئی بھی کہانی سنائی جا سکتی ہے اسے۔ یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ میں کس طرح اس کے خلاف عمل کر رہا ہوں۔ ابھی تک میں نے ایسا کوئی تاثر اسے دیا ہی نہیں تھا بلکہ اس کا مکمل احترام کرتا رہا تھا اور اسے یہ باور کرا دیا تھا کہ میں مکمل طور پر اس کے حق میں ہوں اور کسی بھی طرح اس سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ پھر اچانک ہی آگے بڑھا اور میں نے اس شخص کے ہاتھ کو اپنی گردن میں ڈالا اور جھک کر اسے کندھے پر اٹھا لیا۔

''ارے ارے بھائی...... ارے بھائی...... ارے یہ کیا کر رہے ہو، گر جاؤں گا۔''

''نہیں گرو گے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا اور وہ خاموش ہو گیا۔

اپنے آپ کو آزمانا بھی ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے زندگی میں کبھی شدید جسمانی مشقت کی ضرورت بھی پیش آ جائے۔ کم از کم اپنے آپ کو آزمانا تو چاہئے۔ میں اسے لئے چلتا رہا۔ وہ میرا ممنون احسان ہو گیا تھا۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد پھر اس نے عاجزی سے کہا۔

''بھائی مجھے اتار دو۔ اچھا خاصا وزنی آدمی ہوں، کہاں تک لے کر جاؤ گے؟''

''تھوڑا فاصلہ اور طے کر لیتے ہیں، پھر دیکھیں گے کہ کیا ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ لیکن ایک بات اور ہے، انسان کی اگر نیت ٹھیک ہوتی ہے تو قدرت بھی اس کی مدد کرتی ہے۔ میں اسے لئے ہوئے مزید کچھ دور چلا تھا کہ مجھے ایک کچی چوڑی پگڈنڈی نظر آئی۔ پگڈنڈی تو خیر کوئی ایسی اہم چیز نہیں تھی لیکن عقب سے گھنٹیوں کے بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ایک روشنی متحرک تھی۔ میں رک گیا۔

ماحول سے واقفیت بھی ضروری تھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک چھکڑا گاڑی ہے جس میں دو بیل جتے ہوئے ہیں۔ سامنے کے حصے میں لالٹین لٹکی ہوئی تھی۔ بیلوں کے گلے میں گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک انسان کا ہیولہ بھی نظر آ رہا تھا۔ میں اسے کندھے پر لئے ہوئے رک کر کھڑا ہو گیا۔ یہ تو قدرتی مدد تھی۔ زیادہ سے زیادہ دو یا ڈھائی بجے ہوں گے۔ پتہ نہیں بیل گاڑی میں کون تھا اور کہاں جا رہا تھا۔ اس نے بھی ہمیں دیکھ لیا اور تھوڑی دیر کے بعد بیل گاڑی ہمارے قریب آ کر رک گئی۔ بیل گاڑی کے سامنے والے حصے پر بیٹھے ہوئے شخص نے بیلوں کے جوئے میں لٹکی ہوئی لالٹین اٹھائی اور اسے اونچی کر کے مجھے دیکھنے لگا۔

''ارے کا کرت ہو سسروا! مار ڈالن کا بیچارے کو؟'' کسی دیہاتی کی آواز ابھری۔

''نہیں بابا جی! میرا بھائی ہے۔ بے چارے کے ٹخنے اتر گئے ہیں، چل نہیں سکتا اس لئے کندھے پر لادے ہوئے ہیں۔''

''ارے بھیا تو بٹھاؤ نا۔ سسروا بیل گاڑی ما لے آؤ...... لے آؤ...... ارے بہت بڑھیا کیا، سیا رام پہلوان کے سامنے اِی کا لا کر۔ ٹھہرا چرا گاڑی روکت رہن۔ دیکھیں تو کیسے ٹخنوا اتر گئی رے۔''

وہ کوئی ہمدرد آدمی تھا۔ بیل گاڑی میں گھاس لدی ہوئی تھی اس لئے وہ اور زیادہ آرام دہ ہو گئی تھی۔ میں نے اس کی مدد سے اس نوجوان کو گھاس پر لٹا دیا اور سیا رام پہلوان گاڑی کے پچھلے حصے میں آ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''لو لالٹین پکڑ لو۔''

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ لالٹین کی روشنی میں نوجوان کے پیر ٹٹولنے لگا نوجوان کے حلق سے ہلکی ہلکی کراہیں نکل رہی تھیں۔

''ابھی ٹھیک کر دیت ہیں۔ ابھی جرا ہمت سے کام لو۔''

''مگر سیا رام جی!'' میں نے کہا تو وہ حیرت سے بولا۔

''ارے تم ہم کا کیسے جانت رہو بھیا؟''

''بس سیا رام جی! آپ نے ابھی کہا تھا نا سیا رام پہلوان۔''

''ارے ہاں، ہم ہی سسروا پاگل ہیں۔ پر یہ ٹخنے تو بہت پہلے کے اترے ہوئے ہیں۔ سوجن یہی بتاتی ہے۔ پر تم چنتا مت کرو ابھی راستے ما ہی ٹھیک ہو جائی ہے۔ اے کون سی بڑی بات ہے، ہم تو ٹوٹی ہوئی ٹانگیں چپکا دیتے ہیں۔ دیکھو بھیا! یہ جو گھاس ہے نا اگر ہم تمہارے منہ میں بھر دیں تو کیسا رہے گا؟'' سیا رام نے کہا۔ ایک ہلکی سی آواز آئی اور نوجوان کے حلق سے ایک دھاڑ نکل گئی۔

''ارے کا ہے سور مچات ہو۔ بیل بیچارے ڈر جاویں گے۔'' سیا رام نے کہا اور دوسری چٹاک کی آواز ابھری اور نوجوان پھر چیخا۔

''لو کھیل ختم ہوئی گیا۔ ایک منٹ۔'' سیا رام نے کہا اور پھر جیب سے کوئی چھوٹی سی شیشی نکالی۔ ''اس میں سرسوں کا تیل ہے۔ ہلکے سے اس کی ٹانگوں پر مالش کر دو اور ذرا کپڑے سے ڈھک دو پھر دیکھو تماشہ۔ پر جا کہاں رہے ہو بھیا؟''

"برابر کے گاؤں۔"

"کویا؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں۔"

"لو، تو ہم بھی تو وہیں جا رہے ہیں۔ یہ گھاس صبح کو پہنچانی ہے۔ ویسے اس کے بعد دن میں آرام کریں گے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سیارام بیل گاڑی ہانکنے لگا تھا۔ میں اس شخص کے پیروں پر مالش کرنے لگا۔ وہ میرا بہت ممنون تھا۔ خاموشی سے اپنے پیروں کی مالش کراتا رہا اور اس کے بعد بولا۔

"تم جو کوئی بھی ہو دوست! ایک بات میں جانتا ہوں، ساری زندگی تمہارے اس احسان کا صلہ نہیں دے سکتا۔ تم نے بہت بڑا کام کیا ہے میرے لئے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ تمہیں تعجب ہوگا کہ میں اپنے پیروں میں توانائی محسوس کر رہا ہوں۔ حالانکہ کافی دن سے اس قدر کرب اور اذیت کا شکار تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔"

"بس قدرت ہی رہنمائی کرتی ہے۔ تمہارا نام نہیں معلوم ہو سکا مجھے؟"

"ستنام سنگھ ہے میرا نام۔ بس یوں سمجھ لو کہ زندگی کے ایک بہت بڑے جال میں گرفتار ہو گیا۔ کیا بتاؤں تمہیں۔ ایک اچھے گھرانے کا فرد ہوں۔ دہلی میں میرا پورا خاندان موجود ہے اور میں اپنے سارے خاندان کا چہیتا ہوں۔ اس سے پہلے سینٹ لوسیا میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ خیال تھا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وطن واپس جاؤں گا۔ لیکن بس ایک چکر میں پڑ گیا۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ سینٹ لوسیا اور رانی سریتا دیوی، باتیں ایک دوسرے سے نتھی نظر آتی تھیں۔ وہ اپنی دھن میں پھر بول پڑا۔ "سینٹ لوسیا میں میرا ایک جگری دوست ہردیپ سنگھ میرے ساتھ تعلیم حاصل کرتا تھا۔ اس کا تعلق یہاں چندی گڑھ سے تھا۔ اچانک ہی اسے اس کی چچی کا پیغام ملا۔ یہ چندی گڑھ ہی میں رانی سریتا دیوی کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کی سب سے بڑی شخصیتوں میں سے ہے۔ وہ اپنی ماسی کے پیغام پر لندن جانے کو تیار ہوا اور اس نے مجھ سے درخواست کی کہ اگر میں اس کے ساتھ چلوں تو اسے بڑی تقویت ہو جائے گی۔ اتنا ہی گہرا دوست تھا وہ میرا۔ میں اس کی اس فرمائش کو رد نہیں کر سکا اور پرنس ہردیپ کے ساتھ لندن روانہ ہو گیا۔ لندن میں رانی سریتا

دیوی کی ذاتی رہائش گاہ ایک فارم ہاؤس کی شکل میں موجود تھی۔ ہم دونوں فارم ہاؤس پہنچ گئے اور ہمارے پہنچنے کے تین دن کے بعد ہی سریتا دیوی بھی آ گئی۔ ہردیپ سنگھ نے مجھے زیادہ تفصیل نہیں بتائی لیکن مجھے پتہ چلا کہ سریتا دیوی اور ہردیپ سنگھ کے درمیان کسی بات پر اختلاف ہو گیا ہے۔ اور پھر، ہے بھگوان...... ہے بھگوان...... سریتا نے ہردیپ سنگھ کو قتل کر دیا۔ ہلاک کر دیا اس نے اسے۔ میری آنکھوں کے سامنے کی بات ہے۔ اس کا دست راست پرلوک ناتھ نامی ایک شیطان صفت آدمی ہے جس نے ہردیپ سنگھ کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں نے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ بس اس کے بعد بہت سے لوگوں نے مل کر مجھے قابو میں کر لیا اور نجانے کتنے دن بے ہوش رہا ہوں۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں چندی گڑھ میں تھا، یہاں اس جگہ جہاں سے تم نے مجھے آزاد کرایا۔ سریتا دیوی نے مجھے بتایا کہ چونکہ میں اس کے جرم کا عینی گواہ ہوں اس لئے وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ میں نے لاکھ اس سے کہا کہ میں کبھی کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کروں گا، مجھے سینٹ لوسیا بھجوا دے یا پھر دہلی پہنچا دے۔ لیکن ظاہر ہے اس نے ایسا نہیں کیا اور میں اس کے قبضے میں رہا۔ وہ مجھے آہستہ آہستہ ہلاک کرنا چاہتی تھی۔ شاید میرے لئے بھی اس کے دل میں کوئی منصوبہ تھا۔ جانتے ہو وہ عورت کیا چیز ہے؟"

میرے ہوش و حواس رخصت ہوئے جا رہے تھے۔ سریتا دیوی اس قدر خطرناک عورت ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

"ہاں، آگے بولو ستنام سنگھ! آگے بولو۔"

"شیطان کا روپ ہے وہ دوسرا۔ ایک شیطانی عمل کر رہی ہے وہ اور اس نے ایک بڑا لمبا چکر چلا رکھا ہے۔ لندن میں رانا جسپال سنگھ نامی ایک شخص ہے، بڑا دولت مند آدمی ہے وہ۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ ہردیپ سنگھ کو اس کی بیٹی سے شادی کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ہردیپ سنگھ، رانا جسپال کی بیٹی سے سگائی کرے اور اس کے بعد وہ ہردیپ سنگھ کو ہندوستان لے آئے۔ پھر یہاں رانا جسپال کی بیٹی کو بلائے۔ وہ اپنے شیطانی عمل کی تکمیل کے لئے ان دونوں کی قربانی دینا چاہتی تھی۔ کوئی ایسا ہی مسئلہ تھا جس میں اسے رانا جسپال کی بیٹی اور ہردیپ سنگھ کے خون کی بھینٹ دینا ضروری تھا۔

چنانچہ وہ اس منصوبے پر کام کرنا چاہتی تھی۔ لیکن کسی طرح ہردیپ سنگھ کو اس بات کا علم ہو گیا اور ہردیپ سنگھ نے ضرور کوئی ایسی بات کی جس سے رانی کو خطرہ ہو گیا کہ ہردیپ سنگھ

اس کا سارا کھیل بگاڑ دے گا۔ چنانچہ اس نے ہردیپ سنگھ کو قتل کر دیا۔ یہ ساری باتیں اس نے مجھے یہاں بتائیں۔ وہ اسی طرح کی عورت ہے۔ حالانکہ میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ مجھے تو اپنی ہی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے ایک آدمی مل گیا ہے جو ہردیپ سنگھ کی جگہ اس کا کردار ادا کرے گا۔ اور پھر وہ اپنے کام کی تکمیل کرے گی۔ میرے دوست! سنا ہے کہ وہ اس آدمی کو لے کر یہاں تک آ گئی ہے اور اب اس کے نام پر رانا جسپال کی بیٹی کو بلایا جائے گا اور وہ ان دونوں کی بلی دے دے گی۔ بعد میں وہ رانا جسپال سے بھی نمٹ لے گی ایسی ہی شاطر عورت ہے وہ۔ کیا سمجھے؟ وہ پراسرار عمل کر رہی ہے۔ یقین کرو وہ شیطان کا دوسرا روپ ہے۔ ایک جوڑے کی قربانی دے کر وہ مکمل شیطان بن جائے گی اور اپنا عمل کرے گی۔ وہ یہی کہتی ہے۔ اب یہ تو بھگوان ہی جانتا ہے کہ اصلیت کیا ہے اور کہاں تک اسے کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ لیکن بھگوان بچائے اس سے۔ اگر تم مجھے وہاں سے نکال نہ لاتے دوست تو وہ مجھے وہیں اسی جگہ مار دیتی۔ بس ایک ذرا سی بات میرے کام آ گئی۔'' وہ رُکا تو میں نے چونک کر پوچھا۔

''کون سی بات کام آ گئی؟''

''جب وہ مجھے اپنے اس کارنامے کے بارے میں بتا رہی تھی تو میں نے اس کا مذاق اڑا دیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ اس کا یہ شیطانی منصوبہ کبھی پورا نہیں ہوگا۔ اس بات پر وہ بگڑ گئی اور کہنے لگی کہ وہ مجھے اس وقت تک زندہ رکھے گی جب تک کہ اپنی آنکھوں سے اس کی طاقت کا کرشمہ نہ دیکھ لوں۔ اس طرح سے مجھے تھوڑی سی زندگی مل گئی تھی ورنہ اسے کیا پڑی تھی کہ مجھے زندہ رکھتی۔''

میں انتہائی خوف و دہشت کا سفر کر رہا تھا۔ یہ رانی سریتا جو شکل و صورت سے اتنی اچھی اور سلیقے کی نظر آتی ہے اندر سے اس قدر گھناؤنی اور خوفناک ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی میرے ذہن میں بے چاری روپالیہ کی تصویر بھی گھوم گئی۔ رانا جسپال ایک شریف آدمی تھا۔ اس نے بڑے پُر محبت انداز میں اپنی بیٹی کو اس کا سسرال دے دیا تھا لیکن اس کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو جہاں بھیجنا چاہتا ہے وہ اس کا سسرال نہیں بلکہ ایک جہنم ہے۔ ایک ہولناک جہنم۔ میں نے ایک بار پھر ستنام سنگھ سے سوال کیا۔

''اور اس کا دست راست پرلوک ناتھ ہے؟''

''ہاں، وہ اس کا دست راست ہی ہے۔ بس کیا کہا جائے اور کیا نہ کہا جائے۔''

''ستنام سنگھ! تم یقین کرو میرے دوست، میں نے یہ سوچا تھا کہ تمہارے ساتھ یہاں سے کہیں دور نکل جاؤں گا۔ رانی پر لعنت بھیج دوں گا۔ لیکن تم نے جو کہانی مجھے سنائی ہے اس کے بعد تو مجھ پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہو گئی ہیں۔''

میرے ان الفاظ پر وہ مجھے چونک کر دیکھنے لگا پھر بولا۔ ''بھائی، میں کچھ سمجھا نہیں؟''

''میرا نام خاقان جمشیدی ہے۔ میں مسلمان ہوں اور وہ آدمی ہوں جسے سریتا دیوی نے ہردیپ سنگھ بنا دیا ہے۔ مجھے وہ لندن سے اپنے ساتھ لائی ہے اور میرے ہی ساتھ اس نے رانا جسپال کی بیٹی کی سگائی کی ہے۔''

میں نے دیکھا کہ ستنام سنگھ کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا ہے۔ وہ سکتے کے سے عالم میں میری صورت دیکھتا رہا اور پھر خوفزدہ لہجے میں بولا۔

''نہیں نہیں نہیں، تم تو میرے محسن ہو۔ تم تو بہت اچھے انسان ہو۔ تمہارے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہونا چاہئے۔ نہیں، یہ سب کچھ تمہارے ساتھ نہیں ہونا چاہئے۔ یہ تو غلط ہے۔'' وہ عجیب سے انداز میں دونوں ہاتھ ہلا رہا تھا۔ پھر وہ ہیجانی سی کیفیت میں بولا۔ ''وہ شیطانی علوم سیکھ رہی ہے اور اس کے لئے نجانے کیا کیا کرتی رہی ہے۔ اسے ایک جوڑے کی قربانی دینی ہے جس کا اس نے کالے علم کے دیوی دیوتاؤں سے وعدہ کر رکھا ہے اور اس کے لئے اس نے پوری منصوبہ بندی کی ہے۔ رانا جسپال کی بیٹی اور ہردیپ سنگھ جسے اس نے اپنی بات نہ ماننے پر ہلاک کر دیا، اس کا شکار تھے۔ لیکن اب اس نے تمہیں اپنا نشانہ بنایا ہے۔ بچ جاؤ میرے بھائی۔ اگر ہو سکے تو بچا لو اپنے آپ کو۔ ورنہ وہ شیطان زادی تمہیں موت کے گھاٹ اتار دے گی۔ پورا منصوبہ ہے اس کے پاس۔ وہ تم دونوں کی قربانی دے گی۔ ابھی کچھ دن کے بعد وہ رانا جسپال کی بیٹی کو تمہارے ذریعے یہاں بلائے گی اور اس کے بعد وہ اپنا یہ کام مکمل کر لے گی۔''

''ہاں، جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے وہ واقعی بہت خطرناک ہے اور اب مجھے یقین بھی ہو رہا ہے کہ وہ ایسا کرے گی۔ اور میرے دوست، ان تمام باتوں کو جاننے کے بعد میری واپسی ضروری ہے۔ مجھے واپس رانی کے محل میں پہنچنا چاہئے۔ راتوں رات، ابھی اور اسی وقت۔ حالانکہ ہم اچھا خاصا فاصلہ طے کر چکے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر میں تیز رفتاری سے واپسی کا سفر طے کروں تو صبح کی روشنی ہونے سے پہلے واپس چلا جاؤں گا۔''

''اور میں؟''

"دیکھو، تم بابا سیا رام کے ساتھ کویا پہنچ جاؤ اور وہاں ایک لمحہ رکے بغیر کسی اور ذریعے سے آگے بڑھ جاؤ۔ تمہیں دہلی پہنچ جانا چاہئے۔ بولو، تم یہ کر سکو گے؟"

"اب کر سکتا ہوں۔ پہلے تو میرے اندر بالکل ہی ہمت نہیں تھی۔ لیکن......"

"بہر حال اپنی زندگی بچانے کی ذمہ داری اب تمہاری ہے۔ اگر زندہ رہا تو دہلی میں تم سے ملاقات کروں گا۔"

"میرا پتہ ذہن میں محفوظ کر لو، مجھے ضرور ملنا۔" ستنام سنگھ نے کہا۔

"ضرور ملوں گا تمہیں۔ سمجھے؟" میں نے کہا اور پھر بابا سیا رام سے کہا۔ "بابا جی! کاش آپ کو اس محبت اور تعاون کا صلہ دے سکتا۔ میں دعاؤں کے علاوہ اور کچھ نہیں دے سکتا۔ ذرا گاڑی روک دیں، مجھے واپس جانا ہے۔"

سیا رام بیچارے نے گاڑی روک دی۔ ستنام سنگھ کا پتہ نوٹ کر کے میں نیچے اتر گیا تھا اور اس کے بعد میں نے برق رفتاری سے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ بیل گاڑی میں لگی ہوئی لالٹین کی روشنی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی اور میں برق رفتاری سے راستے طے کرتا ہوا ان حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ کہانی بے شک نئی تھی لیکن میں یہ جانتا تھا کہ مجھے اس داستان سے گزرنا تھا۔ داستان میری زندگی کا ایک حصہ تھی۔ جب انسان کی زندگی میں وہی کچھ ہوتا ہے جو اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔ ساری باتیں اپنی جگہ لیکن تقدیر سے تو اب منہ موڑا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ جگہ جگہ میری تقدیر نے مجھے راستوں کا تعین کر کے دیا تھا اور میری کوئی تدبیر میرے کام نہیں آئی تھی۔ میں تقدیر ہی کے ساتھ ساتھ سفر کر کے یہاں تک پہنچا تھا۔ جہاں تک روپالیہ کا معاملہ تھا تو بیچاری کی زندگی بچانا میرا فرض تھا۔ رانی تو واقعی شیطان ہے۔ شیطان کیسے کیسے چہروں میں نمودار ہوتا ہے یہ بڑا تعجب خیز انکشاف تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری سوچوں نے میرے راستے مختصر کر دیئے ہوں۔ صبح کی مدھم مدھم روشنی فضاؤں میں اترنے لگی تھی کہ میں نے اپنے آپ کو چندی گڑھ میں رانی کی حویلی کے قریب پایا۔

پھر اس کے بعد میں نے وہی راستہ اختیار کیا جہاں سے نکل کر باہر گیا تھا۔ اور جب میں اپنی خوابگاہ میں پہنچا تو میرا بدن تھکن سے چور تھا۔ لیکن سوچوں کے دائرے پھیل رہے تھے، سکڑ رہے تھے۔ وہ پراسرار وجود کس کا تھا جس نے مجھے ستنام سنگھ کے راستے پر لگایا تھا؟

☆

دوسرے دن بہت دیر تک سوتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ رانی سریتا دیوی خود ہی میرے پاس آئی اور اس نے مجھے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جگایا۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ رانی کا چہرہ دیکھ کر میں اچھل پڑا تھا۔

"ارے ارے آپ...... آپ......"

"نہ...... نہ...... نہ، گھبرا کیوں رہے ہو، کیا بات ہے؟ طبیعت کیسی ہے؟"

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔ خیریت، آپ میرے لئے پریشان کیوں ہو گئیں؟"

"اتنی دیر سوتے جو نہیں ہو۔" رانی نے گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور میری نگاہیں گھڑی کی جانب اٹھ گئیں۔

"ارے باپ رے، یہ کیا ہوا؟"

"کیوں، مجھے بتاؤ؟"

"نہیں، واقعی میں اتنی دیر کب سوتا ہوں؟"

"اسی لئے تو مجھے تشویش ہوئی۔ جب ناشتے پر نہیں پہنچے تو میں نے باندیوں سے پوچھا کہ کہاں ہیں ہمارے ہردیپ کمار جی۔ انہوں نے بتایا کہ سو رہے ہیں۔"

"ہاں، رات کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ اور جب نیند آئی تو سپنوں نے گھیر لیا۔"

"ہاں، یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ واقعی یہ عمر سپنے دیکھنے کی ہی ہوتی ہے۔ اور پھر سپنوں میں اگر کسی حسین ساتھی کا تصور ہو تو پھر تو یہ سپنے امر ہو جاتے ہیں۔"

میں مدھم سا مسکرا دیا۔ رانی میری صورت دیکھتی رہی، پھر بولی۔ "بلا لوں روپالیہ کو؟"

اس کے انداز میں کوئی اہم بات نہیں تھی لیکن میں جانتا تھا کہ یہ بات کتنی اہم ہے۔

"نہیں آنٹی! اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔"

"ہے نا، میں جانتی ہوں۔ مجھ سے چھپا رہے ہو؟"

"لیجئے، آپ سے بھلا کوئی بات چھپا سکتا ہوں؟"

"بتاؤ، اپنی آنٹی سے جو مانگو گے مل جائے گا۔ کیا سمجھے؟"

"وہ تو میں جانتا ہوں۔"

"اگر جانتے ہو تو پھر گریز کیوں کر رہے ہو؟ بلاتی ہوں تمہاری روپالیہ کو کچھ دن کے لئے۔ ابھی تو شادی میں خاصا وقت لگ جائے گا۔ اگر تم اسی طرح سپنوں میں کھوئے رہے تو کام کے آدمی نہیں رہو گے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور رانی کو دیکھنے لگا۔

"چلو منہ ہاتھ دھو لو، ناشتے کے کمرے میں آ جاؤ۔ باقی باتیں وہیں کریں گے۔" رانی کا موڈ بہت اچھا نظر آ رہا تھا جس سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ابھی اسے ستنام سنگھ کے فرار کی خبر نہیں ملی ہے۔ ظاہری بات ہے یہ خبر اس کے لئے بڑی خطرناک ہو گی اور پھر اس کا موڈ اچھا نہیں رہے گا۔

وہ کمرے سے باہر نکل گئی تو میں اٹھ کر غسل خانے کی جانب چل پڑا۔

ستنام سنگھ ذہن میں آ رہا تھا۔ روپالیہ سے تو سچی بات ہے اب بھی مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ حالانکہ اچھی شخصیت کی مالک تھی۔ چاہا جا سکتا تھا اسے اور کچھ نہیں تو کم از کم ماضی کی روشنی میں۔ جس طرح ایلس فیوری، امینہ اور دوسری خواتین میری زندگی میں شامل ہو گئی تھیں۔ روپالیہ تو ان میں ایک الگ اور نمایاں مقام رکھتی تھی۔ حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ میں اب ان برائیوں سے بچنے کی کوششوں میں مصروف تھا اور بات یہی ذہن میں تھی کہ جس طرح بھی بن پڑے اپنا کوئی مناسب مقام تلاش کروں۔ ان ساری باتوں میں کچھ بھی نہیں رکھا۔

نجانے کتنی دیر تک یہ تمام باتیں سوچتا رہا۔ پھر ایک دم سے خیال آیا کہ رانی انتظار کر رہی ہو گی۔ چنانچہ میں پھرتی سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ناشتے کے کمرے میں رانی کے سامنے موجود تھا۔ رانی نے میرا مسکراتے ہوئے خیر مقدم کیا۔ اس کے چہرے پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ کہنے لگی۔ "اچھا اب یہ تو طے ہے کہ تم میرے دوست بھی ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ روپالیہ کس حد تک یاد آ رہی ہے؟"

"اگر میں آپ سے ایک سوال کروں آنٹی! تو کیا آپ مجھے جواب دیں گی اس کا؟"

"کیوں نہیں دوں گی بھئی۔"

"آپ نے لندن میں مجھ سے ایک بات کہی تھی۔"

"بہت سی باتیں کہی تھیں میں نے لندن میں تم سے۔ کس بات کا تذکرہ کر رہے ہو؟"

"آپ نے کہا تھا کہ یہ سب کچھ عارضی ہے۔ یعنی مجھے ہردیپ سنگھ کا کردار عارضی طور پر ادا کرنا پڑے گا۔"

رانی چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ کچھ دیر تک اس کی آنکھیں خاموشی سے میرا جائزہ لیتی رہی تھیں۔ اب اس کے چہرے کی وہ مسکراہٹ ختم ہو گئی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"اب میں بھی تم سے ایک سوال کروں؟"

"ضرور کیجئے۔"

"تم خود کیا چاہتے ہو؟"

"میں سمجھا نہیں؟"

"میرا مطلب ہے تم خود کیا چاہتے ہو؟"

"میں نے کہا نا بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کیا تم ہردیپ سنگھ بنے رہنا چاہتے ہو؟"

"میرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو کچھ میں نہیں ہوں وہ تو ایک سچائی ہے۔"

"ہاں، بعض اوقات سچائی، سچائی نہیں رہتی۔ بلکہ جھوٹ کی طاقت زیادہ طاقتور ہو جاتی ہے۔ ویسے تمہارا جھوٹ کی طاقت کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"کبھی تجربہ نہیں کیا میں نے۔" میں نے گول مول سا جواب دیا۔ میں جانتا تھا بلکہ ستنام سنگھ مجھے بتا چکا تھا کہ رانی گناہوں کی پجاری ہے اور جو گناہوں کے پجاری ہوتے ہیں ان کی نگاہوں میں سچ بنیاد نہیں ہوتا بلکہ ان کی بنیاد جھوٹ ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر رانی سے میں اپنی سچائیوں کا اظہار کر دوں تو بنا بگڑ سکتی تھی۔ وہ کچھ لمحے میری صورت دیکھتی رہی، پھر بولی۔

"دیکھو ہردیپ سنگھ! خاقان جمشیدی تو میں اب تمہیں کہہ ہی نہیں سکتی۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ یہ دنیا بہت مختصر سی جگہ ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ہر انسان مر جاتا ہے، ہر انسان جتنی بھی زندگی وہ اس سنسار میں گزارتا ہے بس نجانے کیسے کیسے خیالات میں گزار لیتا ہے اور آخر کار اسے احساس ہوتا ہے کہ زندگی کے ساتھ اس نے وہ انصاف نہیں کیا جو اسے کرنا چاہئے تھا۔ اس نے زندگی کے وہ مزے نہیں لوٹے جو اسے لوٹنے چاہئے تھے۔ تم ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہو، نجانے کیسے کیسے افکار و خیالات تمہارے

دل میں ہوں گے۔ نجانے کس کس طرح تمہارے دین دھرم میں تمہیں سکھایا پڑھایا گیا ہو گا۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ آخر کار تم مر جاؤ گے خاقان جمشیدی! زندگی کی ان مختصر سی سانسوں سے کیوں نہ پورا پورا فائدہ اٹھاؤ۔ طاقتور بنو، طاقت حاصل کرو اور اس کے بعد جیسے بھی چاہو زندگی گزارو۔"

"ایک بات کہوں آپ سے آنٹی؟"

"ہاں کہو، آج دل کھول کر ساری باتیں کرو۔"

"آنٹی، آپ نے کبھی مجھ سے میرے بارے میں تفصیل نہیں پوچھی؟"

رانی سریتا دیوی کے چہرے سے یوں لگا جیسے واقعی اسے اس بات پر حیرت ہوئی ہو۔ وہ عجیب سے انداز میں میرا چہرہ دیکھتی رہی پھر بے اختیار مسکرا دی۔

"ہاں واقعی، پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا۔ اصل میں، میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ کچھ لوگ اپنی تفسیر آپ ہوتے ہیں، کھلی کتاب کی مانند، اپنے بارے میں سوچنے ہی نہیں دیتے، بس آنکھوں کے راستے دل میں اتر جاتے ہیں۔ تم بھی انہی میں سے ایک ہو۔ معمولی بات نہیں ہے کہ میں نے اپنے مقصد کے لئے تمہارا انتخاب کیا۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ تم خود اپنی سفارش بن گئے تھے۔ اور پھر ایک عارضی کام کی تکمیل میں نے اس طرح کی کہ تمہارے کردار کو مستقل کر دیا۔ اب اگر کبھی تقدیر کا مارا ہردیپ آ بھی جائے تو میں اسے ہردیپ تسلیم نہیں کروں گی۔ اور یہ بات تو تم بھی اچھی طرح جان چکے ہو کہ اگر میں اسے ہردیپ تسلیم نہ کروں تو پھر دنیا کا کوئی شخص بھی اسے ہردیپ ثابت نہیں کر سکتا۔ کم از کم اتنی قوت رکھتی ہوں میں اپنے اندر۔"

میں دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔ میں نے سوچا کہ آنٹی! ہردیپ اب واپس کہاں سے آئے گا؟ وہ کہنے لگی۔

"پھر بھی خاقان! تم اگر چاہو تو مجھے اپنے بارے میں بتا دو۔"

"کوئی خاص تفصیل نہیں ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ ہندوستان میرے لئے ایک قید خانہ ہے اور اگر مجھے میری اصل شخصیت سے جان لیا جائے تو برٹش حکومت مجھے چھوڑے گی نہیں۔"

"اور میں نے تم سے یہ کہا تھا کہ دنیا کی کوئی قوت تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔"

"ہاں، آپ نے یہ کہا تھا۔"

"تم ملک سے باہر کس طرح نکلے تھے؟"

"بس یوں سمجھئے پولیس میرے پیچھے تھی۔ اصل میں میرا ایک بدترین دشمن ہے جس نے مجھے ان راستوں کا راہی بنا دیا ہے۔ میں اس کے پیچھے باہر نکل گیا تھا اور نجانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہوا لندن تک پہنچا تھا۔"

"تب تو مجھے تمہارے اس دشمن کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اس نے تمہیں مجھ تک پہنچایا۔" رانی نے اس طرح بات ٹال دی جیسے اسے میری شخصیت سے کوئی دلچسپی نہیں ہو۔ وہ میرے ماضی کے بارے میں بہت زیادہ جاننا بھی نہ چاہتی ہو۔ شاید اس کی وجہ پہلے میری سمجھ میں نہ آتی لیکن اب سب کچھ سمجھ گیا تھا میں۔ اس نوجوان نے مجھے ساری تفصیل بتا دی تھی اور مجھے پتہ چل گیا تھا کہ رانی کیا چیز ہے۔

بہر حال انتہائی خطرناک عورت تھی یہ۔ ستنام سنگھ کے بارے میں ابھی اسے پتہ نہیں چلا تھا ورنہ یقیناً اس کے اندر پریشانی کی جھلکیاں ہوتیں۔ بہت دیر تک وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی، کوئی اہم اور خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اس نے مسکراتے ہوئے اتنا ضرور کہا تھا۔ "میں تمہارے خوابوں کو اس طرح تشنہ نہیں چھوڑوں گی۔ آؤ، رانا جسپال سے بات کرتے ہیں۔"

"رانی صاحبہ، آپ......"

"کیا رانی رانی لگا رکھی ہے۔ ایک دم پٹری سے اتر جاتے ہو۔"

"معافی چاہتا ہوں۔"

"آؤ......" اور اس کے بعد وہ ٹیلی فون تک پہنچ گئی۔ میرے سامنے اس نے ٹیلی فون کے نمبر ملائے اور بولی۔

"رانا جسپال سے بات کراؤ، ہندوستان سے سریتا دیوی بول رہی ہوں۔"

کچھ لمحوں کے بعد رانا جسپال لائن پر پہنچ گیا۔ سریتا نے کہا۔ "رانا صاحب، سریتا۔ جی ئی...... ہاں جی، بالکل ٹھیک ہوں۔ ہردیپ بھی ٹھیک ہے...... لیکن بس...... نام کے ٹھیک ...... ارے نہیں نہیں گھبرانے کی بات نہیں ہے...... اصل میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں خاص طور سے جب ایک دوسرے سے منسلک ہو جاتے ہیں تو بڑے جذباتی ہو جاتے ہیں۔ اب یہ ہردیپ سنگھ جی ہیں، راتوں کو کم سونے لگے ہیں۔ ہر وقت یاد کرتے رہتے ہیں روپالیہ کو۔" رانی نے ایک قہقہہ لگایا اور بولی۔

''ہاں وہ بھی تو انسان ہے۔ وہ بھی یاد کرتی ہے؟...... اچھا اچھا...... سونا بیٹھنا چھوڑ دیا ہے؟ بھئی کمال ہے...... ہاں ہاں...... نہیں، حل تو ہر چیز کا ہوتا ہے رانا صاحب! آپ ایک کام کریں، روپالیہ کو تھوڑے دنوں کے لئے یہاں ہندوستان بھیج دیں چندی گڑھ میرے پاس...... آنٹی ہوں اس کی۔ اور پھر آنا تو اسے یہیں ہے نا...... آپ تو بڑے دل کے مالک ہیں۔ اوہو، اچھا آ جائیے، آ جائیے آپ بھی۔ ذرا تبدیلی آب و ہوا ہو جائے گی...... ہاں ہاں...... میں نے اسی لئے فون کیا تھا آپ کو...... اچھا ٹھیک...... کب پہنچ رہے ہیں؟ ہاں بھئی، آپ کے لئے کیا مشکل ہے...... ظاہری سی بات ہے لندن سے ہندوستان کا فاصلہ ہی کتنا ہے...... بڑی خوشی کی خبر سنائی ہے آپ نے رانا صاحب۔ آ جائیے، آ جائیے۔ یہ چھوٹی سی جھونپڑی آپ کے لئے ہر وقت کھلی ہوئی ہے۔'' رانی پھر ہنسی اور بولی۔

''تو پھر میں انتظار کروں گی آپ کا...... جی سر جی! ہم آپ کو لینے دہلی پہنچیں گے...... ایسی کیا بات ہے...... جی بالکل، بالکل...... اوکے۔'' رانی نے فون بند کر دیا پھر مسکرا کر مجھے دیکھتی ہوئی بولی۔

''ایک ہفتے کے اندر اندر رانا صاحب آ رہے ہیں۔''

میں ایک سنسنی سی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ رانی کہنے لگی۔

''میں نے تو کہا تھا کہ وہ صرف روپالیہ کو بھیج دیں۔ لیکن وہ خود بھی آ رہے ہیں۔ آنے دو، کیا فرق پڑتا ہے۔ اوکے۔''

اسی وقت ایک ملازم اندر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ ''پیتم سنگھ آپ سے ملنا چاہتے ہیں مہارانی جی!''

''کہاں ہے پیتم؟''

''باہر موجود ہیں۔''

''میں آ رہی ہوں۔'' رانی نے کہا اور اس کے بعد بولی۔ ''آرام کرو پرنس! اور خوش ہو جاؤ کہ تمہاری پریمیکا آ رہی ہے۔ خوب سیر و سیاحت کرنا چندی گڑھ کی۔ اب تو تم نے چندی گڑھ دیکھ لیا ہے۔''

''جی۔'' میں نے کہا اور رانی باہر نکل گئی۔

میں دیر تک وہیں بیٹھا سوچوں میں ڈوبا رہا تھا۔ تو رانا جسپال اور روپالیہ آ رہے ہیں۔

گویا رانی کی دوسری کوشش کارگر ہو رہی ہے۔

بہر حال مجھے اپنا کردار بھی دیکھنا تھا ان تمام معاملات میں۔ میں نجانے کب تک سوچوں میں ڈوبا رہا تھا اور میری عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی۔ رانی گئی تو گھنٹوں واپس نہ آئی۔ البتہ شام ڈھلے وہ پہنچی تھی۔ میں نے ایک نگاہ میں محسوس کر لیا کہ اس کے چہرے پر پریشانی ہے۔ میں اس کی تاک میں لگ گیا۔ ایک ایسی جگہ دیکھ لی تھی میں نے جہاں سے میں رانی کی اس خواب گاہ میں جھانک بھی سکتا تھا اور وہاں کی باتیں بھی سن سکتا تھا۔ خوابگاہ کے دوسرے سرے پر ایک پتلی گلی تھی، اس پتلی گلی کو بہت کم استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن یہاں ایک کھڑکی تھی جہاں سے رانی کی خوابگاہ میں جھانکا جا سکتا تھا اور وہاں کی باتیں بھی سنی جا سکتی تھیں۔ اس وقت میرے ذہن میں شدید تجسس پیدا ہو گیا۔ چنانچہ میں اپنے آپ کو اس کھڑکی تک لے جانے سے نہ روک سکا اور میں نے کھڑکی سے کان لگا دیئے۔ رانی فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔

''کتے کے بچے! اگر وہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو میں تم سب کو زندہ جلا دوں گی۔ بات وہی ہوتی ہے، اگر سختی نہ کی جائے تو کوئی کچھ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ میں کہتی ہوں کہاں مر گئے تھے تم لوگ؟ کون تھا جس نے باہر سے دروازہ کھولا تھا؟ تم سو گئے ہو گے گہری نیند۔ کوئی آیا اور دروازہ کھول کر اسے لے گیا۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں تمہی میں سے کسی نے اس سے ساز باز کی ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو، مجھے پتہ نہیں چلے گا؟ فنا کر دوں گی میں تمہیں۔ تلاش کرو کتو، اُس کو تلاش کرو۔ اسے زندہ نہیں بچنا چاہئے ورنہ وہ ہمارے لئے موت کا پھندہ بن جائے گا۔ سمجھے؟ بس میں اب تمہارے منہ سے یہی سننا چاہتی ہوں کہ تم نے اسے پکڑ لیا ہے۔ نہیں...... زندہ...... زندہ بالکل۔ تمہاری کسی بات پر میں بھروسہ نہیں کروں گی۔ اب سمجھ گئے؟'' رانی نے ٹیلی فون دھاڑ سے کریڈل پر مار دیا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ گویا رانی کو اب پتہ چلا ہے کہ ستنام اس کے قبضے سے نکل گیا ہے۔

بہر حال وہ بیچارہ مجھے جو کچھ بتا کر چلا گیا تھا اس سے استفادہ کرنا تھا، باقی اور کوئی بات نہیں تھی۔ غرض یہ کہ میں وہاں سے چلا آیا۔ لیکن رانی کی مصروفیات کے بارے میں میرے اندر ایک تجسس پیدا ہو گیا تھا اور یہ جگہ بڑی اچھی دستیاب ہوئی تھی مجھے۔ میں اب رانا جسپال کی آمد کا انتظار کر رہا تھا اور میرے ذہن میں منصوبہ بندی ہو رہی تھی۔ رانا

جسپال کو ساری حقیقتیں بتانا ضروری تھا اور اس بیچارے کو اس مصیبت سے نکالنا بھی ایک اہم مسئلہ تھا۔

بہرحال کوئی تیسرے دن کی بات ہے، رانی کو شاید ابھی تک کوئی تسلی بخش اطلاع نہیں ملی تھی۔ ظاہر ہے ستنام سنگھ ایک مرتبہ اس کے ہاتھ سے نکلنے کے بعد اس کے قبضے میں نہیں آ سکتا تھا۔ رانی کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔

اور پھر ایک اور خوفناک واقعہ ہو گیا۔ رانی اپنی گاڑی میں کہیں گئی تھی۔ ایک گاڑی میں وہ تھی اور دو اس کے ساتھ تھیں۔ میں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا، پھر آتے ہوئے بھی دیکھا۔ تین گھنٹے کے بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ کچھ مہمان آئے تھے اس کے ساتھ۔ یہ چار افراد تھے۔ میں نے بہت دور سے دیکھا، وہ گاڑی سے اترے تھے۔ دو چہرے تو اجنبی تھے لیکن باقی دو چہرے دیکھ کر میرے سارے وجود پر لرزشیں طاری ہو گئی تھیں۔ یہ خوف کی لرزشیں نہیں تھیں بلکہ میرے اندر شدید جوش بھر گیا تھا۔ ان میں سے ایک ہیگ تھا، دوسرا ہشمان ذکری...... باقی بھی دو مصری نسل کے لگتے تھے۔ ہو سکتا ہے ان کے باڈی گارڈ ہوں یا ہو سکتا ہے ساتھی ہی ہوں۔

ہیگ اور یہاں؟...... اور ہشمان ذکری بھی یہاں موجود ہے...... کیا قصہ ہے یہ؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ لیکن ان لوگوں کو دیکھ کر میری جو کیفیت ہوئی تھی میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ان لوگوں کو معزز مہمانوں کی طرح حویلی میں لایا گیا تھا اور رانی سریتا دیوی ان کی بڑی خاطر مدارات کر رہی تھی۔ لیکن میرے اندر اب پارہ بھر گیا تھا۔ ہیگ میری زندگی کا سب سے خوفناک دشمن جس نے میری زندگی کا رخ ہی بدل دیا تھا، جس کی وجہ سے ایسے نقصانات اٹھانا پڑے تھے جن کا ازالہ اس زندگی میں تو ممکن نہیں تھا، وہ ہیگ ایک بار پھر میری رینج میں آ گیا تھا لیکن اب اسے میرے ہاتھ سے بچنا نہیں چاہئے۔ اب بھی اگر وہ میرے ہاتھ سے نکل گیا تو پھر زندگی بھر میں اس کا پتہ نہیں پا سکوں گا۔ تقدیر مجھے بار بار موقع دے رہی تھی۔ آہ...... تقدیر مجھے بار بار موقع دے رہی تھی مجھے کچھ کر لینا چاہئے۔ کچھ کر لینا چاہئے مجھے۔ ہیگ کے رانی سریتا سے کیا تعلقات تھے؟ مجھے اس کا علم نہیں تھا۔

اور اس کے بعد میں اپنی رہائش گاہ پر آ گیا۔ بدن اس طرح ٹوٹ رہا تھا جیسے ملیریا ہو جاتا ہے۔ پورے وجود میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔ ہیگ کچھ فاصلے پر موجود ہے اور یہ

بات طے ہے کہ رانی سریتا نے مجھے جو روپ دے رکھا ہے اس میں وہ میری ملاقات ہیگ سے ضرور کرائے گی اور ہیگ مجھے پہچان جائے گا۔ کیا کرنا چاہئے مجھے؟ کیا کرنا چاہئے؟

بہت دیر تک میں سوچتا رہا لیکن کوئی ترکیب ذہن میں نہیں آ سکی تھی۔ ایک بار پھر باہر نکل گیا اور یہ جائزہ لینے لگا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ میں بہت سی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہیگ اور ہشمان ذکری کی ہر طرح سے خاطر مدارت کی جا رہی تھی لیکن ابھی تک رانی نے مجھے طلب نہیں کیا تھا۔ مگر میں منتظر تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں واپس اپنی رہائش گاہ میں پہنچا اور پھر کافی عرصے کے بعد، بہت عرصے کے بعد میرے دماغ میں ایک خوشبو چکرائی...... چمپا کے پھولوں کی خوشبو......!

وہ پراسرار خوشبو جو بھوج پتر سے آتی تھی۔ میری نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ یہ کچھ پراسرار قوتیں میرے وجود سے چمٹی ہوئی ہیں۔ مجھے بدنصیبی سے ان سے منسلک ہونا پڑا ہے۔ میری نگاہیں بھٹکتی رہیں اور پھر میں بھوج پتر کو تلاش کرتا ہوا ایک الماری تک پہنچا لیکن بھوج پتر کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ البتہ الماری میں ایک ریوالور رکھا ہوا تھا۔ میں پورے دعوے سے کہتا ہوں کہ اس سے پہلے میں نے یہ ریوالور نہیں دیکھا تھا۔ ریوالور لوڈ تھا۔ میں اسے دیکھتا رہا اور دفعتہً ہی میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال سرایت کر گیا...... یہ ریوالور میرے ہی لئے ہے اور اس وقت واقعی مجھے اس کی ضرورت ہے۔ ایک سیدھا سادھا سا کام کیا جائے اور وہ کام یہ ہے کہ ہیگ کو دیکھتے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ بس اب کوئی رسک لینا مناسب نہیں ہے۔ میں یہی کروں گا۔ مجھے یہی کرنا چاہئے۔ اور میں نے ریوالور اٹھا کر اپنے لباس میں پوشیدہ کر لیا۔

ایک عجیب سا سکون ملا تھا مجھے۔ ایک گہرا سکون دل و دماغ پر طاری ہو گیا تھا۔ آہ...... واقعی زندگی کی سب سے خوشگوار گھڑی آ رہی ہے یعنی ہیگ کی موت! اور وہ بھی میرے ہاتھوں۔ رانی اگر اس کے بعد میرے خلاف کوئی عمل کرتی ہے تو بھی دیکھا جائے گا۔ حالانکہ اصولی طور پر اس وقت اسے میری ضرورت تھی۔ کم از کم اس وقت تک کے لئے جب تک کہ وہ ستنام سنگھ کے بیان کے مطابق قربانی کی رسم پوری نہیں کر لیتی۔ اگر میں نے ہیگ کو ہلاک کر بھی دیا تو وہ میرا بچاؤ کرے گی۔ کیونکہ اسے میری ضرورت ہے، وہ قربانی کی رسم پوری کئے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ یہ بھی فیصلہ کیا میں نے کہ خالی ہیگ ہی سے کام نہیں چلے گا، ہشمان ذکری اور اگر وہ دونوں افراد ہوئے تو انہیں بھی ہلاک کر دیا

جائے۔ یہ بہت ضروری تھا۔

پھر وہ وقت آ گیا جب مجھے اپنا کام سرانجام دینا تھا۔ رانی نے مجھے ڈنر کے لئے طلب کیا تھا اور میں اس کے لئے تیار ہو کر چل پڑا۔ ریوالور میرے لباس میں پوشیدہ تھا۔ جب میں ڈنر روم میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہاں رانی سریتا دیوی کے علاوہ صرف ہشمان ذکری اور ہیگ موجود تھے۔ ملازم کھانا سرو کر چکے تھے، غالباً میرا ہی انتظار کیا جا رہا تھا۔ لباس وغیرہ تبدیل کرنے میں مجھے دیر ہو گئی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو ہیگ اور ہشمان ذکری نے مجھے مسکرا کر دیکھا لیکن اس کے بعد فوراً ہی ان کے چہرے آگ کی طرح سرخ ہو گئے۔ دونوں ہی مضطربانہ انداز میں کرسیاں کھسکا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ رانی ان سے تھوڑے فاصلے پر تھی۔ ان دونوں کی آنکھیں شیشے کی گولیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

"یہ...... یہ...... یہ کون ہے؟" ہیگ نے میری طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آپ جانتے ہیں انہیں؟ یہ پرنس ہردیپ سنگھ ہیں۔" رانی نے متجسس نگاہوں سے ہیگ اور ہشمان ذکری کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ یہ بدبخت آپ تک پہنچ گیا؟ یہ پرنس نہیں ہے، اس کا نام خاقان جمشیدی ہے۔ بہت بڑا شاطر، بہت ہی خطرناک آدمی۔ آپ اسے ہردیپ سنگھ کہہ رہی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے کوئی لمبا چکر چلا کر آپ تک رسائی حاصل کر لی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں مسٹر ہیگ! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"اوہ...... اس سے بچنے کی کوشش کیجئے۔ اسے ہمارے حوالے کر دیجئے۔ یہ ہمارا شکار ہے۔ آپ نہیں جانتیں رانی صاحبہ! اس کی ذات سے ایک بہت بڑی کہانی وابستہ ہے۔ میں آپ کو مختصر الفاظ میں بتاتا ہوں۔ ایک ایسے عظیم الشان خزانے کا راز جانتا ہے یہ جو اگر اس دنیا میں کسی کو حاصل ہو جائے تو آپ یوں سمجھ لیجئے کہ وہ دنیا کا بادشاہ بن سکتا ہے۔ اتنی دولت حاصل کر سکتا ہے وہ کہ انسانی تصور میں بھی نہ آئے۔"

سریتا دیوی نے میرا چہرہ دیکھا، میں مسکرا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "آنٹی! وہ کہانی پوچھئے اس بدمعاش سے۔ میں نے آپ کو اپنے ایک دشمن کے بارے میں بتایا تھا جس کے پیچھے لگ کر میں پہلے اسکندریہ پھر نجانے کہاں کہاں اور آخر میں لندن پہنچا تھا۔ آنٹی!

یہی وہ دشمن ہے میرا جس کی موت میری زندگی کا سب سے پہلا مقصد ہے۔ آنٹی! ذرا پوچھئے تو سہی اس سے وہ کہانی اور اس خزانے کے بارے میں جس کا یہ تذکرہ کرتا ہے۔ یہ جاہل آدمی، یہ پاگل دیوانہ اسی غلط فہمی کا شکار ہے کہ میں ایسے کسی خزانے کے بارے میں جانتا ہوں۔"

"غلط فہمی نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی لوح کی کہانی ہے جو......"

"ہیگ! میں معذرت چاہتا ہوں۔ تیرے اور میرے درمیان بہت سے قصے آئے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میری دلی آرزو یہ ہے کہ میں تجھے اس دنیا سے روانہ کر دوں۔ کیا آپ یہ جانتی ہیں آنٹی! کہ یہ حرام زادہ ہپناٹزم کا ماہر ہے۔ یہ لوگوں کو اپنے ٹرانس میں لے لیتا ہے اور اس نے مجھے بھی اپنے ٹرانس میں لے کر میری زندگی کو میرے لئے ایک زخم بنا دیا تھا۔ میں نے آپ کو یہ بھی بتایا تھا آنٹی! کہ اس نے ایک انگریز افسر کو میرے ہاتھوں سے ختم کرا دیا اور اس کے بعد مجھے ہندوستان چھوڑنا پڑا، اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔ یہ ساری باتیں میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ جس خزانے کا یہ تذکرہ کرتا ہے وہ اس کی جہالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اگر مجھے ایسے کسی خزانے کا راز پتہ ہوتا تو آپ کا کیا خیال ہے میں یوں وقت ضائع کرتا پھرتا؟ آنٹی! یہ آپ کے مہمان ہیں، لیکن یوں سمجھ لیجئے کہ میری زندگی کا اولین مقصد ان کی موت ہے۔ معافی چاہتا ہوں آنٹی! اگر اس سے آپ کا کوئی پروگرام متاثر ہوتا ہے یا آپ کو اس کی وجہ سے کوئی پریشانی اٹھانا پڑتی ہے تو میں زندگی بھر اس پر افسردہ اور شرمندہ رہوں گا۔ لیکن ان کی موت......"

"بکواس مت کر کتے! تیرے اندر یہ سکت، یہ ہمت نہیں ہے۔"

لیکن میرے لئے اب اس کے علاوہ چارہ کار نہیں تھا کہ اپنا کام جتنی جلدی نمٹا لوں وہی میرے لئے بہتر ہے۔ چنانچہ میں نے ریوالور نکالا اور اس کے بعد میں نے پورا ریوالور ان دونوں پر خالی کر دیا...... ہیگ اور ہشمان ذکری کے بھیجے کے چیتھڑے اڑ گئے تھے اور ان کے سینوں میں سوراخ ہو گئے تھے۔ سریتا دیوی وحشت زدہ انداز میں ایک طرف ہٹ کر دیوار سے جا لگی تھی۔ میں نے اپنی وحشت اور دیوانگی کو اس وقت نہیں روکا تھا۔ ہر نتیجے سے بے نیاز ہو کر میں نے یہ کارروائی کی تھی۔ ان کے جسم صرف چند لمحوں کے لئے تڑپے اور اس کے بعد وہ کھانے کی میز پر ہی اوندھے ہو گئے۔ ہر طرف خون ہی خون بکھر گیا تھا۔ لیکن جب میں نے سریتا دیوی کے چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے وہ چہرہ

نہ تو اس قدر خوفزدہ نظر آیا نہ مضطرب۔ وہ خاموش نگاہوں سے ان دونوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

''ہو گیا کام تمہارا، چلو آؤ...... میرے ساتھ آ جاؤ۔ یار، جو کچھ کرنا تھا کھانے کے بعد کر لیتے۔ اب یہ منظر دیکھنے کے بعد تو بھوک بھی نہیں لگے گی۔''

میں نے حیرانی سے سریتا دیوی کو دیکھا تو سریتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ایک بات بتاؤں تمہیں...... بڑی مزے کی بات ہے۔''

مجھے سریتا کی اس کیفیت پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ کہنے لگی۔ ''میں خود بھی ان دونوں کی موت چاہتی تھی۔ بہت عرصے سے یہ دونوں میری ہٹ لسٹ پر تھے۔ ان کا خاتمہ میرے ایک بہت بڑے مقصد کی تکمیل کرتا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ ان کی موت ہی انہیں یہاں لائی تھی۔ تم نے ذرا انداز بدل دیا۔ چلو اچھا ہوا تمہارے دل کو بھی تسکین ہو گئی کہ تم نے اپنے دشمن کو ختم کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ان کی موت لکھی ہوئی تھی۔ مگر کیا ہی عجیب بات ہے جو کھانا ان کی پلیٹوں میں ہے نا، یہ زہریلا ہے۔ ان پلیٹوں میں زہر کا پینٹ کر دیا گیا تھا اور اس میں جو کھانا پڑا ہوا ہے وہ اس قدر زہریلا ہے کہ ایک گھوڑا بھی با آسانی مر سکتا ہے اگر اس میں سے چند لقمے لے لے۔ سمجھ رہے ہو؟ میں بھی وہی کام کرنا چاہتی تھی جو تم نے کیا ہے۔ بس اتنا سا فرق ہے کہ کھانا بھی گندا ہو گیا اور قالین بھی۔ چلو خیر کوئی بات نہیں۔ میرے ملازم باہر تیار کھڑے ہوئے ہیں کہ ان کی لاشیں ٹھکانے لگا دیں۔ ان کے ساتھ دو آدمی اور بھی ہیں۔ ان دونوں کا مہمان خانے میں خاتمہ کر دیا گیا ہے اور ان چاروں کی لاشوں کو دفن کرنے کے لئے حویلی کے ایک گوشے میں ہی بندوبست بھی کر لیا گیا ہے۔ تم ایسا کرو اپنی آرام گاہ میں جاؤ اور میری واپسی کا انتظار کرو۔ میں یہ تمام کام اپنی نگرانی میں کرا کے آتی ہوں۔''

حقیقت یہ ہے کہ ہیگ اور ہشمان ذکری کو قتل کر کے جو ایک دلی سکون اور خوشی حاصل ہوئی تھی، رانی سریتا دیوی کے اس تعاون سے دوبالا ہو گئی تھی۔ میں نے عجیب سی نگاہوں سے دونوں کی لاشیں دیکھیں اور اس کے بعد رانی کے ساتھ باہر نکل آیا۔

سریتا دیوی کا یہ انداز میرے لئے انتہائی حیران کن تھا۔ لیکن وہ واقعی ایک خطرناک عورت تھی۔ انتہائی خوفناک عورت۔ جس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ اندر سے کیا ہے۔ بہرحال میں باہر نکل آیا اور سریتا باہر کھڑے ہوئے ان چار افراد کی طرف

بڑھ گئی جو یقیناً وہی ملازم تھے جنہیں یہ لاشیں ٹھکانے لگانے کا کام سونپا گیا تھا۔ میرا وہاں رُکنا مناسب نہیں تھا۔ لیکن جن احساسات کے ساتھ میں اپنے کمرے میں آیا وہ بڑے عجیب اور سنسنی خیز تھے۔

سریتا کے بارے میں تو یہ پتہ چل چکا تھا کہ وہ انتہائی بھیانک عورت ہے۔ ستنام نے مجھے اس کے بارے میں پوری حقیقت بتا دی تھی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہیگ اور ہشمان ذکری کو کیوں قتل کرنا چاہتی تھی؟ کس حیثیت سے وہ یہاں آئے تھے؟ ان کی قومیت کیا لکھی گئی تھی؟ ظاہر ہے اس طرح کے لوگ اس قدر بے حیثیت نہیں ہوتے کہ ان کے سفارت خانوں کو ان کے بارے میں معلومات حاصل نہ ہوں۔ کیا وہ چھپ چھپا کر یہاں آئے تھے؟

جہاں تک ہیگ کا تعلق اس لوح سے تھا تو یقینی طور پر اس عورت کو اس لوح کے بارے میں نہیں معلوم تھا کیونکہ جس انداز میں ہیگ نے اس سے خزانے کا تذکرہ کیا تھا اس میں لوح کا کہیں تذکرہ نہیں تھا۔ بہرحال ہیگ مارا گیا۔ وہ شخص جس کے لئے میں نے ایک خوفناک سمندری سفر کیا تھا اور اس کے بعد انتہائی وحشت ناک مشکلات میں گھر گیا تھا۔ وہ اس وقت تو میرے ہاتھوں نہیں مارا گیا تھا لیکن آج میری وہ خواہش بھی پوری ہو گئی تھی۔

دفعتہً ہی مجھے ایک اور خیال آیا، کہیں ایسا نہ ہو کہ سریتا نے میری وحشت روا کرنے کے لئے اس طرح کے برتاؤ کا مظاہرہ کیا ہو اور اب وہ میرے لئے کوئی چوہے دان تیار کر رہی ہو۔ یہ خیال کرتے ہی میں اچھل کر کھڑا ہو گیا اور پھر برق رفتاری سے باہر نکل آیا۔ میں نے چھپ چھپا کر سریتا دیوی کو تلاش کر ہی لیا۔ اس کے چاروں ساتھی ان لاشوں کو لے کر حویلی کے ایک ویران گوشے کی جانب جا رہے تھے۔ اور پھر میں نے ان کا تعاقب کر کے وہ جگہ بھی دیکھ لی جہاں واقعی ایک بڑا سا گڑھا تیار کیا گیا تھا۔ ان لاشوں کو ان گڑھوں میں ڈال دیا گیا۔ دو لاشیں اور بھی تھیں۔ سریتا دیوی نے اپنی اس آرام گاہ میں بڑے بھیانک انتظامات کر رکھے تھے۔ لیکن یہ عورت کیا ہے اور اس کے پُراسرار علوم کی کہانی کیا ہے؟ یہ بہت سی باتیں میرے دل و دماغ میں ہلچل مچا رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس عورت سے صحیح طور پر مقابلہ نہ کر سکوں اور اسی کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار جاؤں۔ پھر ایک اندازِ مستانہ سے میں نے سوچا کہ

زندگی تو ہوتی ہی ہارنے کے لئے ہے۔ کہیں اور کسی کے ہاتھوں مارا جائے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک اتنی بڑی خواہش پوری ہو گئی تھی جو اب خواب ہی بن کر رہ گئی تھی۔ بات وہی وقت کی ہوتی ہے۔ ایک عرصہ ہو گیا، ایک دنیا گزار لی اور ہیگ ہمیشہ بچتا رہا۔ لیکن تقدیر نے یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ ہشمان ذکری گیہوں کے ساتھ گھن کی حیثیت سے پس گیا تھا لیکن وہ بھی کم خطرناک آدمی نہیں تھا۔ مجھے اس کی وہ پراسرار حویلی یاد تھی اور یہ بھی یاد تھا کہ امینہ اسی کی وجہ سے زندگی ہاری تھی۔

☆

رانی سریتا دیوی دوسرے دن مجھے بالکل دستیاب نہیں ہوئی تھی۔ تین چار دن بعد میرے ذہن میں ستنام سنگھ کا خیال آیا۔ مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ رانی ستنام سنگھ ہی کے لئے پریشان ہو گی۔ ویسے واقعی خطرناک عورت تھی۔ ہیگ اور ہشمان ذکری کے علاوہ اس کے دو ساتھی یعنی چار افراد کی لاشوں کو اس طرح غائب کر دیا گیا تھا کہ ان کا نام ونشان مٹ گیا تھا۔ اس صورتحال کو بھی رانی سنبھال رہی ہو گی۔ ہوسکتا ہے ہیگ کسی ملک کے سفارت خانے کے تحت یہاں آیا ہو۔ لیکن بہرحال رانی کے وسائل خاصے زیادہ اور بہترین معلوم ہوتے تھے۔ پتہ نہیں وہ خود ہیگ کو کیوں قتل کرنا چاہتی تھی۔ ویسے میں نے جو قدم اٹھایا تھا وہ بھی بڑا سنسنی خیز اور انتہائی جذباتی نوعیت کا حامل تھا۔ لیکن حیران کن بات وہ ریوالور تھا مجھے مل گیا تھا۔ خود رانی نے بھی مجھ سے اس ریوالور کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ غالباً اس کی وجہ اس کی ذہنی پریشانی تھی ورنہ وہ مجھ سے اس بارے میں ضرور پوچھتی۔

بہرحال یہ دوسرا دن پورا گزر گیا اور رانی مجھے ایک بار بھی نظر نہ آئی۔ البتہ اس حویلی یا پھر دوسرے الفاظ میں محل کے معاملات میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ یہاں مجھے بہت سے خطرناک چہرے نظر آتے تھے۔ میں تو یہاں رکنے کا قائل بھی نہیں تھا لیکن رکنے سے فائدہ ہی ہوا تھا۔ اب میرے لئے نکل جانا کوئی مشکل کام نہیں تھا کیونکہ میں باہر جانے کے راستے جانتا تھا۔ لیکن رانا جسپال کا انتظار ضروری تھا جس کے بارے میں مجھے اطلاع مل چکی تھی کہ بس آنے ہی والا ہے۔ یوں تھوڑا سا وقت اور گزرا۔ دوسرے دن صبح ناشتے پر اطلاع ملی کہ رانی میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں تیار ہو کر ناشتے پر پہنچ گیا۔ رانی نے گردن خم کر کے میرا استقبال کیا اور بولی۔

"آؤ بیٹھو خاقان جمشیدی! تم بھی کیا سوچ رہے ہو گے کہ تمہیں یہاں لا کر میں نجانے کیسے کیسے کاموں میں مصروف ہو گئی۔"

"نہیں آنٹی! بلکہ میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔"

"کیا؟"

"اصل میں ایسا مہمان بننا چاہتا ہوں جس کے ساتھ مہمانی کا تصور نہ ہو بلکہ وہ بذاتِ خود میزبان ہو۔ آپ کے کاموں میں ہاتھ بٹانا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں ضرورت سے آگے نہ بڑھ جاؤں اور آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ میں اپنی حدوں کو عبور کر رہا ہوں۔"

رانی کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بولی۔ "میں نے تو تمہاری حدیں توڑ دی ہیں۔ تم خود اپنے لئے حدیں کیوں مقرر کر رہے ہو؟ یہ کام مجھے کرنے دو۔"

"آپ نے بے شک مجھ پر جو احسانات کئے ہیں میں انہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔"

"ارے...... میں تو تم پر احسانات کرنا چاہتی ہوں۔ ابھی میں نے کوئی احسان کہاں کیا ہے تم پر۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ خود تم نے میرے لئے اپنے آپ کو جس طرح وقف کر دیا ہے یہ بہت بڑی بات ہے۔"

"تب پھر ہم دونوں بہت اچھے لوگ ہیں۔ آپ بھی اور میں بھی۔" میں نے ہنس کر کہا اور رانی بھی ہنسنے لگی پھر بولی۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ ہم میں سے کسی نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا۔ لیکن ہم ایک دوسرے کے احسان مند ہیں۔"

"تھوڑا سا وقت ہے؟ ذرا سی پریشان ہوں میں۔"

"خیریت، کیا ہیگ اور ہشمان ذکری کا قتل؟"

"نہیں، وہ کھیل تو ختم ہوا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ یہ ہیگ جو ہے نا یا تھا یہ اس قدر کمینہ صفت آدمی تھا کہ اس نے مجھے بدترین نقصان پہنچائے ہیں۔ تم یقین کرو کتے کی موت مرجاتا یہ۔ لیکن جو کام کرنا چاہتی تھی میں وہ تم نے کر ڈالا۔"

"اور اسے کر کے میں بے پناہ خوش ہوں۔"

"تمہارا مسئلہ یقیناً ایسا ہی ہو گا۔"

"اس نے میری پوری زندگی تباہ کر ڈالی۔ مجھے قاتل بنا دیا اس نے۔ اور پھر ایک بڑے انگریز افسر کا قتل جبکہ میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔"

"ہاں بتایا تھا تم نے۔ چلو چھوڑو...... میرا ایک شکار نکل بھاگا ہے۔ مجھے اس کی تلاش ہے۔ وہ مجھے مل جائے۔ بلکہ اس کا ملنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے مجھے کچھ الجھنیں بھی پیش آ سکتی ہیں۔"

"مجھے بتائیے، اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکتا ہوں میں؟"

"نہیں نہیں، میں خود ہی دیکھ رہی ہوں اسے۔ پتہ نہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ خیر جائے گا کہاں بچ کر۔ اچھا اب سنو، ہمیں اپنے معاملات کو بالکل بھلا کر رانا جسپال سنگھ کا سواگت کرنا ہے۔ وہ سیدھے یہیں آئیں گے۔ میرا مطلب ہے ہمیں انہیں لینے کے لئے ایئر پورٹ جانا ہوگا اور پھر وہاں سے انہیں گاڑیوں میں چندی گڑھ لانا ہوگا۔"

"ارے آپ چاہیں تو یہ کام میرے سپرد کر سکتی ہیں۔"

"نہیں، تم تو ساتھ ہو گے ہی۔ روپالیہ کی پیاسی آنکھیں تمہیں تلاش کر رہی ہوں گی۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تمہاری جگہ صرف میں اسے نظر آؤں۔"

"آپ رانا جسپال سنگھ سے بہت متاثر ہیں۔"

"بہت اچھا آدمی ہے۔ اور پھر سچ بتاؤں تمہیں میرے لئے بڑا کارآمد آدمی ہے۔"

"جی...... میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ آپ کے لئے وہ کیوں کارآمد ہے۔"

"تم بھروسہ کر لو، تمہیں یہ سب کچھ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تمہارے مطلب کی بات ہے ہی نہیں۔"

"جی۔" میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

ہم لوگ ناشتے میں مصروف ہو گئے۔ ناشتے سے فراغت حاصل کر کے رانی نے ک

"دیکھو...... تمہیں یہاں ہر طرح کی آزادی ہے۔ پورے چندی گڑھ میں جہاں دل چا گھومو پھرو۔ جیپ بھی مل سکتی ہے تمہیں۔ سیر و سیاحت کرو۔ رانا جسپال کی آمد کا ا کرنا ہوگا۔ اس کے بعد تمہیں روپالیہ کو نواحات کی سیر کرانی ہوگی۔"

"بہت بہتر۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ کاش میں بھی آپ کے ساتھ آپ کی الجھن میں شریک ہو سکتا۔"

"تم میری الجھن میں برابر کے شریک ہو۔ یہ مت سوچو کہ میں تمہیں نظر انداز کر

ہوں۔ جہاں تمہاری ضرورت پیش آئے گی میں تمہیں تکلیف دینے سے گریز نہیں کروں گی۔"

"مجھے خوشی ہوگی۔"

"میں جانتی ہوں تم کس طرح کے انسان ہو۔ اچھی طرح اندازہ ہے مجھے اور تم پر ناز کرتی ہوں میں کہ میرے اتنے اچھے اچھے دوست ہیں۔"

میں نے نیاز مندی کا مظاہرہ کیا۔ بہرحال رانی کو اپنے جال میں جکڑے رہنا انتہائی ضروری تھا۔ لفظوں کا خرچ بڑے بڑے کام بنا دیتا ہے اور رانی پر بھی الفاظ خرچ کئے بغیر قابو پائے رکھنا ضروری تھا۔ حالانکہ جو معلومات مجھے حاصل ہو چکی تھیں ان کے تحت میں خود رانی کا شکار تھا۔ لیکن بہرحال ہم دونوں ایک دوسرے سے چوہے بلی کا کھیل کھیل رہے تھے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ وقت کسے چوہا بنا دے اور کسے بلی۔ لیکن رانی کی دی ہوئی مراعات سے میں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا اور اس کے بعد جب رانی اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی تو میں نے جیپ طلب کر لی۔ مجھے چندی گڑھ کے بارے میں کافی تفصیلات معلوم ہو گئی تھیں۔ بہت اعلیٰ درجے کی ایک جیپ فیول ٹینک بھروا کر میرے سپرد کر دی گئی۔ ڈرائیور نے اپنی خدمات پیش کیں اور بولا۔

"سر جی! میں آپ کی ہر خدمت انجام دینے کے لئے تیار ہوں۔ آپ حکم دیجئے، میں آپ کے ساتھ چلوں یا آپ خود جیپ لے جائیں گے؟"

"نہیں، میں چندی گڑھ اور اس کے نواحات کی آوارہ گردی کروں گا۔ اور صحیح معنوں میں آوارہ گردی کا لطف تبھی آتا ہے جب انسان اجنبی راستوں پر سفر کرے۔ تم آرام کرو، میں جیپ لئے جا رہا ہوں۔ اور بالکل بے فکر رہو، میں آرام سے اسے ڈرائیو کروں گا۔"

"جی صاحب جی۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔

میں جیپ لے کر چل پڑا۔ تھوڑی دیر تک تو یہ اندازہ کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ کوئی پیچھا وغیرہ تو نہیں کر رہا ہے۔ رانی جیسی چالاک عورت سے ہر بات کی توقع کی جا سکتی تھی۔ لیکن کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آئی۔ جب مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ کوئی میرا تعاقب نہیں کر رہا تو میں نے اپنے حساب کے مطابق جیپ اس بستی کی طرف دوڑا دی جہاں ستنام سنگھ گیا تھا۔ میرے ذہن میں ستنام سنگھ کے لئے بہت سے خیالات تھے اور میں ان راستوں پر سفر کر رہا تھا۔ میں اگر چاہتا تو ان کھنڈرات میں جا کر اس جگہ کا جائزہ

بھی لے سکتا تھا لیکن وہ کھنڈرات اب میرے لئے موت کا گھر تھے۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ رانی انہی کھنڈرات میں تحقیقات کر رہی ہو گی کہ وہ کون تھا جس نے باہر سے دروازہ کھول کر ستنام سنگھ کو آزاد کر دیا۔ ممکن ہے اس وقت بھی انہی کھنڈرات میں موجود ہو۔

آخر کار یہ لمبا سفر طے کر کے میں کویا پہنچ گیا۔ چھوٹی سی خوبصورت آبادی تھی جس کے اطراف میں سرسوں کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ پیلی پیلی سرسوں سبز ڈنڈیوں پر اس قدر حسین لگتی تھی کہ گویا آنکھوں کے راستے دل میں اتر رہی ہو۔ ان میں جگہ جگہ حسین پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہ حسین پھول وہ نوجوان عورتیں تھیں جو سرسوں کے کھیتوں میں کام کر رہی تھیں۔ یہ محنت کش لڑکیاں اور عورتیں اس قدر دلکش لگ رہی تھیں ان ہری ہری ڈنڈیوں کے درمیان لال پیلے کپڑوں میں ملبوس کہ دل چاہتا تھا کہ انہیں بس دیکھتے رہا جائے۔ لیکن اس کا نتیجہ برا بھی نکل سکتا تھا۔ میں نے کویا بستی کے مختلف گوشوں میں جا کر ساری صورتحال کا اندازہ کیا۔ کویا کے مشرقی گوشے میں لاری اڈا تھا جہاں سے پرانے طرز کی لاریاں مقامی دیہاتیوں کو لے کر مختلف شہروں میں جاتی تھیں۔ میں نے معلوم کیا کہ یہاں سے کون سی لاری دہلی جاتی ہے تو پتہ چلا کہ تین لاریاں بدل کر یہاں سے دہلی جایا جا سکتا ہے۔ لازمی بات تھی کہ ستنام سنگھ اتنا بیوقوف نہیں ہو گا کہ کویا ہی میں وقت گزارتا رہتا۔ وہ دہلی نکل گیا ہو گا، لازمی بات ہے۔

بہر حال اس کے بارے میں یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اب وہ رانی کے ہاتھ نہیں آئے گا اور یہ دیکھ کر کہ یہاں کوئی ایسا نہیں ہے جو رانی کا آدمی ہو میں نے واپسی کا سفر طے کیا اور اس کے بعد بہت دیر تک چندی گڑھ کے نواحی علاقوں میں چکراتا رہا، پھر واپس آ گیا۔

رانی اس وقت بھی مجھے نہیں ملی تھی اور دوسرے دن بھی پورا دن وہ غائب رہی تھی۔ لیکن تیسرے دن رات کو اس وقت جب میں کھانا وغیرہ کھا کر فراغت حاصل کر چکا تھا وہ میری خوابگاہ میں پہنچ گئی۔ اس کے چہرے پر خوشی کی کوئی لکیر نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرے پاس آ کر اس نے کہا۔ ”کہو بھتیجے، کیسے ہو؟“

”ٹھیک ہوں آنٹی۔“

”مجھے رپورٹ مل گئی ہے کہ تم نے اس دوران اپنے آپ کو بور نہیں ہونے دیا۔“

”نہیں، بالکل بور نہیں ہوا ہوں میں۔ بس صرف اس احساس کا شکار ہوا ہوں کہ آپ

اکیلی نجانے کس اُلجھن میں گرفتار ہیں۔ کاش میں اس اُلجھن میں آپ کی مدد کر سکتا۔“

”تم پوری پوری مدد کر رہے ہو میری۔ رانا جسپال کل صبح ساڑھے آٹھ بجے آ رہے ہیں۔ ہمیں ساڑھے پانچ بجے یہاں سے چل پڑنا ہو گا تا کہ ہم ان کو ایئر پورٹ پر خوش آمدید کہہ سکیں۔“

”میں تیار ملوں گا آپ کو۔“

”بس یہی کہنے آئی تھی۔“

”آپ کا وہ شکار آپ کو ملا یا نہیں؟ یہ بتایئے۔“ میں نے سوال کیا تو رانی کے چہرے پر نفرت کے نقوش پھیل گئے۔ اس نے کہا۔

”سنو...... تمہاری دعا سے میرے پاس اتنے وسائل ہیں کہ میں ہندوستان میں بڑے سے بڑے مسئلے سے نمٹ سکتی ہوں۔ جیسے میں نے تمہارے بارے میں کہا اور تم بلاوجہ اس تشویش کا شکار تھے کہ ہندوستان میں تم انگریز حکومت کو درکار ہو۔ میرے ساتھ تم دہلی چلو۔ میں تمہیں ہر جگہ لے جا سکتی ہوں جہاں تمہارے سلسلے میں تمام تر ریکارڈ موجود ہو۔ لیکن جب میں ان سے کہہ دوں گی کہ یہ پرنس ہردیپ ہے تو پھر کسی کی مجال نہیں ہے جو یہ کہے کہ یہ پرنس ہردیپ نہیں ہے۔ اسی طرح میں اپنے شکار کی بات کرتی ہوں۔ وہ میرے لئے بڑی ضروری چیز تھا۔ لیکن اب جب وہ مجھے نہیں ملا تو میں نے اس پر تھوک دیا۔ وہ آسمان پر بھی جا بیٹھے تو میرے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ بس، بات ختم ہو گئی۔ میں نے اس کی تلاش چھوڑ دی ہے۔“

”ہاں۔ آپ کی پوزیشن کا تو میں بھرپور اندازہ لگا چکا ہوں آنٹی۔“

”اب تم آرام کرو۔ صبح کو خود جاگ جاؤ گے یا......“

”نہیں نہیں، میں خود جاگ جاؤں گا۔“

اور ایسا ہی ہوا۔ صبح جب وہ تیار ہو کر میرے کمرے کی طرف چلی تو میں دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ میں مکمل لباس میں تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

”اتنے ذمے دار لوگ مجھے بے حد پسند ہیں۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم بڑی گڈ بک میں ہو اور لحہ لحہ تم میرے دل میں اپنی جگہ کشادہ کرتے جا رہے ہو۔“

”اتنی خوبصورت باتوں کا شکریہ بھی ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔“ میں نے کہا اور رانی لا پڑی۔ ہم دونوں باہر جا کر ایک بڑی جیپ میں بیٹھ گئے۔ ہمارے پیچھے ایک اور کار

چل پڑی تھی۔ یہ انتہائی قیمتی کار تھی اور غالباً فورڈ کمپنی سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ کار رانا جسپال کے لئے تھی۔ رانی نے ایئر پورٹ تک کے سفر کے لئے جیپ کا انتخاب کیا تھا۔ صبح کی سہانی فضا میں ایک لمبا سفر انتہائی خوشگوار کیفیت کا حامل تھا۔ رانی غالباً کسی گہری سوچ میں تھی چنانچہ میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ رانا جسپال کو صورتحال سے آگاہ کر کے میں یہاں سے نکل جاؤں گا اور دیکھوں گا کہ کیا کر سکتا ہوں۔ دل چاہتا تھا کہ سیتا گڑھی جاؤں۔ وہاں میرے اہل خاندان بھی تھے۔ زندگی میں تو کبھی میں نے ان سے واسطہ نہیں رکھا تھا لیکن اب دل چاہتا تھا کہ ان سب سے ملا جائے۔

انسانی فطرت میں اپنوں کا ایک مقام ہمیشہ ہوتا ہے۔ جو لوگ اپنوں کو ٹھکرا دیتے ہیں اور ان سے دور ہٹ جاتے ہیں وہ عارضی طور پر تو اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کرتے ہیں لیکن آنے والے وقت میں انہیں احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے بہتر نہیں کیا۔ انہیں بہرحال اپنوں کی ضرورت تھی۔ یہ اپنے ہی تو زندگی کے ہر لمحے کے سفر کے ساتھی ہوتے ہیں۔ باقی تو سب راستے کے نشانات ہوتے ہیں جو پیچھے رہ جاتے ہیں۔

بہرحال ہمارا یہ سفر ختم ہو گیا اور میں رانی کے ساتھ ایئر پورٹ پہنچ گیا۔ فلائٹ صحیح وقت پر آ گئی تھی۔ مسافر باہر آنے لگے۔ میں نے رانا جسپال اور روپالیہ کو دیکھا، پیچھے رانا کے دو ساتھی تھے جو باڈی گارڈ بھی تھے اور سیکرٹری بھی۔ ایک وقار، ایک شان تھی رانا کی۔ شاندار سوٹ میں ملبوس روپالیہ تو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ بہت ہی حسین لباس پہنا ہوا تھا اس نے۔ بڑی پُر وقار شخصیت تھی اس کی لیکن اسے دیکھ کر میرے دل میں پھر بھنور پڑنے لگے۔ میں نے اسے ہمیشہ کلاڈیا کی شکل میں دیکھا تھا، اس نے جو تصویر مجھے دی تھی وہ بھی کلاڈیا کی تصویر تھی۔ لیکن منگنی والے دن اچانک اس کی شکل بدل گئی تھی اور یہ بات میرا دل کسی طور ہضم نہیں کر پاتا تھا۔

لیکن بہرحال سامنے کی سچائیوں کو کون جھٹلا سکتا ہے۔ آہ، نجانے وہ کیا قصہ تھا؟ ویسے قصہ تو مسلسل کچھ نہ کچھ تھا ہی کیونکہ کلاڈیا بدستور میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اب تو مجھے یہ احساس بھی ہونے لگا تھا کہ وہ عورت جس نے ستنام سنگھ کے لئے میری رہنمائی کی تھی اور ایک ہیولے کی شکل میں وہ مجھے کھنڈرات تک لے گئی تھی، کلاڈیا ہی تھی۔ خداوند عالم! یہ کلاڈیا آخر ہے کیا چیز؟ بے اختیار دل میں یہ خیال بھی گزرا کہ ذرا اس صورتحال سے

نجات مل جائے اور کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع مل جائے تو کلکتے کا ایک چکر ضرور لگاؤں گا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ کرنل صغیر کی بیٹی کلاڈیا کہاں ہے۔ وہ پراسرار وجود جو جگہ جگہ میرا تعاقب کرتا رہا ہے، اسی کلاڈیا کا ہے یا پھر یہ انوکھا کردار کہیں اور سے عالم وجود میں آیا ہے؟

رانا جسپال سنگھ نے ہم دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ میں نے روپالیہ کے چہرے پر بھی خوشی کے تاثرات دیکھے اور سوچنے لگا کہ جب اس لڑکی کو حقیقت حال کا علم ہوگا تو اس کی کیا کیفیت ہوگی۔ نیز یہ کہ رانا جسپال اس کا اور اپنا تحفظ بھی کر سکے گا یا نہیں؟ ستنام سنگھ نے جو انکشافات کئے تھے کیا وہ سچائی پر مبنی تھے یا پھر وہاں بھی کوئی جھوٹ چھپا ہوا ہے؟ لیکن ایک بات فیصلہ کن تھی کہ یہ انکشافات وقت ہی کرے گا۔ وقت سے پہلے کچھ معلوم ہو جانا ناممکنات میں سے ہے۔ کم از کم یہ میرا ذاتی تجربہ تھا۔

بہرحال اس طرح وہ دونوں ضروریات سے فراغت حاصل کر کے باہر نکل آئے۔ انی سریتا دیوی نے بڑا والہانہ استقبال کیا تھا۔ روپالیہ کی مسکراتی نگاہیں میرا جائزہ لے ہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"کیسی ہو روپالیہ!"

"کیسی نظر آ رہی ہوں آپ کو؟"

"پہلے سے زیادہ خوبصورت۔"

"شکریہ۔ بس ویسی ہی ہوں جیسی آپ کو نظر آ رہی ہوں۔"

رانی نے عقل سے کام لیا اور بولی۔ "تم لوگ اس کار میں سفر کرو گے۔ میں رانا پال اور باقی افراد کے ساتھ جیپ میں ہوں۔ یہ چابی پکڑو۔ اور ڈرائیونگ بھی تمہیں ہی رنی ہے۔ مگر ہم تم سے زیادہ دور نہیں ہوں گے۔"

رانی نے اپنی دانست میں بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ روپالیہ اس کارنامے سے بہت ں نظر آئی تھی۔ بہرحال ہم ایئر پورٹ سے چل پڑے تو روپالیہ نے کہا۔

"کتنا یاد کیا تھا مجھے؟"

"کافی۔" میں نے جواب دیا۔

"ایک بات کہوں؟"

"ہاں۔"

"تم مجھے اتنے زیادہ پُرجوش نظر نہیں آتے جتنی زیادہ میں ہوں۔"

"اچھا......؟"

"غلط کہہ رہی ہوں؟"

"ہاں۔"

"مگر میں غلط نہیں کہہ رہی۔"

"چھوڑو ان باتوں کو روپالیہ! تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"نہیں، مجھے وجہ بتاؤ۔ بات ٹالو نہیں۔"

"کوئی ایسی بات نہیں ہے روپالیہ! تمہیں احساس ہوا ہوگا میں ذرا معتدل قسم کا آدمی ہوں اور زندگی کی حقیقتوں کو حقیقت کی نگاہ سے دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ ظاہر ہے ابھی ہمارے درمیان تھوڑے سے فاصلے ہیں۔ یہ فاصلے طے ہو جائیں تو پھر ہم کھل کر اپنی محبتوں کا اظہار کریں۔" میں گول مول انداز میں اسے یہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے اور اس کے راستے الگ ہیں لیکن ابھی اس کا اظہار کر کے بھی کوئی مصیبت مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ بڑے محتاط انداز میں بول رہا تھا۔ لیکن روپالیہ شاید میرے اس سرد رویے سے ناخوش تھی۔ آخر میں اس نے کہا۔

"میں یہ پوچھ کر رہوں گی کہ تم مجھے پسند کرتے ہو یا نہیں؟ ویسے سچ بتاؤں، لندن میں رہ کر بھی میں نے یہی سب کچھ محسوس کیا تھا۔"

"ارے نہیں روپالیہ! بھلا یہ احساس تمہیں کیسے ہوا؟"

"اس لئے کہ فون پر بھی تمہارے لہجے میں وہ جوش اور وہ اپنائیت نہیں ہوا کرتی تھی جو میرے لہجے میں ہوتی تھی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اس کمی کو اب پورا کر لیں گے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور آخر کار ہم چندی گڑھ میں رانی کی حویلی میں پہنچ گئے۔

حویلی میں رانا جسپال کے استقبال کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔ ابتدائی رسمیں پوری کی گئیں۔ رانا صاحب اور روپالیہ کو الگ الگ کمرے دیئے گئے تھے لیکن دونوں برابر برابر تھے۔ میری خاص طور سے ڈیوٹی تھی کہ میں روپالیہ کو خوش رکھوں۔ بہرحال میرے سپرد یہ ذمہ داری میری مرضی کے خلاف تھی لیکن میں رُکا ہی اس لئے تھا کہ رانا کو کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہونے دوں حالانکہ اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں تھا۔ ستنام سنگھ کے ساتھ

کہیں بھی نکل سکتا تھا۔ خطرہ تو بہرحال ہر جگہ ہی تھا اور اس خطرے سے خود ہی مقابلہ کرنا تھا جس کے لئے میرے اندر اب کوئی بے چارگی نہیں رہی تھی۔ اصل میں میرا حوصلہ ہیگ اور ہشمان ذکری کو ختم کرنے کے بعد بہت زیادہ بڑھ گیا تھا اور انسان جب یہ سوچ لے کہ اس کی زندگی کا مقصد تو پورا ہو چکا ہے، اب تو صرف جینے کے لئے جینا ہے اور زندگی جب تک ساتھ دے منافع والی بات ہے تو پھر بہت سے خوف خود بخود کم ہو جاتے ہیں۔

میں اس وقت اسی پوزیشن میں آ گیا تھا اس لئے ذرہ برابر خوفزدہ نہیں تھا۔ رانا جسپال کی خاطر مدارات کے سلسلے میں مجھے بھی پیش پیش رہنا پڑتا تھا۔ روپالیہ سے میں نے عشق و محبت کی داستانیں تو نہیں دوہرائیں لیکن عارضی طور پر اسے سنبھالے رکھنے کے لئے خاصی یگانگت اور محبت کا ثبوت دیتا رہا جس سے وہ کافی حد تک مطمئن نظر آئی تھی۔ اور پھر میں اس کے ساتھ سیر و سیاحت کے لئے نکل پڑا۔

رانی کی طرف سے ہمیں اجازت تھی، وہ قیمتی کار ہمیں دے دی گئی تھی۔ چندی گڑھ چھوٹی سی جگہ تھی۔ اس کے نواحات بھی بے حد خوبصورت تھے۔ میں خود ڈرائیونگ کرتا تھا اور روپالیہ بہت زیادہ خوش نظر آتی تھی۔ لیکن میں زیادہ وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ پتہ نہیں رانی سریتا کے ذہن میں اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے کون سا وقت تھا۔ میں یہ بات نہیں جانتا تھا لیکن میں اپنا فرض ضرور پورا کر دینا چاہتا تھا۔ فوری طور پر رانا جسپال کو اس صورتحال سے آگاہ کر دینے کا مطلب یہ تھا کہ رانا جسپال محتاط ہو جائے اور احتیاط شروع کر دے۔ رانی جس قدر چالاک عورت تھی اس سے لازمی امر تھا کہ رانا جیسے ہی احتیاط شروع کرے گا وہ سمجھ جائے گی کہ رانا کو کسی بات کا شبہ ہو گیا ہے۔

بہرحال رانا کو یہاں آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ روپالیہ خوب نکھر گئی تھی۔ اسے میری محبت کا یقین ہو گیا تھا اور وہ غلط فہمی جو اس کے دل میں تھی وہ نکل چکی تھی۔ اس رات ڈنر کے دوران رانا جسپال نے کہا۔

"اور اب آپ مجھے اجازت دیں گی رانی جی! دو چار دن کے لئے اُودے پور جانا چاہتا ہوں۔ اُودے پور میں میرے کچھ رشتے دار بھی ہیں اور وہاں میری کافی جائیداد بھی پڑی ہوئی ہے۔ پچھلے بہت دنوں سے وکیل سے بات چیت چل رہی ہے۔ میں اصل میں اب اس جائیداد کو بیچ دینا چاہتا ہوں۔ یا پھر اگر آپ کو وہ زمینیں وغیرہ پسند آئیں تو آپ انہیں رکھ لیجئے گا۔"

"ہمیں زمینوں کا کیا کرنا ہے رانا صاحب! آپ ہو آیئے۔ لیکن ابھی دو چار دن نہ جاتے تو کیا حرج تھا۔"

"اُودے پور کا کام نمٹا آؤں اس کے بعد آپ کی خدمت میں کچھ وقت گزاروں گا۔"

"ہاں ضرور۔ کب جانا چاہتے ہیں آپ؟"

"کل صبح۔"

"ریل سے جانا ہوگا؟"

"ہاں ریل ہی کا سفر ہے۔"

"میں معلومات کرائے لیتی ہوں۔"

"نہیں، مجھے معلوم ہے۔ یہاں چندی گڑھ سے ٹرین صبح ساڑھے آٹھ بجے ملتی ہے۔ میں سات بجے نکل جاؤں گا۔"

"سات بجے کیوں؟"

"ہمیشہ کی عادت ہے، وقت سے پہلے پہنچ جاتا ہوں۔ آپ ڈرائیور سے کہہ دیجئے مجھے چھوڑ دے۔ کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ڈرائیور نہیں انکل، میں آپ کو لے کر چلوں گا۔" میں نے فوراً ہی اپنی خدمات پیش کر دیں اور رانی ہنسنے لگی، پھر بولی۔

"داماد جی بڑے مستعد ہیں آپ کے۔"

"کیوں نہیں بھئی، داماد کیا اب تو یہ میرا بیٹا ہے۔" رانا جسپال نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

"میں بھی جاؤں گی ڈیڈی۔" روپالیہ نے کہا۔

"ارے تم...... تم صبح اٹھ سکو گی روپالیہ؟ زندگی میں تو تمہارا ریکارڈ ہے۔"

روپالیہ ہنسنے لگی پھر بولی۔ "میں اپنا ریکارڈ خود توڑ دوں گی۔"

"ہمیں کیا اعتراض ہے بھئی۔ دیکھ لینا۔"

مجھے یہ موقع سب سے بہتر نظر آیا۔ لیکن روپالیہ کا ساتھ ہونا مناسب نہیں تھا۔ میں نے دوسرے دن صبح چھ بجے ہی تمام تیاریاں مکمل کر لیں۔ میری دلی آرزو تھی کہ روپالیہ سوتی ہی رہے تاکہ مجھے رانا جسپال سے گفتگو کرنے کا مناسب موقع مل جائے۔ رانی نے بھی غالباً اسی لئے مجھے آزادی دے دی تھی کہ اس کے ذہن میں اس سلسلے میں کوئی

تشویش نہیں تھی۔

بہر حال روپالیہ معمول کے مطابق سوتی رہی۔ رانا نے اس کے کمرے میں جھانک کر کہا۔ "اگر اسے وقت سے پہلے جگا بھی دیا جائے تو سارا دن اس کا موڈ خراب رہتا ہے۔ ہم لوگ چلتے ہیں، اسے رہنے دو۔"

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا اور سوچا تھا کہ تقدیر یہاں میرا ساتھ دے رہی ہے۔ روپالیہ کی موجودگی میں یہ سب کچھ نہیں بتایا جا سکتا تھا۔ اسٹیشن تک ڈرائیونگ بھی مجھے ہی کرنی تھی۔ رانی بھی آرام کرنے کی عادی تھی۔ چنانچہ ہلکے پھلکے ناشتے کے بعد میں رانا جسپال کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ حویلی سے باہر نکلنے کے بعد رانا جسپال نے کہا۔

"تم بہت اچھے انسان ہو ہردیپ سنگھ! تم یقین کرو مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ ویسے میرا دعویٰ ہے کہ اگر تم ہندوستان ہی میں رہتے تو اس قدر کام کے آدمی نہیں بن سکتے تھے۔ سینٹ لوسیا میں تمہاری زندگی......"

"رانا صاحب! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور رانا چونک پڑا۔

"خیریت؟"

"خیریت نہیں ہے۔"

"ارے ارے، کیا بات ہے بھئی؟"

"رانا صاحب! ایک بہت بڑا کھیل ہو رہا ہے۔ میں اس کھیل کے بارے میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔"

"کھیل؟"

"ہاں۔ آگے ایک باغ آتا ہے، وہاں میں گاڑی روک دوں گا۔ وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"اسٹیشن نہیں چلو گے؟"

"آپ پوری تفصیل سن لیجئے اور اس کے بعد فیصلہ کیجئے کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ ویسے یقینی طور پر اُودے پور میں، میرا مطلب ہے اُودے پور جانے کے لئے ساڑھے آٹھ بجے کے بعد بھی کوئی ٹرین ملتی ہوگی۔"

"ہاں، اس کے بعد پونے دس بجے ٹرین ملتی ہے۔"

"آپ اس سے چلے جایئے۔"

"جس قدر تم سنجیدہ ہو، وہ مجھے لرزائے دے رہا ہے۔ ویسے چلتے رہو۔ رُک کر بات کرنے کی کوئی خاص ضرورت ہے؟"

"نہیں، آپ کی مرضی ہے۔ چل رہے ہیں؟"

"مگر مسئلہ کیا ہے بیٹے۔ کیا کہنا چاہتے ہو آخر تم ایسی بات۔"

"رانا صاحب! سب سے پہلی بات تو یہ بتا دوں آپ کو جو کچھ میں آپ سے کہوں گا اس میں ذرہ برابر جھوٹ نہیں ہوگا۔ چونکہ یہ میرے نہیں آپ کے مفاد کی بات ہے۔ میں صرف ایک اچھے انسان کی حیثیت سے آپ کو ان حقیقتوں سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔"

"ہاں بولو۔ بتاؤ، جلدی بتاؤ۔ میں بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہوں لیکن اس وقت تمہارے لہجے کی اس سنجیدگی نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔"

"سب سے پہلی بات یہ آپ سے عرض کروں رانا صاحب! کہ میں پرنس ہردیپ سنگھ نہیں ہوں۔"

رانا پر یہ انکشاف ایک دھماکے کی حیثیت رکھتا تھا۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ "تو پھر؟"

"میرا نام خاقان جمشیدی ہے۔ میں ایک مسلمان باپ کا بیٹا ہوں۔ تعلق سیتا گڑھی سے ہے۔ سینٹ لوسیا میں کبھی نہیں گیا بلکہ مختلف جگہوں پر گھومتا ہوا لندن پہنچا تھا۔ وہاں رانی سریتا دیوی مجھے ملیں۔ کچھ اس انداز سے میرے ساتھ پیش آئیں کہ میرے اور ان کے درمیان ہلکے پھلکے تعلقات قائم ہو گئے۔ تب انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں کچھ عرصے کے لئے ان کے بھتیجے کی حیثیت اختیار کر لوں، وہ مجھے ہردیپ سنگھ کے نام سے کسی کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہیں۔ اور آخر کار انہوں نے مجھے ہردیپ سنگھ کی حیثیت سے آپ سے ملایا۔ انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ ایک مجبوری کے تحت وہ ہردیپ سنگھ کی منگنی رانا جسپال کی بیٹی سے کرنا چاہتی ہے اور یہ ضروری ہے۔ ہردیپ سنگھ کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ رانی صاحبہ کے فارم ہاؤس پر قتل کر دیا گیا تھا۔ بعد میں یہ پتہ چلا کہ یہ ہردیپ سنگھ نہیں تھا بلکہ اس کا دوست تھا۔ ایک عجیب کہانی رانی نے مجھے سنائی تھی جو غلط تھی۔ رانا صاحب! اب آپ پوری بات ہی سن لیجئے۔ وہاں ہردیپ سنگھ کی

حیثیت سے مجھے روپالیہ جی سے ملوایا گیا اور آپ لوگوں نے آخر کار ہماری منگنی کر دی۔ ہم یہاں واپس آ گئے۔ میرے ذہن میں شدید تجسس تھا کہ آخر رانی صاحبہ کے اس کھیل کی نوعیت کیا ہے۔ بہرحال پھر میری ملاقات ایک شخص سے ہوئی۔ یہ ستنام سنگھ تھا۔ سینٹ لوسیا میں ہردیپ سنگھ کا ساتھی۔ دونوں ساتھی لندن پہنچے تھے۔ رانی نے ہردیپ سنگھ سے غالباً کوئی بات کی تھی اور اختلاف ہو جانے کی وجہ سے اس نے ہردیپ سنگھ کو قتل کر دیا تھا اور ستنام سنگھ کو چونکہ یہ تمام تفصیلات معلوم تھیں اس لئے اس نے اسے یہاں لا کر یہاں سے تھوڑے فاصلے پر کولی کے کھنڈرات میں ایک تہہ خانے میں قید کر دیا۔ یہ بالکل اتفاق کی بات ہے کہ میں ٹہلتا ہوا ان کھنڈرات کی جانب جا نکلا اور بالکل غیر متوقع طور پر اس تہہ خانے تک پہنچ گیا جہاں مجھے ستنام سنگھ ملا۔ وہاں پہنچ کر مجھے باقی تمام حقیقتیں معلوم ہوئیں۔ رانی سریتا دیوی کالے علوم سیکھ رہی ہے اور اس کے لئے اسے مختلف کالے کرتوت کرنا پڑتے ہیں۔ ایک بہت ہی اہم سلسلے میں اسے ایک نوخیز جوڑے کی بلی دینے کی ضرورت پیش آ گئی تھی اور اس کے لئے اس نے ہردیپ سنگھ اور آپ کی بیٹی روپالیہ کا انتخاب کیا تھا۔ اب انتخاب میں کیا راز پوشیدہ ہے یہ بات میرے علم میں نہیں آ سکی۔ منصوبے کے مطابق اس نے وہاں مجھے ہردیپ سنگھ بنا کر میری منگنی آپ کی بیٹی سے کی اور مجھے یہاں لے آئی۔ منصوبے ہی کے مطابق روپالیہ کو یہاں بلایا جانا تھا اور اس کے بعد خاموشی سے وہ ہم دونوں کو اپنے کالے مقصد کے لئے قربان کر دیتی۔ ستنام سنگھ کو یہ تمام تفصیلات خود اسی نے بتائی تھیں۔ ستنام سنگھ نے ساری تفصیلات مجھے بتا دیں۔ میں بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہا تھا اور آپ کو ہوشیار کر دینا چاہتا تھا۔ بنیادی چیز یہ ہے کہ میں ایک مسلمان آدمی ہوں اور یہیں سے ساری باتیں غلط ہو جاتی ہیں۔ آپ مجھے بتایئے رانا صاحب! اب آپ اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟ آپ یقین کیجئے، یہ تمام تفصیلات معلوم ہونے کے بعد میں نے ستنام سنگھ کو آزاد کر دیا۔ وہ یہاں سے دہلی چلا گیا کیونکہ وہیں کا باشندہ ہے وہ۔ میں اگر چاہتا تو خود بھی ہندوستان کی وسعتوں میں گم ہو سکتا تھا۔ رانی اتنی آسانی سے مجھے تلاش نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن میں نے سوچا کہ آپ کو بھی تمام تفصیلات سے آگاہ کرنا ضروری ہے تاکہ خدانخواستہ روپالیہ کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔

اوہ مائی گاڈ...... مائی گاڈ" رانا جسپال انتہائی غمزدہ لہجے میں بولا۔ پھر اسی

طرح کہنے لگا۔ ''روپالیہ پر تو غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ وہ نیم دیوانی ہو جائے گی۔''

''اسے آپ سنبھال لیجئے رانا صاحب! لیکن اس طرح ایک شیطانی عمل کا شکار ہو جانا جس قدر خطرناک ہے، اس کا آپ کو علم ہے۔ روپالیہ جی کے دُکھ کو آپ سمیٹ لیں گے لیکن ان کی زندگی تو بچ جائے گی۔''

''نوجوان! ویسے تو تم ہمیشہ سے مجھے ایک صاحب کردار شخص نظر آئے اور میں نے یقین کرو دل ہی دل میں تمہیں پسند کیا۔ ظاہر ہے اگر تم چاہتے تو بہت فائدے حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن تم نے ہم پر بہت بڑا احسان کر ڈالا ہے۔''

''آپ ان باتوں کو چھوڑیئے، اب آپ یہ بتایئے کہ آپ کا کیا مشورہ ہے؟''

''اس کتیا کی بچی کو تو میں وہ سبق سکھاؤں گا کہ دنیا دیکھے گی۔ میں بے شک ایک طویل عرصے سے ہندوستان سے باہر ہوں لیکن ہندوستان میرا اپنا گھر ہے۔ تم ذرا رفتار تیز کرو، میں اسی ٹرین سے اُودے پور جاؤں گا۔ تمہارے سپرد میں یہ ذمے داری کئے جا رہا ہوں کہ جب تک میں واپس نہ آ جاؤں، تم روپالیہ کو رانی کے جال سے بچانا اور خود بھی اپنی زندگی محفوظ رکھنا۔ میری واپسی میں بہت زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ میں تمہیں ایک ٹیلی فون نمبر دیتا ہوں۔ اس نمبر پر رِنگ کرنا، میں تمہیں بتا دوں گا کہ میں کب واپس یہاں چندی گڑھ پہنچ رہا ہوں۔ بالکل بے فکر رہنا، میں سارے کام کر لوں گا۔ اُودے پور میں ڈی آئی جی پولیس میرا بہت گہرا دوست ہے۔ بس یوں سمجھ لو اس وقت اُودے پور میں اپنی زمینوں کے کام سے نہیں جا رہا بلکہ اس بھیانک منصوبے کے خاتمے کے لئے جا رہا ہوں۔'' رانا جسپال سنگھ مجھے مختلف ہدایات کرتا رہا اور میں نے انہیں ذہن نشین کر لیا۔

اور پھر آخر کار ہم ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔

***

رانا جسپال کو اسٹیشن چھوڑ کر میں واپس حویلی پہنچ گیا کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ روپالیہ ناشتے پر آئی۔ روٹھی روٹھی سی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی۔

''آپ نے مجھے جگا کیوں نہ لیا؟''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''رانا صاحب نے منع کر دیا تھا۔ کہنے لگے اگر آپ کی نیند پوری ہونے سے پہلے آپ کو جگا دیا گیا تو پورا دن آپ کا موڈ خراب رہے گا۔''

رانی سریتا دیوی کی موجودگی میں روپالیہ نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی لیکن بعد

میں وہ کہنے لگی۔ ''آئندہ خیال رکھئے گا آپ۔ اگر مجھے آدھی رات کو بھی جگا لیں گے تو میرا موڈ خراب نہیں ہوگا۔''

میں ہنسنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''ابھی تو مجھے آپ کی عادتوں کا کوئی پتہ نہیں ہے۔''

''واقف ہوتے جایئے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ناز برداری کرنا تو ہوگی۔''

''ہاں۔''

''پتا جی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اگر میں چاہوں تو ان کے ساتھ اُودے پور چلوں۔ آپ کو بھی ساتھ لے لوں۔ میں نے منع کر دیا۔ میں نے کہا کہ نہیں، ابھی نہیں۔ میں یہیں چندی گڑھ میں آپ کے ساتھ گھومنا پھرنا چاہتی ہوں۔''

''ہاں کیوں نہیں۔'' میں نے کہا۔

''آج کا کیا ارادہ ہے؟''

''جیسا آپ کہیں۔''

''وہ جو ایک ہردیوی کا مندر آپ نے مجھے دور سے دکھایا تھا مجھے بہت پسند آیا تھا۔ آپ مجھے وہاں لے کر چلیں۔ اصل میں لندن میں اس طرح کے پرانے مندر نظر نہیں آتے۔ جبکہ مجھے ایسی پرانی عمارتوں سے بہت دلچسپی ہے۔''

یہ بات میرے علم میں بھی نہیں تھی کہ سریتا دیوی ہماری باتیں سن رہی ہے۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور مسکرا کر بولی۔

''سوری بچو! یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری باتوں پر کان لگائے ہوئے تھی۔ تمہارے پاس آ رہی تھی، تم نے اصل میں تھوڑا سا کھلا ہوا دروازہ نہیں دیکھا۔ ایک دوسرے میں اس طرح گم تھے کہ میری دستک بھی نہیں سن سکے۔ لیکن میں نے تمہاری باتیں سن لی ہیں۔ خوش ذوق لوگ اپنے ماضی کی کہانیاں بڑی دلچسپی سے سنتے اور دیکھتے ہیں اور یہ بھی روپالیہ نے بالکل ٹھیک کہا کہ لندن میں زمانہ قدیم کی کچھ عمارتیں انگریزی ماحول سے متعلق ہوں تو ہوں لیکن کم از کم پرانے مندر کہیں بھی نظر نہیں آ سکتے۔ یا ہمارے طرزِ معاشرت کی عمارتی تصویریں وہاں کے ماحول میں نہیں ملتیں۔ ہندوستان میں ایسی تاریخی عمارتیں اتنی بکھری ہوئی ہیں کہ انسان کی زندگی انہیں دیکھتے دیکھتے پوری ہو جائے۔ چندی گڑھ کے نواحات میں بھی کچھ ایسی ہی عمارتیں ہیں۔ یہاں ایک پورا معاشرتی نظام کولی کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں کی لوک کہانیاں بھی بڑی دلچسپی سے سنی جاتی ہیں۔ میں

تمہیں کولی کے کھنڈرات کے بارے میں ایک تفصیلی کہانی سناؤں گی۔ یہ کہانی سنانے کے بعد تمہیں وہاں کی سیر بھی کراؤں گی۔ چلو گے میرے ساتھ؟"

"کیوں نہیں آنٹی۔ آپ کے ساتھ جانے میں تو بہت لطف آئے گا۔"

"تو پہلے میں تمہیں وہ کہانی سناؤں گی۔ کیا سمجھے؟ بڑا تاریخی شہر ہے کولی۔ ہے کیا، بلکہ تھا ماضی قدیم میں۔ یہ شہر کچھ آفات کا شکار ہوا اور پھر اس کا نام و نشان مٹ گیا۔ ایک دو کھنڈر وہاں نظر آتے ہیں اور بس۔ شہر کولی ایک باقاعدہ ریاست تھی اور جو کھنڈرات اب کولی کے کھنڈرات کہلاتے ہیں یہ اصل میں ریاست کول کا وسیع و عریض قلعہ تھا اور اس قلعے کی گہرائیوں میں......" اتنا کہہ کر سریتا دیوی خاموش ہو گئی۔ روپالیہ اور میں اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہے تھے۔ روپالیہ تو خیر معصوم سی لڑکی تھی، صورتحال کو کیا ہی سمجھتی۔ لیکن میرے ذہن نے بہت سے جھٹکے کھائے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ سریتا نے اپنے کام کا آغاز کر دیا ہے اور وہ ہم دونوں کو کولی کے کھنڈرات کی جانب متوجہ کر رہی ہے تاکہ اپنے کام کا آغاز کر سکے۔ وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی تھی، پھر اس نے کہا۔

"چھوڑو بچو، میں بھی کیا پرانی داستانیں لے کر بیٹھ گئی۔ ظاہر ہے تمہیں ان داستانوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ بس روپالیہ نے پرانے مندر کا ذکر کیا تو مجھے کولی کی وہ داستان یاد آ گئی جس میں راج کماری دیول دیوی اور خضر خان کی آوازیں مدفون ہیں۔"

"دیول دیوی اور خضر خان؟" روپالیہ نے انتہائی دلچسپی سے پوچھا۔

"ہاں روپالیہ! محبت تو ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ انسان اس کے ہاتھوں اس طرح مارا جاتا ہے کہ بس سوچو تو دل دُکھے۔"

"ایسا کرتے ہیں ہردیپ! کہ آج آنٹی سے کولی کی داستان سنتے ہیں، کل گھومنے چلیں گے۔" روپالیہ نے داستان میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہیں یہ کہانی پسند آئے تو کل میرے ساتھ کولی کے وہ کھنڈرات دیکھنے چلو۔ جو کچھ میں تمہیں وہاں دکھا سکتی ہوں کوئی اور نہیں دکھا سکتا۔"

"آنٹی، ہم ضرور چلیں گے۔ آج ہی کیوں نہ چلیں وہاں۔"

"آج نہیں، کل۔ کل اماوس ہے۔" رانی سریتا نے کہا اور اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ میں خود چونک پڑا تھا۔ اماوس، ہندو لوک داستانوں میں ڈوبتے چاند

کی رات بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ تاریکیوں میں نجانے کیسے کیسے خونی کھیل جنم لیتے ہیں۔ گویا رانی نے اس خونی کھیل کا آغاز کر دیا تھا جس کی اطلاع ستنام سنگھ نے مجھے دی تھی۔

بہرحال رانی کی کہانی سن لی جائے۔ کم از کم اس بات کا تعین ہو گیا تھا کہ رانی نے اپنے کام کا آغاز کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ کل کے دن جب چاند ڈوب جائے گا، اپنے شیطانی عمل کا آغاز کرے گی۔ یہ اطلاع لازمی طور پر رانا جسپال سنگھ کو بھی دینی تھی۔

رانی جیسے ماضی کے جھروکوں میں جھانک رہی تھی، پھر اس کی آواز ابھری۔

"ساون عروج پر تھا۔ کئی دن سے رِم جھم مینہ برس رہا تھا۔ آسمان پر حد نظر تک اُودے اُودے بادل چھائے ہوئے تھے۔ گھر گھر سے میگھ ملہار کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ لڑکیاں بالیاں جھولے جھول رہی تھیں۔ پینگوں کے مقابلے ہو رہے تھے۔ آم اور پکوان بہار پر تھے اور جمنا چڑھاؤ پر۔ دور دور تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا۔ کچے مکان ڈھے چکے تھے، پکے ڈول رہے تھے۔ مال مویشی اور ساز و سامان سب بہہ گیا۔ لوگ چھتوں اور پیڑوں پر چڑھ گئے۔ کئی ایک بہاؤ کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ہر طرف دُھوم تھی، شور تھا، ساون آیا رے۔

کولی کے راجہ رائے کرن کی بیٹی قلعے کے برج پر کھڑی موسم کے حسین رنگ دیکھ رہی تھی۔ برابر ملکہ جہاں کھڑی تھی۔ پیچھے خواصیں اور خادمائیں تھیں۔ منظر انتہائی نظر فریب اور دلکش تھا۔ جھکی ہوئی گھٹا، گاتی پھوار، نکھرا ہوا سبزہ، اُجلی دُھلی عمارتیں، سانولا سلونا سماں اور اس میں کوکتی کوئلیں، چہکتے پرندے۔ راج کماری اور ملکہ جہاں مبہوت کھڑی تھیں۔ اچانک بجلی زور سے کڑکی۔ ساتھ ہی جھاڑیوں میں سمٹے ہوئے مور چنگھاڑے۔ راج کماری سہم کر پلٹی۔ ملکہ جہاں کے دوسری طرف ایک وجیہہ اور شکیل نوجوان کھڑا تھا۔ لمحہ بھر کو دونوں کی نظریں ملیں اور پھر جھک گئیں۔ اتنی دیر میں کام دیوتا اپنا کام کر چکا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ بالکل ہی انجان۔ لیکن پہلی ہی نظر نے انہیں ایک مضبوط رشتے میں باندھ دیا۔ محبت کے اٹوٹ بندھن میں جکڑ دیا۔ پلک جھپکتے ہی عشق کی ساری منزلیں طے ہو گئیں۔ نوجوان راجپوت، دوشیزہ کے مدھ بھرے کنول لیے نینوں میں کھو گیا اور راج کماری نوجوان کی وجاہت پر لٹ گئی۔ نوجوان ملکہ جہاں سے بات کر کے فوراً ہی لوٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بارش تیز ہو گئی۔ راج کماری اور ملکہ

جہاں بھی برج سے اتر کر اپنے محلوں کو چلی گئیں۔

رات کو جب اسے کسی پہلو قرار نہ آیا اور حسن مجسم کے تصور نے آنکھ نہ لگنے دی تو اس نے اس خواجہ سرا کو بلا بھیجا جو سہ پہر کو برج میں موجود تھا جبکہ راج کماری سیر کر رہی تھی۔ خواجہ سرا آیا تو اس نے بے قراری سے پوچھا۔

"وہ...... وہ لڑکی کون تھی جو امی حضور کے پاس کھڑی تھی؟" فرطِ جذبات سے اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"وہ صاحب عالم......" خواجہ سرا نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ "وہ جس کے بال گھور رات جیسے کالے اور سانپ کی طرح بل کھائے ہوئے تھے اور جس نے نیلی ساڑھی پہن رکھی تھی؟"

"ہاں ہاں، وہی نیلی ساڑھی والی...... جلدی بتاؤ...... وہ کون تھی؟" وہ بے تابی سے بولا۔

"شہزادہ عالم! وہ راج کماری دیول دیوی تھیں۔ کولی کے راجہ رائے کرن کی بیٹی۔" خواجہ سرا نے جواب دیا۔

"دیول دیوی؟" اس کے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"جی ہاں سرکار۔" خواجہ سرا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ہم سمجھ گئے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

خواجہ سرا فرشی سلام کر کے رخصت ہو گیا اور وہ پھر حسین تصورات میں کھو گیا۔

ادھر راج کماری دیول دیوی بے کل تھی۔ کسی طور چین نہ آتا تھا۔ دل اڑان، نگاہیں پریشان تھیں۔ رات کروٹیں بدلتے تمام ہو گئی۔ دن کسی کو ڈھونڈتے گزر گیا۔ عشق کے مریضوں پر رات بھاری ہوتی ہے۔ بارہ بجے کی توپ دغ چکی تھی مگر وہ جاگ رہی تھی۔ صبح کو جب بستر سے اٹھی تو جوڑ جوڑ اور انگ انگ دکھ رہا تھا۔ دیر تک جاگنے سے آنکھیں بوجھل ہو گئی تھیں۔ یہ حالت دیکھ کر ایک ہم راز خواص نے جرأت کی اور راج کماری سے پریشانی اور وارفتگی کا سبب پوچھ ہی لیا۔

"کچھ نہیں نیلما!" راج کماری نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھری اور آہستہ سے کہا۔

"دل میں آگ سی دہک رہی ہے۔"

"اجازت ہو تو ماتا جی سے کہوں؟ شاہی وید بلوا دیں گی۔" نیلما نے تشویش کا اظہار

کیا۔

"میں بیمار تو نہیں۔" دیول دیوی خواص کی سادگی پر مسکرائی۔

"بیمار نہیں تو پھر کیا ہے؟" نیلما نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

"کوئی بات نہیں نیلما۔ تو، تو یونہی گھبرا گئی۔" راج کماری نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

"ہاں، یہ بتا وہ کون تھا جو پرسوں ملکہ جہاں سے باتیں کر رہا تھا؟"

"وہ خلجی راج تارا خضر خاں تھا راج کماری!" خواص نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"خضر خان، ملکہ جہاں کا بیٹا۔" راج کماری دیول دیوی نے زیر لب کہا اور پھر اٹھ کر باہر باغ میں چلی گئی۔ راج کماری دیول دیوی جو کبھی کولی کی رانی تھی اب سلطان علاؤ الدین خلجی کے محل میں تھی اور خوش و خرم تھی۔

اسمتھ کے بیان کے مطابق سلطان علاؤ الدین خلجی نے ہندوستان کے راجاؤں کو مطیع بنانے کے لئے 1294ء میں دکن پر حملہ کیا۔ دیوگری یا دیوگڑھ کے راجہ رام چندر دیو نے مقاومت کی مگر سلطان کی افواج کا مقابلہ نہ کر سکا اور شکست کھا کر سلطان کا فرمانبردار بن گیا۔ سلطان نے خراج کا وعدہ لے کر اس کا ملک اسے ہی بخش دیا۔ 1297ء میں سلطان نے کولی کا رُخ کیا۔ راجہ رائے کرن نے شکست کھائی اور بھاگ کر دیوگری کے شاہ راجہ چندر دیو کے ہاں پناہ لی۔ مالِ غنیمت میں زر و جواہر کے علاوہ انتظام ایک معتمد سردار کے سپرد کر کے علاؤ الدین فوج لے کر آگے بڑھ گیا۔ کئی برس بعد رائے کرن نے رام چندر دیو کی مدد سے گجرات میں پھر اپنا راج پاٹ جما لیا۔

کنول دیوی پہلے تو ایک قیدی رانی کی حیثیت سے سلطان کے لال محل میں رہی لیکن پھر اس کی موہنی صورت اور ستھری سیرت، معاملہ فہمی و نکتہ سنجی نے افغان شہنشاہ کو موہ لیا۔ آخر وہ شاہی حرم میں داخل کر لی گئی۔ کنول دیوی کی بیٹی راج کماری دیول دیوی کولی کے دارالحکومت نہروالا ہی میں رہ گئی تھی۔ رانی کو اپنے جگر گوشے سے بڑی محبت تھی۔ اور اس کے غم میں اُداس رہتی۔ اکثر رویا کرتی۔ سلطان اگر کبھی اُداسی کا سبب پوچھتا بھی تو خوبصورتی سے ٹال جاتی اور اپنا غم ظاہر نہ کرتی۔ دیول دیوی کی جدائی بہر کیف کنول دیوی کے لئے روز بروز جاں گسل بنتی جاتی تھی۔

ایک دن سلطان علاؤ الدین اپنی ہندو ملکہ کنول دیوی کے ساتھ جمنا کی سیر کر رہا تھا۔ یک ملکہ کچھ یاد کر کے رونے لگی۔ پھر غم نے وہ شدت اختیار کی کہ ہاتھ سے صبر کا

دامن چھوٹ گیا۔ سلطان نے دلاسہ دیا۔ ہمدردی اور محبت کا سہارا پا کر جذبات آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ نکلے۔ بادشاہ دُکھ کی دھار کا مقابلہ نہ کر سکا اور انتہائی پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"کنول دیوی! ہم سے دل کا دکھ نہ چھپاؤ۔ بے کھٹکے بیان کرو۔ ہم تمہارا غم دور کرنے کی کوشش کریں گے چاہے ہمیں جان کی بازی ہی کیوں نہ لگانی پڑے۔"

"مہاراج!" کنول دیوی نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ "مجھے دیولا چاہئے عالی جاہ! اپنی بیٹی...... دیول دیوی۔"

اس کی آواز غم کی گہرائیوں میں ڈوب گئی اور آنکھوں سے دُکھ کی دھار تیز ہو گئی۔

سلطان نے ملکہ کی دل جوئی کی۔ اسی وقت اپنے برادر نسبتی الغ خان کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ دیول دیوی کو حاضر کیا جائے۔ الغ خان نے شاہی حکم کی تعمیل میں اپنا سر جھکا دیا اور اگلے دن ایک لشکر جرار لے کر کولی کی طرف باگیں موڑ دیں۔

راجہ رائے کرن نے پھر شکست کھائی۔ جب میدان میں مقابلے کی ہمت نہ رہی تو ناہروالا میں قلعہ بند ہو گیا۔ سلطانی فوج نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ کئی مہینے گزر گئے۔ آخر غذا کے ذخائر ختم ہونے لگے۔ راجہ کو عافیت صلح میں نظر آئی۔ اس نے الغ خان کو صلح کا پیغام بھیجا۔ الغ خان نے دیول دیوی حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ راجہ نے پہلے تو تامل کیا مگر پھر مرتا کیا نہ کرتا، اپنی بیٹی فاتحین کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن رات کو اچانک سنگل دیو (دیوگری کے راجہ) کا چھوٹا بھائی آ پہنچا اور صورتحال پھر بدل گئی راجہ رائے کرن اپنے وعدے سے پھر گیا۔

سنگل دیو، دیوگری کا راجہ تھا۔ وہ رام چندر دیو کی وفات کے بعد گدی پر بیٹھا تھا۔ وہ دیول دیوی کو اپنی رانی بنانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو شادی کا پیغام دے کر بھیجا تھا اور دیول دیوی کے عوض رائے کرن کو امداد اور پناہ دینے کی پیشکش کی تھی راجپوت راجہ ایک مرہٹے کو اپنی بیٹی دینے پر شاید کبھی تیار نہ ہوتا اگر حالات و مصائب کے ہاتھوں عاجز و ناچار نہ ہو گیا ہوتا۔ مسلمان اس کی نظر میں ملیچھ تھے اور مرہٹے ہندو ہونے کی بناء پر مسلمانوں سے بہتر۔ اس نے ملیچھوں پر مرہٹے کو ترجیح دی اور رات کی تاریکی میں ایک مضبوط فوجی دستے کی نگرانی میں دیول دیوی کو دیوگری روانہ کر دیا۔

صبح کو جاسوسوں نے راج کماری کے چلے جانے کی اطلاع الغ خان کو دی۔ علاؤ

الدین کے غضب سے خوف کھا کر الغ خان نے فوراً راجکماری کے تعاقب کا فیصلہ کیا۔ اس نے اسی دم شہر سے محاصرہ ہٹا لیا اور افتاں و خیزاں دیول دیوی کو لے جانے والے دستے کے تعاقب میں چل کھڑا ہوا لیکن دستہ بہت دور نکل چکا تھا۔

کچھ دن اور کچھ راتیں بیت گئیں۔ آخر دیوگری ایک دن کی مسافت کے فاصلے پر رہ گیا۔ بظاہر دیول دیوی کے ہاتھ آنے کی کوئی امید نہ رہی۔ تاہم الغ خان اپنی سعی سے دست بردار نہ ہوا اور تعاقب جاری رکھا۔

مسلسل سفر سے سلطانی فوج تھک کر چور ہو گئی تھی۔ دوپہر کو جب آفتاب کی تمازت بڑھی تو ذرا دم لینے کے لئے ایک ندی کے کنارے سپاہیوں نے اپنی کمریں کھول دیں۔ شاہی فوج کا ایک محافظ دستہ گھومتا پھرتا ایلورا کے غاروں کی طرف جا نکلا۔ لوٹتے ہوئے راہ میں کچھ سپاہی سوار دکھائی دیئے جو بڑی تیزی سے چلے جا رہے تھے۔ شاہی گشتی دستے نے ان پر دیوگری کی فوج سمجھ کر حملہ کر دیا۔ مختصر سی جھڑپ ہوئی۔ آخر سواروں نے شکست کھائی اور وہ تتر بتر ہو گئے۔ ایک بڑی تعداد ہلاک ہو گئی، باقی میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مالِ غنیمت سمیٹتے ہوئے شاہی دستے کے چند سپاہی ایک زخمی گھوڑے کے پاس پہنچے۔ ایک خوبصورت نوجوان گھوڑے کے پاس بے ہوش پڑا تھا۔ سپاہیوں نے جونہی نوجوان پر ہاتھ ڈالا برابر سے ایک زخمی عورت چلائی۔

"خبردار...... یہ دیول دیوی ہے۔ کولی کے راجہ کی سپتری۔ دیکھو راج کمار کی لاج کا دھیان رہے۔"

سپاہیوں نے فوراً ہاتھ روک لیا اور انہیں اپنی اس غیر متوقع یافت پر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ راج کماری کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ لے کر الغ خان کے حضور حاضر ہوئے۔ وہ اسے لے کر دہلی روانہ ہو گیا۔

کنول دیوی اپنی بیٹی کو پا کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے جب اسے چھوڑا تھا تو بچی تھی، اب جوان ہو چکی تھی۔ خوبصورت تھی۔ کنول دیوی نے اسے سینے سے لگا لیا۔ دونوں فرطِ مسرت سے خوب روئیں اور دہلی کے قلعے میں خوش و خرم رہنے لگیں۔

دن گزرتے گئے۔ آخر ساون کا وہ دن بھی آ گیا جب دیول دیوی ملکہ جہاں کے ھ برج میں کھڑی ساون کی لہر دیکھ رہی تھی۔ خضر خان اپنی ماں سے کچھ پوچھنے ادھر آیا۔ دونوں کی نظریں ملیں پھر وہ اپنے بس میں ہی نہ رہے۔

کنول دیوی کو جب یہ معلوم ہوا کہ راجکماری اور ولی عہد ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور پائیں باغ میں چھپ چھپ کر ملتے ہیں تو بہت بگڑی۔ اس نے دیول دیوی کو برا بھلا کہا اور اس پر طرح طرح کی پابندیاں لگا دیں۔ علاوہ ازیں چند رازدار خواتین اس پر متعین کر دیں جو ہر وقت اس کی نگرانی کیا کرتیں۔ مگر محبت کی اپنی راہیں اور اپنے طور طریقے ہوتے ہیں۔ کچھ دن تو مجبوری رہی۔ لیکن پھر وہی نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چوری چھپے ملاقاتیں بھی ہونے لگیں۔ جب ملتے تو ایک دوسرے کو اپنی محبت کا زیادہ سے زیادہ یقین دلاتے۔ غرض یہ کہ محبت عشق و جنون کی حدیں چھونے لگی۔

کنول دیوی کو جوان اُمنگوں کا جلد ہی احساس ہو گیا۔ وہ جان گئی کہ محبت کی راہ پر بڑھے ہوئے قدم کبھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ اس نے دیول دیوی پر لگائی ہوئی تمام بندشیں ایک ایک کر کے ختم کر دیں۔ اب دونوں آزادانہ کنول دیوی کے محل میں ملا کرتے۔ پہروں باتیں کرتے۔ گھنٹوں ساتھ رہتے۔ ساتھ کھاتے، ساتھ سیر کرتے۔ ان کی اس یکجائی و یگانگت کو دیکھ کر کنول دیوی کو یقین ہو گیا کہ اب یہ دونوں کسی طور الگ نہیں رہ سکیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ دونوں کو محبت کے دائمی بندھن، رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا جائے۔ موقع پا کر اس نے علاؤ الدین کے سامنے دونوں کی محبت کا تذکرہ کیا اور اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ ولی عہد خضر خان کی شادی راج کماری دیول دیوی سے کر دی جائے۔

خضر خان کی ماں ملکہ دیوی کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے بیٹے کی شادی کنول دیوی کی لڑکی سے ہو رہی ہے تو وہ بڑی چراغ پا ہوئی۔ اس نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ وہ اپنی بھتیجی اور الغ خان کی لڑکی سے اپنے بیٹے کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس کے بعد محلاتی سازشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جس کے پہلے ہی ریلے میں کنول دیوی کی ساری اُمیدیں بہہ گئیں اور وہ بت بنی سب کچھ دیکھتی رہی۔

مشک کی طرح عشق بھی نہیں چھپا رہتا۔ خضر خان اور دیول دیوی کی محبت کے چرچے بڑھتے بڑھتے ملکہ جہاں کے کانوں تک بھی جا پہنچے۔ ملکہ عالیہ کے حکم سے دیول دیوی ''لال محل'' سے دور بھیج دی گئی۔ مگر بے سود۔ خضر خان پھر اس سے ملتا رہا۔ ملکہ کو دم دم کی خبریں پہنچتی تھیں۔ آخر اس نے اپنے بیٹے کی شادی اپنے بھائی کی بیٹی سے کرنے کا اعلان کر دیا اور شہنشاہ کو مجبور کیا کہ فوراً تقریب سعید کے انعقاد کا اہتمام کرے۔ خضر خان ماں کی بالادستی کے آگے بے بس ہو گیا اور بادل نخواستہ اس کے فرمان کے سامنے اپنا سر

جھکا دیا۔

1313ء کے شروع میں خضر خان کی شادی ماموں زاد بہن سے ہو گئی۔ ملکہ جہاں بھتیجی کو اپنی بہو بنا کر بہت خوش تھی لیکن دیول دیوی اور کنول دیوی پر قیامت گزر گئی۔ صبر و شکر کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ دونوں نے بظاہر بہت خوش دلی سے تقریب میں بھی شرکت کی۔

شادی کے بعد بھی خضر خان دیول دیوی کو اپنے دل سے نہ نکال سکا۔ وہ اب بھی اس کے اعصاب پر بدستور چھائی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دن تو صبر یا جبر کئے رہا، پھر اس نے لال محل کے داروغہ سے سازباز کی، اسے انعام و اکرام کا لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ دیول دیوی کو بے روک ٹوک محل میں آنے دے تاکہ پائیں باغ کے کنجوں میں ملاقات ہو سکے۔ دونوں کی ملاقاتیں پھر شروع ہو گئیں۔ کبھی دن کو اور کبھی رات کو۔

وہ چاند کی غالباً چودھویں رات تھی۔ پائیں باغ میں چھاجوں نور برس رہا تھا۔ خضر خان اور دیول دیوی نہر کے کنارے دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ فضا ...ے اور رات کی رانی کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ ملکہ جہاں باغ کی سیر کرتی وہاں پہنچ گئی۔ اس نے دور ہی سے دونوں کو پہچان لیا اور راستہ کاٹ کر واپس محل میں آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے خضر خان کو بلا بھیجا۔ خضر خان کو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ملکہ ...ل اسے باتیں کرتا دیکھ گئی ہے۔ اس نے ماں کے استفسار پر فوراً ہی اقرار کر لیا کہ وہ دیول دیوی سے باتیں کر رہا تھا۔

''آئندہ میں تمہیں اس چھوکری کے ساتھ نہ دیکھوں۔'' ملکہ جہاں گرجی۔

''امی جان!'' شہزادے نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ ''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ ......''

''مگر کیا......؟'' وہ شاہانہ تمکنت سے بولی۔

''مگر یہ کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' خضر خان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

''خضر! تم اس سے اتنی محبت کرتے ہو؟'' ملکہ جہاں اپنے بیٹے کی حالت پر پسیج چکی تھی۔ خضر خان نے اقرار میں سر جھکا دیا۔ ملکہ جہاں نے محبت میں تڑپتے دل کی دھڑکن سنی۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ خضر خان کو دیول دیوی سے بے پناہ محبت ہے۔ پھر عورت کی حیثیت سے اس نے دیول دیوی کے جذبات کا اندازہ کیا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس

ہو گیا۔ وہ مان گئی کہ خضر خان کو اس کی بھتیجی سے شادی کر کے کوئی خوشی نہیں ہوئی بلکہ اس کے پیارے بیٹے کی زندگی تلخ اور ویران ہو گئی ہے۔ ایک طویل جذباتی کشمکش کے بعد اس نے بھی محبت کی بے پناہ قوت کے سامنے سر جھکا دیا اور وہ دیول دیوی کو بہو بنانے پر راضی ہو گئی۔

اپنے ماموں کی بیٹی سے شادی کے چند ماہ بعد خضر خان نے ملکہ جہاں اور علاؤ الدین کی موجودگی میں دیول دیوی سے شادی کر لی۔ کھوئی ہوئی مسرتیں لوٹ آئیں۔ ملکہ جہاں مسرور تھی مگر الغ خان اور اس کے کنبے پر قیامت گزر گئی۔ کنول دیوی پھولے نہ سماتی تھی۔

عرصے کے بعد سلطان بیمار ہوا۔ دربار میں تخت نشینی کے سلسلے میں سازشیں شروع ہو گئیں۔ ملک کافور حبشی اپنی عسکری اور انتظامی قابلیتوں کی وجہ سے سلطان کا معتمد خاص تھا۔ اس کا دربار میں بھی بڑا اثر و رسوخ تھا۔ سلطان پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ اس نے 1309ء میں دکن پر حملہ کیا اور الفنسٹن اور اسمتھ کے بیان کے مطابق 1312ء تک ورنگل، دیوگری اور بیلال یا ہوسلا کی حکومتیں زیر کر کے انہیں سلطان کا دائمی باج گزار بنا دیا تھا۔ اس لئے سارا دربار اس کا بڑا احترام کرتا تھا۔ سلطان کی صحت کمزور ہوئی تو سیاسی امور پر بھی اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی۔ درباری سازشوں نے ملک کافور کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس نے بھی ہندوستان پر حکمرانی کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے۔ اس نے خضر خان اور الغ خان کے خلاف سلطان کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ اس نے بتایا کہ خضر خان اپنے خسر الغ خان کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے اور الغ خان شہزادے کی کم عمری اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھا کر خود دِلّی کے تخت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ بیماری نے سلطان کو شکی اور چڑچڑا بنا دیا تھا۔ شامت اعمال انہی دنوں ملکہ جہاں نے یہ تجویز پیش کر دی کہ شادی خان کا نکاح الغ خان کی دوسری لڑکی سے کر دیا جائے۔ اس سے سلطان کا شبہ یقین میں بدل گیا۔

علاؤ الدین خلجی بڑا سخت گیر حکمران تھا۔ اس نے تمام مشتبہ افراد فوراً گرفتار کرا لئے۔ ملکہ جہاں لال محل کی ایک سہ دری میں نظر بند کر دی گئی۔ الغ خان کا سر قلم ہوا۔ شہزادہ شادی خان اور ولی عہد خضر خان پابجولاں گوالیار کے قلعہ میں بھیج دیئے گئے۔ دیول دیوی نے اس پُر آشوب وقت میں خضر خان کی رفاقت کو نہ چھوڑا۔ اگرچہ اس کی ماں کنول دیوی اور دوسرے بہی خواہوں نے بہتیرا سمجھایا مگر وہ نہ مانی اور ایک وفا پرست بیوی کی طرح

خاوند کے ساتھ گوالیار چلی گئی۔ اس نے رضا کارانہ طور پر قید و بند کی مصیبتوں کا دروازہ اپنے اوپر کھول لیا۔ بے شک اسے خضر خان سے لازوال محبت تھی۔

فرشتہ کے بیان کے مطابق ملک کافور نے علاؤ الدین کی وفات کے دوسرے دن شہزادہ شادی خان کو گوالیار کے قلعہ میں اندھا کرا دیا۔ اس نے حکم تو دونوں شہزادوں کو اندھا کرنے کا دیا تھا لیکن دیول دیوی کی گریہ و زاری اور کنول دیوی کی طرف سے انعام و اکرام کے لالچ نے جلاد کو ملک کافور کے حکم کی تعمیل سے باز رکھا اور اس نے بکرے کی آنکھیں لے جا کر مدار المہام (ملک کافور) کو پیش کر دیں۔

ملک کافور نے دربار میں سلطان کا ایک جعلی وصیت نامہ پیش کر کے نابالغ شہزادے کو تخت پر بٹھا دیا اور اس طرح سے خود امورِ سلطنت انجام دینے لگا۔ لیکن جلد ہی اسے اپنے کئے کی سزا مل گئی۔ خضر خان کے چھوٹے بھائی مبارک شاہ نے اس کے خلاف بغاوت کی اور تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس نے ملک کافور اور شادی خان کو فی الفور قتل کرا دیا اور ان سرداروں کو قید کر لیا جن سے ذرا بھی بغاوت کا اندیشہ تھا۔

دیول دیوی ایک عصمت مآب و وفا شعار بیوی کی طرح مصائب و آلام میں اپنے شوہر کی رفیق و دمساز تھی۔ وہ اس کی خدمت میں راحت محسوس کرتی۔ خضر خان اس کی رفاقت و محبت میں تمام مصائب و آلام کو بھولا ہوا تھا کہ ایک دن اسے مبارک شاہ کا حکم ملا کہ دیول دیوی بلا تاخیر اس کے حوالے کر دی جائے ورنہ اس کا وہی انجام ہو گا جو ملک کافور اور شادی خان کا ہوا تھا۔ جب دیول دیوی کو سلطان دہلی کے حکم کی اطلاع ملی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اپنے شوہر کے پاؤں پکڑ لئے۔ اس نے شدتِ غم سے کانپتی تھرتھراتی آواز میں کہا۔

"مجھے اپنے ہاتھوں مار دیجئے سرتاج! لیکن مبارک شاہ کے حوالے نہ کیجئے۔"

خضر خان کا دل بھی بھر آیا۔ اس نے دیول دیوی کو دلاسا دیا، پیار کیا، اپنے دامن سے اس کے آنسو پونچھے اور کہا۔ جب تک خضر خان زندہ ہے، دیول دیوی کو کوئی نہیں لے جا سکتا۔

شوہر کے اس عزم بالجزم پر مظلوم عورت خوش ہو گئی۔ خضر خان کے جواب پر مبارک شاہ نے برافروختہ ہو کر اس کی آنکھیں نکلوا دیں۔ یہ 1312ء کا واقعہ ہے۔ پھر وہ تین برس تک سلطنت کے استحکام اور دوسرے سیاسی امور میں مصروف رہا اور دیول دیوی اسے یاد

نہ آئی۔

1319ء میں مبارک شاہ نے پھر پیغام بھیجا کہ دیول دیوی کو فوراً طلاق دے کر دہلی بھیج دیا جائے۔ خضر خان نے اسے صاف کہلا بھیجا کہ دیول دیوی اسے کبھی نہیں مل سکتی۔ مبارک شاہ نے جھلا کر حکم دیا کہ خضر خان کو قتل کر دیا جائے اور اس کی بیوی ہمارے حضور حاضر کی جائے۔

صبح کا وقت تھا۔ نماز و دُعا کے بعد دیول دیوی بیٹھی اپنے محتاج شوہر کے پیر داب رہی تھی۔ چند آدمی ننگی تلواریں لئے سہ دری میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے شاہی فرمان پڑھ کر سنایا۔ نابینا خضر خان نے دو رکعت نماز پڑھنے کی مہلت طلب کی لیکن جلاد نہ مانا اور تلوار کے ایک ہی وار میں اس کی گردن اُڑا دی۔ دیول دیوی لاش کے قدموں سے لپٹ کر بے ہوش ہو گئی جلاد اور اس کے ساتھی باہر چلے گئے۔

دوپہر کو جب وہ دیول دیوی کو دہلی لے جانے کے لئے پھر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ خضر خان کے پہلو میں ایک اور لاش پڑی ہے۔ ایک حسین و جمیل عورت کی لاش۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا اور سر خضر خان کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ یہ دیول دیوی تھی...... کولی کے راجہ رائے کرن کی بیٹی...... ہاں! کولی کے راجہ...... رائے کرن کی بیٹی!“

سریتا دیوی کی آواز سسکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا پورا چہرہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔ اتنا گہرا سرخ ہو رہا تھا جیسے سارے بدن کا خون چہرے پر سمٹ آیا ہو۔ میں اور روپالیہ چونک پڑے تھے......!

※☆※

کھنڈرات سحر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہم اسی پراسرار تہہ خانے میں کھڑے ہوئے تھے جہاں میری ملاقات ستنام سے ہوئی تھی۔ رانی کے تصور میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ میں اس تہہ خانے میں بہت کچھ کر چکا ہوں۔

”دیول دیوی......“ رانی کی آواز ابھری۔ پھر وہ خاموش ہو گئی۔ ”اس کا محبوب خضر خان اسی کھنڈر میں جو اس وقت کھنڈر نہیں تھا...... ٹھہرو میں تمہیں دکھاتی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ......“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی تو روپالیہ نے سرگوشی کی۔

”ہردیپ!“

”ہوں؟“

”میرا دل گھبرا رہا ہے۔ چلو یہاں سے پلیز۔ یہ بڑی عجیب جگہ ہے۔“

”آؤ......“ رانی کی آواز ابھری۔

”ہردیپ، پلیز......“ روپالیہ نے کہا۔

”آؤ روپالیہ...... آؤ......“ میں نے کہا۔

”مگر ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”تاریخ کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے لئے۔“ میری بجائے سریتا دیوی نے کہا۔ میں نے اس کی آواز میں ایک کرختگی محسوس کی تھی۔

”ہردیپ، مجھے یہاں سے لے چلو۔“ روپالیہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ رانی اس دوران ایک پراسرار دروازہ کھول چکی تھی۔ اس نے رُک کر ہمیں گھورا، پھر بولی۔

”آؤ......“

ایک لمحے کے لئے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پراسرار قوت ہمیں آگے دھکیل رہی ہو۔ ہم اس دروازے کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ یہاں نیم تاریک ماحول تھا لیکن رانی سریتا دیوی ہمارے پیچھے اندر آئی اور پھر اس نے نجانے کیا، کیا کہ کمرے میں ایک عجیب و

غریب روشنی پھیل گئی۔ اسے کمرہ نہیں بلکہ ایک ہال کہا جا سکتا تھا۔ اب اس روشنی میں یہ وسیع و عریض ہال مکمل طور سے نمایاں نظر آ رہا تھا۔ میری اور روپالیہ کی نگاہیں ہال میں بھٹکنے لگیں۔ ہال میں دو تابوت رکھے ہوئے تھے۔ سفید رنگ کے تابوت۔ اور ان دونوں تابوتوں کے درمیان ایک عجیب و غریب مجسمہ ایستادہ تھا۔ وہ مجسمہ بھی غالباً سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا، سفید براق۔ لیکن یہ بے نقش تھا۔ اس کا چہرہ نقوش سے عاری تھا۔ ہمارے قدم جس طرح آگے بڑھے تھے وہ بالکل کسی سحر کی داستان معلوم ہوتی تھی۔ میں بھی ایک لمحے کے لئے عجیب و غریب کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ تب رانی نے دونوں ہاتھ بلند کئے اور انہیں سر سے اونچا اٹھا کر زور سے نیچے کی طرف جھٹکا۔ روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور سنگ مرمر کا سفید مجسمہ اچانک ہی رنگ بدلنے لگا۔ اب وہ مختلف رنگوں میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔

سریتا ہماری جانب مڑی۔ اس کا چہرہ اب بہت خوفناک ہو گیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے پورے چہرے سے خون ٹپک پڑے گا۔ اس کی آواز بھی تبدیل ہو گئی۔ آنکھیں شیشے کی گولیوں کی طرح چمکنے لگیں۔ پھر اس کے منہ سے ایک سحر زدہ آواز نکلی۔

”میں دیول دیوی ہوں...... رائے کرن کی بیٹی دیول دیوی۔ میرے ساتھ تاریخ نے ظلم کیا ہے۔ لیکن میں نے اس ظلم کو قبول نہیں کیا۔ خضر خان مر گیا لیکن میں اپنے دل کی دنیا ویران نہیں دیکھ سکتی تھی۔ سچی پریمی تھی میں۔ سنسار نے میرے ساتھ انیائے کیا تھا۔ میں نے سنسار کے ساتھ انیائے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنی آتما کو بھسم ہونے سے روک دیا۔ میں نے اپنے شریر کو بھی بھسم نہ ہونے دیا اور آتما کا سہارا لے کر وہاں سے چل پڑی۔ اور اس کے بعد میں نے سنسرانی سے مدد مانگی۔ سنسرانی مہاراج سنسار کے بہت بڑے رشی تھے۔ پہلے تو میری بات نہ مانی انہوں نے لیکن پھر انہوں نے کہا کہ دیوی! بڑا انتظار کرنا پڑے گا تجھے۔ یگ بیتانے پڑیں گے۔ میں نے کہا مہاراج، شما کر دیں مجھ پر۔ تب انہوں نے مجھے ایک سمے دے دیا۔ لیکن ایک شرط رکھی میرے سامنے اور وہ شرط میں اب پوری کرنے جا رہی ہوں۔ تم دونوں کو ہمارا پریم سپھل کرنے کے لئے اپنی بلی دینی پڑے گی، سمجھے۔ بلی دو گے تم سنسرانی مہاراج کے چرنوں میں۔ تب سنسرانی مہاراج خضر خان کو وہ جیون دے دیں گے جو اس سے چھین لیا گیا تھا، سو سال کا جیون اور مجھے بھی۔ ہم سو سال جئیں گے۔ ہمیں معاف کرنا، تمہارا کام یہی تھا۔ تم یہاں

تک آ گئے، بس اب یہی سب کچھ ہو گا۔ ہمیں شما کر دینا...... شما کر دینا ہمیں۔“ یہ کہہ کر رانی نے دونوں ہاتھ فضا میں پھیلائے اور اس کے ہاتھ میں دو کٹاریں آ گئیں، چمچماتی ہوئی۔ یہ کٹاریں ہاتھ میں پکڑ کر وہ سنسرانی کے سامنے رقص کرنے لگی۔ دیواروں سے ایک مدھم موسیقی اُبھر رہی تھی اور میں سحر زدہ کھڑا ہوا تھا۔ روپالیہ پر تو غشی طاری ہو رہی تھی۔ رانی کا رقص انتہائی خوفناک ہوتا چلا گیا۔

پھر طوفانی انداز میں رقص کرتی ہوئی وہ روپالیہ کی طرف دوڑی اور اس نے دونوں کٹاریں اس طرح پکڑ لیں کہ بس ایک لمحہ جا رہا تھا کہ روپالیہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی۔ لیکن اسی وقت دھائیں، دھائیں، کی آوازیں اُبھریں اور رانی کے بدن میں چار پانچ سوراخ ہو گئے...... وہ گولیاں اسی غار میں کسی پوشیدہ جگہ سے چلائی گئی تھیں!

تبھی رانا جسپال ایک بڑی سی چٹانی مورتی کے پیچھے سے نکل آیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھے اور چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ رانی کے ہاتھ سے کٹاریں گر گئی تھیں اور وہ حیرت سے اپنے بدن کے زخموں سے اُبلتے ہوئے خون کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے حیرت سے رانا جسپال کو دیکھا اور اس کے بعد چت زمین پر گر پڑی۔ اس کے منہ سے پہلے سرخ اور اس کے بعد کالا خون بہنے لگا اور اس کے حلق سے خوفناک غرغراہٹیں اُبھرنے لگیں۔

سنگ مرمر کا مجسمہ جسے وہ سنسرانی کا مجسمہ کہہ رہی تھی، اچانک ہی موم کی طرح پگھلنے لگا اور اس پگھلے ہوئے موم نے رانی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ لوگ حیرت سے اس تعجب خیز منظر کو دیکھ رہے تھے اور میں خود بھی ششدر تھا۔ میرے سامنے یہ ساری سنگین داستان بکھری پڑی تھی۔ یہاں تک کہ رانی کا جسم موم کی لپیٹ میں آ گیا اور اس کے بعد یہ موم زمین پر پانی کی طرح بہہ گیا۔ اب نہ وہاں مجسمے کا وجود تھا، نہ رانی کا۔

دفعتہً ہی روپالیہ کی ہلکی سی کراہ سنائی دی۔ رانا جسپال اگر روپالیہ کو اپنے بازوؤں میں نہ جکڑ لیتا تو وہ زمین پر گر جاتی اور اسے چوٹ بھی لگ سکتی تھی۔ رانا جسپال گہری گہری سانسیں لے کر روپالیہ کو سنبھالنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

”بیٹے! کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟ میں بھول گیا۔“

”خاقان جمشیدی۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا روپالیہ کو اس تہہ خانے سے نکالنے میں تم میری کچھ مدد کرو گے؟“ وہ بولا۔

"ہاں آیئے۔" میں نے کہا اور اس کے بعد اس کھنڈر کے خوفناک تہہ خانے سے باہر نکل آئے۔ لیکن بے ہوش روپالیہ کو آسانی سے لے جانے کا بندوبست نہیں ہو سکتا تھا۔ باہر آنے کے بعد میں نے رانا جسپال سے کہا۔

"کیا آپ کے پاس کوئی انتظام ہے؟ میرا مطلب ہے انہیں لے جانے کا؟"

"میرے پاس ایک بہت بڑی جیپ ہے مگر وہ ذرا فاصلے پر کھڑی ہوئی ہے۔" رانا جسپال نے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں ہے، میں انہیں اٹھا کر وہاں تک لئے چلتا ہوں۔"

رانا جسپال نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے لیکن پھر خاموش ہو گیا۔ اس کے علاوہ چارہ کار بھی کچھ نہیں تھا۔ ویسے بھی میں اس وقت کوئی تکلف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ روپالیہ سے میرا کوئی ذہنی رشتہ تھا ہی نہیں۔ یہ تو بس ایک کھیل تھا جو رانی کھیل رہی تھی اور کھیل ختم ہو گیا تھا۔ میں نے روپالیہ کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور اس کے بعد فاصلہ طے کر کے جیپ تک پہنچ گیا۔ رانا جسپال ایک عجیب سی کشمکش کا شکار تھا۔ روپالیہ کو جیپ میں لٹا دیا گیا۔ رانا جسپال اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"اب کیا کریں...... یہ بتاؤ۔"

"کیا آپ حویلی جانا پسند کریں گے؟"

"کیا اس کے بعد حویلی جانے کی گنجائش ہے؟" رانا جسپال نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

"اس طرف تو رُخ کر کے تھوکنے کی بھی گنجائش نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ ویسے خاقان جمشیدی! تم ایک آئیڈیل نوجوان ہو۔ وقت اور تقدیر نے ہمیں جن راستوں پر لا ڈالا ہے وہ راستے بہت عجیب ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کاش! تم ایک ہندو نوجوان ہوتے...... کاش......" رانا جسپال کچھ لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا، پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "تو میں تم سے ہاتھ جوڑ کر بنتی کرتا کہ میری بیٹی کو سویکار کر لو۔ اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کر دیتا۔ سب کچھ دے دیتا تمہیں۔ میرے پاس روپالیہ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ روپالیہ ہوش میں آنے کے بعد اور حقیقت معلوم ہونے کے بعد کیا کرے گی، کیا سوچے گی۔ کیسے اپنے آپ کو سنبھالے گی۔" اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر میرا چہرہ دیکھا۔ غالباً یہ

اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے ان الفاظ نے مجھے کتنا متاثر کیا ہے۔ متاثر تو میں ہوا تھا۔ ظاہر ہے ایک باپ کی پریشانیاں ایک حقیقی شکل رکھتی تھیں۔

روپالیہ میرے بارے میں ضرور سوچے گی۔ ویسے بھی مجھے اس کی فطرت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ ایک سنجیدہ سی جذباتی لڑکی تھی اور اندازہ یہی ہوتا تھا کہ مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔ جب اسے حقیقت کا علم ہو گا تو ہو سکتا ہے وہ لڑکی ہی کے انداز میں سوچے۔ لیکن یہ رانا صاحب جو کہانی مجھے سنا رہے تھے اس کی گہرائی کا بھی مجھے اندازہ تھا۔ رانا صاحب ان تمام باتوں کو اور لینے دینے کے تذکرے کو غالباً مجھے رجھانے کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ قصور ان کا بھی نہیں تھا۔ نوجوان بھٹک جاتے ہیں۔ اتنی دولت کے ساتھ لندن کی رہائش کو کون ناپسند کرتا؟ دین دھرم الگ چیز ہے، کبھی کبھی سب کچھ قربان کر دیا جاتا ہے۔ یہی سوچ ہو گی ان کی۔ لیکن وہ بیچارے کیا جانتے تھے کہ خاقان جمشیدی کا ماضی کیا ہے۔ اتنی بڑی دولت کم از کم خاقان جمشیدی کے سامنے بے حقیقت ہے۔ بہرحال یہ ان کی اپنی سوچ تھی۔ میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر میں نے رانا جسپال سے پوچھا۔

"تو پھر آپ کا کیا ارادہ ہے رانا صاحب؟"

"بس میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تم جہاں چاہو اتر سکتے ہو۔ حویلی جانا چاہو تو میں تمہیں حویلی چھوڑ دوں گا اور ایک پیشکش میں ضرور کر رہا ہوں تمہیں۔ اگر میرے ساتھ انگلینڈ چلنا چاہو تو میں مکمل ذمے داری لیتا ہوں تمہیں وہاں تک لے جانے کی اور ہر طرح کی آسائش اور سہولت بہم پہنچانے کی۔ باقی تم جیسا پسند کرو۔"

"نہیں رانا صاحب! مجھے یہیں رہنا ہے۔ آپ بالکل فکر نہ کیجئے، آپ جہاں جانا چاہیں جائیں۔ بس مجھے آبادی کے پاس اتار دیجئے گا۔"

رانا نے افسردہ نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر بولے۔ "لندن آؤ تو مجھ سے ضرور ملنا۔"

"جی۔ یہ وعدہ کرتا ہوں آپ سے۔"

رانا صاحب نے پھر مجھے آبادی کے پاس اتار دیا۔ میں ان سے رخصت ہو کر چل پڑا۔ روپالیہ بدستور بے ہوش تھی۔ ویسے سچی بات یہ ہے کہ روپالیہ سے مجھے اتنا زیادہ ذہنی لگاؤ ہوا بھی نہیں تھا اور پھر اگر ہوتا بھی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں کوئی مذہبی آدمی نہیں تھا۔ یہ جملے کہتے ہوئے میں فخر سے گردن نہیں اٹھا

رہا۔ انسان کسی بھی دین کو اپنائے، اسے دین دار ہونا چاہئے۔ یہی اس کے ٹھوس وجود کا ثبوت ہوتا ہے۔ لیکن میرا تو حلیہ ہی بگڑ کر رہ گیا تھا۔ نام تھا خاقان جمشیدی۔ کچھ پراسرار قوتیں مجھے مہتر بدھ، بدھی نمو، نموستی اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ بنانے پر تلی ہوئی تھیں۔ رانا صاحب مجھے ہندو دھرم کی پیشکش کر رہے تھے۔ بس چوں چوں کا مرتبہ شاید اسی کو کہتے ہیں جو میں بنایا جا رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے کوئی بنا نہیں سکا تھا۔ غرض یہ کہ رانا صاحب سے الگ ہونے کے بعد میں نے بہت سی باتیں سوچیں۔ پیدل چل پڑا۔ چلتا رہا اور طویل فاصلہ طے کر کے چندی گڑھ کے ایک نواحی علاقے میں پہنچ گیا۔

کولی کے کھنڈرات اب پیچھے رہ گئے تھے۔ نواحی علاقہ کسی قدر دیہاتی ماحول پر مشتمل تھا۔ تھوڑے سے پہاڑی راستے بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک چھپر ہوٹل کے اندر جا بیٹھا۔ یہاں سے اس پہاڑی درّے کا نظارہ ہوتا تھا جو کہیں دور جا نکلتا تھا۔ اس جھونپڑا ہوٹل میں بیٹھ کر میں نے چائے وغیرہ پی اور یہ سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ بہرحال ایک انگریز افسر کا قاتل ہوں اور انگریزوں کا مطلوب۔ اگر اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہوں تو صورتحال خراب بھی ہو سکتی ہے۔

بہرحال یہ شاطر قوم اپنے دشمن کو بھولتی نہیں ہے۔ مجھے بھی بھلایا نہیں جا سکا ہوگا کیونکہ میرے ہاتھوں انہیں بدترین زک پہنچی ہے۔ سیتا گڑھی کا رُخ کروں تو عین ممکن ہے کہ پولیس وہاں مجھے تلاش کرے۔ پھر کیا کرنا چاہئے؟ خیر اس کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ انگلینڈ واپس چلا جاؤں ورنہ رانا جسپال کی پیشکش سب سے بہتر تھی۔

نجانے کب تک اسی طرح بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر ذہن پر ایک عجیب سی کیفیت سوار ہوئی۔ ہوٹل سے اٹھ آیا اور اس درّے میں چلنے لگا جو سامنے نظر آ رہا تھا۔ وہاں پگڈنڈی نما راستہ بڑا خوبصورت تھا۔ دیکھوں کہاں پہنچتا ہوں۔ چنانچہ چلتا رہا اور کافی دور نکل آیا۔ پھر ایک چھوٹی سی آبادی نظر آئی۔ کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ غالباً کوئی گاؤں تھا۔ میں وہاں پہنچ گیا۔ گاؤں سے تھوڑے فاصلے پر وہی درّہ نما راستہ آگے کو جاتا تھا۔ یہاں میں نے ایک پڑاؤ دیکھا۔

سفید اور گیروے لباس میں ملبوس گھٹے ہوئے سر والے کوئی سو ڈیڑھ سو افراد وہاں موجود تھے۔ میرے قدم ان کی جانب اٹھ گئے اور پھر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ بدھ مت کے پیروکار ہیں اور ہندوستان میں کسی بدھ زیارت گاہ کی سیر کو آئے ہیں اور یہ بدھ زیارت

گاہ یہیں چندی گڑھ کے نواح میں تھی۔ میں نے آبادی کی جانب دیکھا، بہت سے خوانچہ بردار یہاں خرید و فروخت کر رہے تھے۔ بدھ زیارت گاہ داہنی سمت ایک ڈھلان میں اترنے کے بعد تھی۔ کافی بڑی اور پرانی عمارت بنی ہوئی تھی۔ مجھے ہنسی آنے لگی۔ غیر متوقع طور پر یہ بدھ گروہ نظر آیا تھا اور مجھے وردان سادھانی، سیوک سندھورتی، ماشرہ اور نجانے کون کون یاد آنے لگا تھا۔ وہ بھوج پتر تو اس طرح غائب ہو گیا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ لوگ مجھ سے مایوس ہو کر میری طرف سے بددل ہو گئے ہوں۔ اب تو طویل عرصے سے کسی نے میری جانب رخ نہیں کیا تھا۔ غرض یہ کہ میرے قدم خود بخود ان کی جانب اٹھ گئے۔ ویسے بھی بستی کے ہندو اور ممکن ہے مسلمان نوجوان یہاں موجود ہوں۔ کیونکہ مقامی لوگوں کو بھی میں ان کے درمیان گھومتے پھرتے دیکھ رہا تھا۔

پھر میرے دل میں خیال آیا کہ ذرا دیکھوں تو سہی بدھ عبادت گاہ میں کیا ہو رہا ہے۔ میں اس جانب چل پڑا۔ بدھ خانقاہ بہت قدیم بنی ہوئی تھی اور وہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ ترنت مادھو کی خانقاہ ہے۔ اب ترنت مادھو کا جغرافیہ کیا تھا اس بارے میں تو خیر مجھے کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ میں اس خانقاہ میں داخل ہو گیا اور وہاں بدھ مت کے پیروکاروں کی کارروائیاں دیکھتا رہا۔ میری طرف کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ بدھ بھکشو اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

خانقاہ خاصی وسیع و عریض تھی۔ مختلف علاقوں کا جائزہ لیتا ہوا میں اس بڑے ہال میں پہنچ گیا جہاں بہت سے بھکشو سجدہ ریز تھے۔ سامنے ہی مہاتما بدھ کا عظیم الشان مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ وہ سب وہاں عبادت کر رہے تھے۔ میں ان کے طریقۂ عبادت کو دیکھتا رہا اور مجھے یوں لگا جیسے وہاں دُھند سی پھیلتی جا رہی ہو۔ اس دُھند میں گھٹن بالکل نہیں تھی۔ بس دُھند تھی۔ خالی دُھند۔ میں نے وہاں سے نکل آنا چاہا لیکن دُھند نے اس طرح تسلط قائم کیا کہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

پھر اچانک ہی یہ دُھند میرے دماغ میں داخل ہونے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا سر چکرا رہا ہو۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ یہ کیا قصہ ہے؟ میں نے خود سے سوال کیا لیکن بس یہ میرا اپنے ذہن سے آخری سوال تھا۔ اس کے بعد میرے حواس اس طرح گم ہوئے کہ مجھے دنیا کی کچھ خبر نہ رہی۔ بے

خبری کا یہ عالم نجانے کتنا طویل تھا۔ اور جب حواس جاگے تو بہت سے احساسات نے گھیر لیا۔ میری نگاہوں نے ماحول سے روشناس ہونے کی کوشش کی۔

سب سے پہلے چھت نظر آئی اور میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ چھت پر انتہائی خوبصورت نقوش کندہ تھے اور ان کی تراش اس قدر حسین تھی کہ آنکھیں چکا چوند ہو جائیں۔ چھت پر کندہ نقوش میں ہیرے جڑے ہوئے تھے جن کی مدھم مدھم روشنیاں چاروں طرف رنگین شعاعوں کی شکل میں بکھری ہوئی تھیں۔ قوس وقزح کا یہ حسین امتزاج پہلے ہی مرحلے میں دل و دماغ کو عجیب سی فرحت بخشتا تھا۔ وہاں سے نگاہ ہٹی تو دیواریں نظر آئیں۔ حریری پردے پڑے ہوئے تھے اور ان پردوں پر تراشے ہوئے ہیروں کی لڑیاں جھول رہی تھیں۔ کسی خواب کا سا منظر معلوم ہوتا تھا۔ ہشمان ذکری کا محل، دولت اور امارت بہترین مثال تھا لیکن اُس پورے محل کی قیمت صرف چھت میں جڑے ہوئے ہیروں سے ادا کی جا سکتی تھی۔ اس کمرے کا ماحول تو نجانے کیا تھا۔ ہیروں کے طاؤس، خوبصورت مجسمے جو دمک رہے تھے اور ایک نگاہ دیکھنے سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ سونے کے بنے ہوئے ہیں۔ پھر ان مجسموں کے گلوں میں پڑی ہوئی مالائیں اور ان کے سارے وجود میں جڑے ہوئے ہیرے، حسین برتن، یہ سونے اور ہیروں کا ایک ایسا امتزاج تھا کہ انسانی دماغ کام کرنا چھوڑ دے۔ میں نے اپنے جسم کو محسوس کیا تو ایک دم مجھے اندازہ ہوا کہ میں بالکل صحیح سالم حالت میں ہوں۔ جس مسہری پر میں لیٹا ہوا تھا وہ بھی سونے کی بنی ہوئی تھی اور اس میں ہیروں کے نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ بہت ہی موٹا رُوئی کا گدا تھا جو میرے بدن کے نیچے تھا۔

میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس پورے کمرے کے ماحول کو وحشت زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہے۔ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور دبیز قالین پر کھڑا ہو کر چاروں طرف کا جائزہ لیتا رہا۔ تبھی چمپا کی وہ مانوس خوشبو میری ناک سے ٹکرائی اور میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔

مجھے یاد آ گیا کہ میں چندی گڑھ کی ایک نواحی بستی میں ایک بدھ خانقاہ میں گیا تھا جہاں یہ صورتحال پیش آئی۔ چمپا کی خوشبو نے میرے حواس قائم کر دیئے تھے اور میں سب کچھ سمجھتا جا رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ ایک بار پھر میں اسی طلسم ہوشربا میں داخل ہو گیا ہوں۔ سونے کی ایک منقش تپائی پر بھوج پتر رکھا ہوا تھا۔ یہ بہت عرصے کے بعد

میرے سامنے آیا تھا۔ میں دور کھڑا اسے گھورتا رہا، پھر آہستہ آہستہ میرے قدم بھوج پتر کی جانب اٹھ گئے۔ میں نے اسے اٹھایا اور دیکھنے لگا۔ اس پر ایک تصویر ابھری ہوئی تھی۔ یہ میرا ہی چہرہ تھا لیکن اس میں ایک حسین وجمیل لباس میں ملبوس سر پر تاج پہنے کھڑا تھا۔ اپنی یہ ہیئت دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔

"واہ، اس کا مطلب ہے کہ اب مجھے کسی ملک کی سلطنت ملنے والی ہے۔ مگر راجاؤں، بادشاہوں کا دور تو انگریزوں نے ختم کر دیا۔ اب تو وہ بڑی بری حالت میں اور بڑی کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ پھر یہ کون سے ملک کی مملکت ہے جو مجھے ملنے والی ہے؟ لیکن ایک بات کا یقین تھا کہ بھوج پتر پر جو کچھ نمودار ہوتا ہے اب تک تو سچ ہی ہوتا رہا ہے۔ میرا دل چاہا کہ اس بھوج پتر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دوں۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا اور اسے واپس اس کی جگہ رکھ دیا۔

بہر حال مملکت تو مل گئی تھی۔ یہ جو کچھ میری نگاہوں کے سامنے تھا اسے دیکھ کر بھی عقل چکرا جاتی تھی۔ اس طلسم گاہ میں نجانے اور کیا کیا کچھ ہے۔ دفعتہً ہی مجھے خیال آیا کہ آس پاس کوئی نہیں ہے۔ ایک عجیب و غریب سناٹا ہے جو سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تبھی میرے منہ سے آواز نکلی۔

"کوئی ہے...... کوئی ہے تو میرے پاس آؤ۔ میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کئی بار یہ آواز لگائی لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے یہاں کوئی موجود نہیں ہے۔ میں خاموش ہو گیا۔ پھر اس کے بعد میں نے دروازے پر نگاہ ڈالی۔ زر و جواہر کے اس انبار کے درمیان نجانے کیوں دم کچھ گھٹنے سا لگا تھا۔ دروازے کو چھو کر دیکھا تو وہ بھی سونے کا بنا ہوا تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ لکڑی پر سونے کا پتر چڑھایا گیا ہو، خالص سونا ہی معلوم ہوتا تھا۔ دروازے کے دوسری طرف ایک چوڑی راہداری تھی جس کی دیواروں سے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ وہی رنگین روشنیاں جو ہیروں سے منتشر ہوتی تھیں۔ یہ طلسم گاہ واقعی کسی بھی انسان سے اس کے ہوش و حواس چھین لینے کے لئے کافی تھی۔ کوئی اسے دیکھ لیتا تو اپنا ذہنی توازن کھو سکتا تھا۔ بھلا انسانی نگاہوں نے اتنا سب کچھ کہاں دیکھا ہوگا؟ اتنے زر و جواہر تو کسی ملک کے پاس بھی ہونا مشکل تھے۔

بہر حال میں اس راہداری کو طے کرتا ہوا اس کے دوسرے دروازے تک پہنچا۔ یہ دروازہ بہت ہی بڑے ہال میں کھلتا تھا۔ لیکن خدا کی پناہ یہاں بھی جو کچھ تھا، ناقابل

یقین تھا۔ سونے کے مجسمے ہر طرف ایستادہ تھے اور ان کے بدن پر ہیرے جواہرات اور سچے موتیوں کے لاتعداد زیورات ہر طرف خوبصورت برتنوں میں یہ زر و جواہر سجائے گئے تھے۔ چھت پر سونے کے فانوس اور جھاڑ لٹک رہے تھے۔ اربوں بلکہ کھربوں روپے کی مالیت کا یہ عظیم الشان خزانہ تصور سے بھی باہر تھا۔ دفعتہً ہی مجھے ایک بار پھر خیال آیا کہ کہیں میں کوئی احمقانہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ کوئی ایسا خواب جو ذہنی اختراع ہو اور مجھے پاگل کئے ہوئے ہو۔ میں نے اپنے آپ کو نوچ کر، کاٹ کر دیکھا مگر ہوش میں تھا۔

یہاں کھڑے ہو کر میں نے پھر آوازیں لگائیں۔

''کوئی ہے...... کم بختو! اگر کوئی ہے تو میرے سامنے تو آؤ۔''

لیکن کوئی کمبخت نہیں آیا۔ تب میں وہاں سے بھی آگے بڑھا۔ اب ان روشنیوں کو دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس دروازے سے دوسری طرف پہنچا تو کچھ سکون ہوا۔ یہ بھی ایک بہت بڑا ہال نما کمرہ تھا۔ اس کے بیچ و بیچ ایک حوض بنا ہوا تھا، کنارے پر کرسیاں تھیں۔ زمین پر چند لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں رنگین لباسوں میں ملبوس، خاص قسم کے نقش و نگار کی مالک۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ ایک صف بنائی، پھر رکوع کی شکل میں جھک گئیں۔ ان کے منہ سے مدھم مدھم آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے ان آوازوں پر توجہ دی تو کچھ اس طرح کے الفاظ تھے۔

''مہتر بدھ...... تیری آمد پر ہم شکر ادا کرتے ہیں۔ تجھے دیکھ کر ہماری آنکھیں روشن ہوئیں۔ مہتر بدھ، ہم تیرے عقیدت مند ہیں۔''

میں نے ایک گہری سانس لی اور اس کے بعد کہا۔ ''میں اتنی دیر سے تم لوگوں کو آوازیں دے رہا ہوں۔ میری آمد پر تم شکر گزار تو ہو لیکن میری آواز نہیں سن رہے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے۔''

ان میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر وہ سیدھی ہوئیں اور میرے گرد آ کر پھیل گئیں۔ میں ان کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ دو لڑکیاں فوراً ہی ایک چاندی، سونے سے بنی ہوئی ایک چوکی لے کر آئیں اور میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ چوکی انہوں نے اس حوض کے کنارے رکھی تھی اور جب میں کچھ نہ بولا تو ان میں سے کچھ لڑکیاں آگے بڑھیں، انہوں نے میرے بازو پکڑے اور مجھے چوکی کی جانب لے چلیں۔

''واہ...... اب تم وہ طلسماتی ڈرامے کرو گی جو انگریزی فلموں میں ہوا کرتے ہیں۔

بیوقوف لڑکیو! مجھے نہانا نہیں ہے۔'' لیکن انہوں نے میری بات نہ سمجھی اور بازو پکڑ کر مجھے چوکی پر بٹھا دیا۔ پھر ان کے ہاتھ میرے لباس کی طرف بڑھے تو میں بوکھلا کر بولا۔

''ارے ارے، بیوقوف کی بچیو! یہ کیا کر رہی ہو تم؟''

ایک بڑی انوکھی بات میں نے یہ محسوس کی تھی کہ جو کچھ وہ کر رہی تھیں، میری زبان تو اس کی مدافعت کر رہی تھی لیکن میرے ہاتھ انہیں نہیں روک رہے تھے۔ میں سخت اچنبھے میں تھا۔ انہوں نے میرا لباس میرے جسم سے جدا کر دیا اور میں بڑی شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ مجھے واقعی یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں اتنی ساری لڑکیوں کے سامنے بے حجاب ہوں۔ لیکن انہوں نے مختلف طریقوں سے پانی نکال نکال کر میرے بدن کو دھونا شروع کر دیا۔ ان کی عقیدت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ انہوں نے میرے پورے بدن کو مل مل کر صاف کیا، پھر ایک لڑکی سفید سلک کے لبادے کا ایک خوان ہاتھوں میں اٹھائے قریب پہنچ گئی اور اس کے بعد مجھے باقاعدہ یہ لباس پہنایا گیا۔ یہ لبادہ بھی بے مثال تھا لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ میں سلک کے اس سفید لبادے کو بھوج پتر میں دیکھ چکا تھا۔ وہی ہونا ہے جس کا نقش بھوج پتر پر اُبھر آیا تھا۔ میری ہر طرح کی مدافعت بے جا ہے اور اس سے مجھے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ میرے دل نے یہ فیصلہ کر لیا تھا۔

بہرحال یہ لباس پہنانے کے بعد دو اور لڑکیاں آئیں اور انہوں نے ایک خوبصورت سنہری تاج میرے سر پر رکھ دیا۔ گویا اب میں تیار ہو گیا تھا۔ پھر وہ کشاں کشاں وہاں سے باہر لائیں اور ایک بار پھر ایک زرنگار کمرے میں پہنچ گیا۔

یہ کمرہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ بڑی خوبصورت میز لگی ہوئی تھی اور اس میز کے پیچھے صرف ایک کرسی تھی۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ سب کچھ خواب نہیں ہے بلکہ میں اس طلسم گاہ میں ایک معمول کی حیثیت سے ہوں تو ذرا دیکھوں تو سہی آگے کیا ہوتا ہے۔ میرے سامنے پھلوں، خشک میووں اور حلووں کے انبار لگا دیئے گئے۔ میں نے ازراہِ مذاق کہا۔

''بی بی! چائے، توس اور مکھن وغیرہ نہیں مل سکتا؟ تم جس شخص کو یہ سب کچھ کھلانا چاہتی ہو وہ بدنصیب پتہ نہیں کہاں ہو گا۔ ہم فقیروں کو تو بس چائے اور توس وغیرہ ہی درکار ہوتے ہیں۔ ان چیزوں کو ہٹا لو۔ میں معدہ نہیں خراب کرنا چاہتا۔ میری مطلوبہ چیز مل سکے تو لے آؤ۔''

لیکن لمحوں کی دیر تھی، ایک لڑکی ٹرے لئے ہوئے سامنے آئی۔ گرم گرم چائے دانی سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ ایسی لذیذ خوشبو کہ بس دل چاہے ٹوٹ پڑو۔ اور میں نے ایسا ہی کیا۔ لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔ مسکرا رہی تھیں اور ان کے نقرئی قہقہے اب مجھے حیران نہیں کر رہے تھے بلکہ میں ان تمام چیزوں سے لطف لینے لگا تھا۔ اصل میں، میں نے سوچا تھا کہ اپنا دماغ خراب کرنا بیکار سی بات ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جو کچھ گزر رہی ہے، اسے گزاروں۔ کوئی ایسا مشکل مرحلہ نہیں ہے میرے ساتھ۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ دیکھتا ہوں صورتحال ہے کیا۔ یہ اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا کہ میں ایک بار پھر اسی طلسمی چکر میں آ پھنسا ہوں جو میری تقدیر کا ایک حصہ بن چکا ہے اور اب اس سے فرار کسی طور ممکن نہیں۔

بہرحال میں ناشتہ کرتا رہا۔ پھر ناشتے سے فراغت حاصل ہو گئی اور لڑکیوں نے میرے سامنے سے وہ تمام چیزیں ہٹا لیں اور ایک بار پھر میری صفائی ستھرائی کی جانے لگی۔ بھوج پتر پر نظر آنے والی تصویر مکمل ہو چکی تھی۔ لیکن تجسس ابھی تک برقرار تھا۔ دفعتہً ہی باہر کسی پیتل کا بہت بڑا گاندھ بجنے کی آواز سنائی دی۔ گاندھ کی یہ آواز بھی زمانہ قدیم کے شاہی درباروں جیسی تھی۔ جیسے ہی گاندھ بجا، لڑکیاں الرٹ ہو گئیں۔ پھر سامنے والا بہت بڑا دروازہ کھلا اور چند افراد اندر داخل ہو گئے۔ لیکن ان میں سے دو کو میں نے فوراً پہچان لیا تھا۔ ایک سیوک سندھورتی تھا اور دوسرا وردان سادھانی۔ دونوں بڑے قیمتی لباس پہنے ہوئے تھے۔ پہلے میں نے ان دونوں کو جس شکل میں دیکھا تھا وہ سادھو سنتوں جیسی شکلیں تھیں لیکن اس وقت وہ زرنگار لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے کچھ اور لوگ چل رہے تھے۔ بالکل فلموں جیسا منظر تھا جیسے کسی شاہی دربار کا پیش کیا جاتا ہے۔

سیوک سندھورتی اور وردان سادھانی میرے اِردگرد کھڑے ہو گئے۔ باقی جو لوگ پیچھے آئے تھے ان میں سے ایک آگے بڑھا اور اس نے گردن جھکا کر مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کر کے کہا۔

''آیئے مہاراج! دربار آپ کا منتظر ہے۔''

میں نے تمسخرانہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی کو اور اس کے بعد سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''اچھا ڈرامہ ہے۔ پسند آ رہا ہے مجھے۔ جاری رکھو۔''

میں نے ان دونوں کے چہروں پر بوکھلاہٹیں دیکھی تھیں لیکن کسی نے زبان سے کچھ

نہیں کہا اور میں ان کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا صدر دروازے سے باہر پہنچ گیا۔ باہر کا منظر اندر کے منظر سے بھی زیادہ دلچسپ تھا۔ کیا زبردست ہال تھا۔ اس میں صندل کی لکڑی سے بنی ہوئی خوشبو دار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور ان کرسیوں پر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سارے کے سارے بدھ مت کے پیروکار معلوم ہوتے تھے۔ ان کے لباسوں سے یہی پتہ چلتا تھا۔

بہرحال مجھے لانے والے ایک طرف لے چلے اور یہاں نیل سنگھاسن بچھا ہوا تھا۔ ناقابل یقین سی چیز تھی وہ۔ نیلے رنگ کے کسی پتھر سے تراشا گیا تھا اور یہ پتھر ہیروں کی طرح چمکدار تھا۔ ایک ہی پتھر سے تراشا گیا نیل سنگھاسن ہیروں کی طرح ہی جگمگا رہا تھا۔ میں اس کی جانب بڑھ گیا۔ وہ صرف میرے بیٹھنے کے لئے تھا۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے مضحکہ خیز خیالات آ رہے تھے۔ ہندوستان ہی کی تاریخ میں سقہ کی کہانی تھی۔ ایک سقے کو ایک دن کا بادشاہ بنا دیا گیا تھا اور اس نے چمڑے کے سکے چلوا دیئے تھے۔ یا پھر الف لیلہ کا ابوالحسن جسے ہارون رشید کی بیوی اٹھا کر لے گئی تھی اور اس نے اسے ایک دن کے لئے بادشاہ بنا دیا تھا اور بھائی ابوالحسن سالہا سال ایک بادشاہ بنے رہے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ شاہی دربار سے نکالنے کے بعد انہیں سڑکوں پر بچے پتھر مارتے تھے۔

ایسا ہی کوئی مضحکہ خیز چکر میرے ساتھ چلایا جا رہا تھا اور شاید یہ چکر چلانے والوں کا خیال ہوگا کہ وہ میری کھوپڑی بھی آؤٹ کر دیں گے۔ لیکن یہاں انہیں مکمل ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ میں بہت مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہوں۔ میں اس جال میں گرفتار نہیں ہوں گا۔

بہرحال مجھے نیل سنگھاسن پر بٹھا دیا گیا۔ ایک بار پھر گاندھ پر چوٹ پڑی اور وسیع و عریض ہال کے آخری سرے پر بنے ہوئے ایک دروازے سے کچھ لوگ اندر داخل ہوئے۔ چار افراد چوڑے کھانڈے لئے ہوئے جن کی دھار چمک رہی تھی اندر داخل ہوئے اور ان کے پیچھے کچھ افراد جن میں چند کو دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں نے ہیگ، ہشمان ذکری کو تو فوراً ہی پہچان لیا تھا۔ باقی کچھ اور لوگ بھی تھے جن میں دو افراد اپنی بڑی بڑی مونچھوں اور داڑھی کے ساتھ صاف پرتگالی نظر آتے تھے۔ لمبے چوڑے جسموں کے مالک۔ لباس سے لگتا تھا جیسے کسی قدیم جہاز کے

کپتان ہوں۔ کچھ اور افراد۔ ان سب کی تعداد ملا کر کوئی بارہ تیرہ تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلے آرہے تھے۔

تب میں نے لوہے کی کھڑکھڑاہٹ سنی۔ یہ ان کے پیروں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کی آوازیں تھیں۔ گویا وہ قیدی تھے۔ میری نگاہوں کو دھوکا نہیں لگ رہا تھا۔ ہیگ اور ہشمان ذکری کو میں نے صاف پہچان لیا تھا۔ یہ تو میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ یہ زندہ کہاں سے نظر آرہے ہیں۔ قیدیوں کو آگے لا کر مجھ سے کوئی دس گز کے فاصلے پر کھڑا کر دیا گیا۔ سامنے کھڑے ہوئے کھانڈا بردار ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ سیوک سندھورتی اور وردان سادھانی گویا میرے مشیر تھے۔ تب وردان سادھانی اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے گردن خم کرتے ہوئے کہا۔

"مہا وشا...... ادرم مہا کیشو۔ وہ مجرم آپ کے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں۔ یہ مہا کیشو کے اس عظیم وردان کو چرانا چاہتے تھے جو مہا کیشو کی نسلوں سے چلا آ رہا ہے اور جس کی سرکھشا کرنے کے لئے صدیوں سے کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ مہا کیشو کے پرکھوں کا یہ وردان مہا کیشو ہی کی ملکیت ہے۔ لیکن ان پاپیوں نے، ان مورکھوں نے اس پر ہمیشہ بری نگاہ ڈالی، اس کے لئے قتل و غارت گری اور خون کئے۔ زمانہ قدیم میں ایک مورکھ اس جگہ تک پہنچ گیا تھا جہاں مہا کیشو کے وردان کا نقشہ لوحِ مقدس کی شکل میں تھا۔ وہ پہاڑوں کی گہرائیوں سے اس لوح کو چرا کر لے گیا۔ تیس آدمی تھے اس کے ساتھ۔ اس نے ان میں سے سولہ کو قتل کر دیا باقی وہاں سے چلے گئے اور پھر کسی اور نے اس لوح کو دو ٹکڑے کر دیا۔ ایک ٹکڑا کہیں سے کہیں چلا گیا اور دوسرا ان لوگوں کے ہاتھوں میں کھیلتا رہا۔ یہ اس طرح سے طرح طرح کے اندازے لگاتے رہے۔ کبھی انہوں نے مہا کیشو کے وردان کو مصر کے اہراموں میں تلاش کیا اور انہیں مصر کے فرعونوں کی ملکیت سمجھا، کبھی انہوں نے اسے زمانہ قدیم کے کسی اور شہنشاہ کے نام سے منسوب کر دیا اور کبھی روم کی سلطنت میں۔ لیکن مہا کیشو، یہ دو منش جواب اس سنسار میں نہیں ہیں، پر ان کی آتماؤں کو آپ کے سامنے مجرم کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ دونوں اصلیت پانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ نمی ستو...... مہا بدھی اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ مہا کیشو! اب یہ دونوں مجرم آپ کے سامنے موجود ہیں، ان کی تقدیر کا فیصلہ آپ کیجئے۔ جو سنسار میں نہیں ہیں ان کے لئے نرکھ کا وردان دیجئے اور جو سنسار

باسی ہیں ان کے لئے سزا تجویز کیجئے۔ آپ بہت عرصے کے بعد نیل سنگھاسن تک پہنچے ہیں۔ سارے مقدمے آہستہ آہستہ آپ کے سامنے پیش کر دیئے جائیں گے۔"

میں نے مسکراتی نگاہوں سے ہیگ اور ہشمان ذکری کو دیکھا۔ پھر میں ہیگ سے مخاطب ہوا۔ "ذلیل انسان! کلکتہ میں تو نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا کیا تیرے ذہن میں موجود ہے؟ ہپناٹزم کا ماہر ہے تو اب ایسا کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دے اور مجھے ہپناٹائز کر دے۔ تو، تو بہت بڑا ہپناٹسٹ ہے۔ درجنوں نام ہیں تیرے۔ تو اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھتا ہے۔ سمندری جہاز کے سفر کے دوران تو نے جس طرح مجھ پر زندگی عذاب کر دی تھی، یاد ہے تجھے؟"

ہیگ نے حقارت آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھا، پھر بولا۔ "اور تو نے اس کا بدلہ لے تو لیا۔ اب کیا کرے گا میرا؟ یہ بتا۔"

"وردان سادھانی! بقول تمہارے یہ دونوں روحیں ہیں؟"

"مہا کیشو! ان میں اور بھی کچھ آتمائیں ہیں، جیسے وہ دونوں پرتگالی باشندے یا ان کے پیچھے کھڑے ہوئے وہ تین باشندے، وہ سب جیتے نہیں ہیں اور ان کے لئے کالا نرکھ تیار ہے۔ کالے نرکھ میں انہیں صدیوں جلنا ہوگا۔"

"جو مر چکے ہیں، انہیں یہاں سے نکال دو اور جو زندہ ہیں، ان کے دماغوں سے ہمارے اس خزانے کا خیال اس طرح صاف کر دو کہ مرتے وقت تک وہ کبھی اس کے بارے میں نہ سوچیں۔ اور پھر ان کو ان علاقوں سے نکال دو۔" میں نے کہا اور ایک لمحے کے لئے سارے ماحول پر سکتہ طاری ہو گیا اور پھر بھنبھناہٹوں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔

لوگ شاید میرے اس فیصلے پر تبصرے کر رہے تھے۔ لیکن میرے اپنے خیال میں یہ فیصلہ بالکل درست تھا۔ ہیگ اور ہشمان ذکری سے میرا جھگڑا بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ہشمان ذکری تو بس ہیگ کا دوست ہونے کی وجہ سے مارا گیا تھا۔ لیکن باقی لوگوں سے میرا کوئی چکر نہیں چلا تھا۔ ہیگ وغیرہ سے بھی میں نے اپنا انتقام تو لے لیا تھا اب ان روحوں کو کالے ساگر میں ڈلوانے سے مجھے کیا حاصل ہوتا۔ دشمنی زندوں سے کی جاتی ہے، مُردوں سے نہیں۔

بہر حال اس کے بعد وردان سادھانی نے کہا۔

"مہا کیشو نے ان لوگوں کے بارے میں جو فیصلہ دیا ہے وہ حرفِ اول اور حرفِ آخر

ہے۔ اس پر کسی کو تبصرہ کرنے کا حق نہیں ہے۔ ہر زبان خاموشی اختیار کرے۔ بات ختم ہو گئی ہے۔ مہا کیشو! آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔ قیدیوں کو لے جاؤ اور آزاد کر دو۔ ان کی قید ختم ہو چکی ہے۔“

تمام قیدیوں کو واپس لے جایا گیا۔ میں اب بھی اپنے آپ کو ایک دن کے سلطان کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا اور خود اپنے آپ پر ہنس بھی رہا تھا۔ اگر زندگی نے واقعی کبھی ہوش و حواس قائم کرنے اور کسی پُرسکون دنیا میں رہنے کا موقع دیا تو ان گزرے ہوئے واقعات کو یاد کر کے شاید سب سے زیادہ ہنسی مجھے ہی آئے، دوسروں کو تو بعد میں ہی ہنسنے کا موقع ملے گا۔ کیا عجیب و غریب کیفیت ہے میری اس وقت۔ سقہ، ایک دن کا سلطان اور نجانے کیا کیا خیالات خود میرے اپنے ذہن میں تخلیق پا رہے تھے۔ غرض یہ کہ اس کے بعد اور بہت سے مقدمات سامنے لائے گئے جو بڑے دلچسپ اور عجیب و غریب تھے۔

وقت اس طرح سے گزرتا رہا اور اس کے بعد مہا کیشو یعنی میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن اندر کا جو زرنگار ماحول تھا وہ مجھے دیوانہ کئے دے رہا تھا۔ جتنے لوگ اس خزانے کی تلاش میں تھے اور اس کے لئے خونریزی کرتے پھر رہے تھے پتہ نہیں ان میں سے کسی نے اس خزانے کو دیکھا بھی تھا یا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں اگر کوئی اسے دیکھ لیتا تو دو ہی باتیں ہوتیں۔ یا تو وہ کسی ملک کو یہاں چڑھا لاتا یا پھر خودکشی ہی کر لیتا، کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتا وہ۔

بہرحال یہ ساری باتیں صرف سوچنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ کرنا کیا تھا یہ تو آنے والے وقت ہی سے پتہ چل سکتا تھا۔ غرض یہ کہ اس طرح میں نے یہ دربار آرائی کی اور اس کے بعد جب یہ سلسلہ ختم ہو گیا تو انہی لوگوں کا ایک گروہ مجھے لے کر وہاں سے چل پڑا اور میں واپس اسی آرام گاہ میں آ گیا جہاں سے نکل کر باہر گیا تھا۔ یہ سب کچھ میرے لئے بڑا سنسنی خیز تھا۔ میں نجانے کب تک اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ دو حسین لڑکیاں میری خدمت پر معمور تھیں۔ ہال میں ان کا پورا جمگھٹا لگا ہوا تھا جن کی پُرہوس اور لالچی نگاہیں میرا طواف کرتی رہی تھیں۔

کھانے وغیرہ سے فراغت ہوئی اور پھر میں اسی بستر پر آرام کرنے لیٹ گیا۔ وقت کا کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ بستر پر لیٹ کر میں سوچوں کے دائروں میں گھر گیا۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ یہ مہا کیشو کیا چیز ہے؟ نیا نام سنا تھا میں

نے اور وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی پہلے تو بدھ بھکشوؤں کے لباس میں میرے سامنے آتے رہے تھے لیکن اس وقت یہ بھی شہنشاہ کے مصاحب بنے ہوئے تھے۔ اگر یہ کوئی ڈرامہ ہے تو بڑے تعجب کی بات تھی۔ اتنے عرصے تک کوئی ڈرامہ کیا جا سکتا ہے؟ اور اگر یہ کوئی مذہبی چکر ہے تو پھر میں کیوں اس عذاب میں گرفتار ہوا ہوں؟ یہ بڑا عجیب و غریب معاملہ تھا۔

میں نے ایک بار پھر اس بھوج پتر کو اس کی جگہ دیکھا اور وہ مجھے اپنی جگہ رکھا ہوا ملا۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ دیکھوں تو سہی کہ قصہ کیا ہے۔ آنے والا وقت اب کون سی نئی تصویر پیش کرتا ہے۔ میں نے وہ بھوج پتر اٹھا کر دیکھا اور ایک بار پھر دنگ رہ گیا۔ اب اس پر موجود تصویر بدل چکی تھی۔ میرے بدن پر گیروا لباس تھا اور میں ایک سادھو کی حیثیت سے ہاتھ میں کمنڈل لئے ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے پاس ہی ایک لکڑی رکھی ہوئی تھی جس کا اوپری حصہ سانپ کے پھن جیسا تھا۔ سو فیصدی یہ میری ہی شکل تھی۔ باپ رے باپ...... کیا اب مجھے اس شکل میں بھی آنا پڑے گا؟ ٹھیک ہے بھائی، ٹھیک ہے۔ اب جو بھی تماشہ ہو رہا ہے اسے برداشت کرنا پڑے گا۔ اب دیکھو میری یہ شکل کب ظاہر ہوتی ہے۔ مگر دیر کی کیا گنجائش تھی۔ رات کو نجانے کن کن سوچوں میں ڈوبا ہوا گہری نیند سو گیا اور صبح کو جب آنکھ کھلی تو سارا منظر بدلا ہوا تھا......!

میں نے اپنے آپ کو ایک پہاڑی سلسلے میں پایا اور ذرا سی کوششوں سے میں نے اس جگہ کو پہچان لیا۔ یہ گاشر برم کا پہاڑی سلسلہ تھا جہاں مجھے پہلے بھی لایا گیا تھا اور سامنے ہی وہ عبادت گاہ نظر آ رہی تھی جو دھرم شوالہ کے نام سے مشہور تھی۔ میرے چاروں طرف ویران پہاڑیاں بکھری ہوئی تھیں لیکن کافی فاصلے پر دھرم شوالہ میں چہل پہل نظر آ رہی تھی اور بدھ بھکشو اپنے مخصوص لباسوں میں اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ لیکن میرا ان سے اتنا فاصلہ تھا کہ مجھے ان کے نقوش نظر نہیں آ رہے تھے۔ جس جگہ میں پڑا ہوا تھا وہ پتھر کی تراشی ہوئی ایک چٹان تھی۔ اور مجھ سے صرف دو گز کے فاصلے پر ناقابل یقین گہرائیاں تھیں۔ ایسی کہ دیکھ کر دل دہشت سے بند ہو جائے۔

گاشر برم کی ان خوفناک پہاڑیوں میں کب اور کیسے پہنچا اس کا جواب تو نہ پہلے میرے پاس تھا اور نہ ہی اب میں اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کر سکتا تھا۔ بہرحال پہاڑیوں کی ان گہرائیوں کی تہہ میں دھوئیں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا اور میں ششدر تھا۔ دور

خانقاہ کی کارروائیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ پھر مجھے دو افراد اپنی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ وہ اسی خانقاہ کی طرف سے آ رہے تھے۔ اور جیسے ہی وہ کچھ اور آگے بڑھے میں نے بدھ بھکشوؤں کے لباس میں ان دونوں کو پہچان لیا۔ ان میں سے ایک سیوک سندھورتی اور دوسرا وردان سادھانی تھا۔ دونوں مناسب رفتار سے چلتے ہوئے آخر کار میرے قریب پہنچ گئے۔ میرے چہرے پر مذاق اُڑانے والی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ میں نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم دونوں مجھے نوٹنکی کے دو کردار معلوم ہوتے ہو۔ حقیقتاً اس طرح روپ بدل لیتے ہو کہ انسان سوچتا ہی رہ جائے۔ اب کیا نئی کہانی لے کر آئے ہو۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمہاری جادوگری بھی بے مثال ہے اور تمہارا روپ بدلنا بھی کمال کی بات ہے۔“ وہ دونوں خاموشی اور عقیدت سے گردن جھکائے میری باتیں سنتے رہے، پھر وردان سادھانی نے کہا۔

”بدھی نمو! آپ ہم پر کسی طرح کا شک نہ کریں۔ سنسار کے دو ہی تو روپ ہوتے ہیں۔ کالا، سفید۔ روشنی، اندھیرا۔ غم، خوشی۔ یہی سنسار کا روپ ہے اور اسی روپ سے سنسار چلتا ہے۔ آپ نے ہزاروں سال پہلے جنم لیا تھا ایک بادشاہ کے گھر۔ اس سے آپ کو گیان ملا تھا نہ وردان۔ یہ سورج آپ کا سیوک اور چاند آپ کا دوست تھا مہاراج۔ آپ وہ بے شک نہیں تھے لیکن اس کا سدور تھے اور یہ سدور سدھارت کے نام سے سنسار کا وردان تھا۔ وہ بھی بادشاہ تھا۔ اور جب اس نے گیان کے راستے اپنائے تو بادشاہت چھوڑ دی۔ مہاراج! یہ کہانی تو سنسار کی کہانی ہے اور اسی کہانی میں سنسار کی پرہڑتا چھپی ہوئی ہے۔ آپ سنسار میں گرشارک ہوئے۔ اور سب نے دیکھا آپ کو۔ پر مہاراج! سمے سمے کی بات ہے۔ آپ کو سنسار کی دشائیں بھٹکاتی رہیں۔ کبھی الیس فیوری کے روپ میں، کبھی کسی اور روپ میں اور کبھی کسی اور روپ میں۔ واسناؤں نے آپ کو گھیرا اور آپ ایک منش ہی کے انداز میں واسناؤں میں گھر گئے۔ پر نمی ستی کارم سدھارتی ہمیں آپ کا ہر روپ پسند تھا۔ ہم آپ سے یہی بنتی کرتے رہے کہ مہاراج! اپنا مقام پہچانئے اور یہی تو ہونا ہی تھا۔ پھر نمن تندورتا نے آپ پر اپنا سایہ کیا اور آپ برائیوں کو ٹھکرانے لگے۔ سو ہم نے آپ سے دور رہ کر یہاں آپ کے لئے تیاریاں شروع کر دیں کہ سنسار میں مہتر بدھ کی آمد بدھ دھرم کے لئے شبھ تھی۔ اشبھ بھاوناؤں نے آخر کار آپ

کا پیچھا چھوڑا اور ہماری بنتی سن لی گئی۔ آپ گیان کے راستے پر چل پڑے۔ اور نمی ستو، آپ درحقیقت بہت بڑا سچ ہیں۔ آپ سچ کا دوسرا روپ ہیں۔ آپ کے پاس سنسار کا اتنا بڑا خزانہ ہے کہ آپ بہت سی بستیاں آباد کر سکتے ہیں۔ آپ چاہیں تو وہی روپ اپنا سکتے ہیں اور آپ کو سنسار کی ساری دشائیں مل جائیں گی۔ مگر نمی ستو! جسے بدھ کا وردان ملنے والا ہے وہ بھلا سنسار کی ان دشاؤں کا کیا کرے گا۔ آپ تو سنسار سیوک ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ آپ مہتر بدھ کی یہ رسم آگے بڑھائیں گے۔

مہا ستو! اگر آپ کے من میں کچھ اُلجھن ہے تو ہم آپ کی یہ اُلجھن دور کر دیں گے۔ دھرم شوالہ درحقیقت ایک میزان ہے، ایک ترازو ہے اور وہیں سے مہتر بدھ کا وردان ہوتا ہے۔ مہتر بدھ وہیں نظر آتے ہیں اور پھر ہم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم ان کا پالن کریں اور جب وہ بڑے وردان میں آ جائیں تو پھر ان کی سیوا کریں اور انہیں آخر کار اس گیان دھنک پر لے آئیں جہاں سے وہ بدھ مت کے پیروکاروں کے لئے روشنی کی مشعل جلا دیں۔ اور وہ سمے آ گیا ہے۔ آپ کھوٹے سے کھرے بن گئے ہیں اور ہم آپ کو اسی لئے یہاں تک لائے ہیں۔ وہ دیکھئے، سامنے دھرم شوالہ موجود ہے نمی ستو! وہاں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ شِو جی کا مندر اور دیو استھان اشو جی، وہ آپ کے منتظر ہیں۔ آپ کو پہلے یہاں پہلا وردان دیا جائے گا، پھر آپ کو دیو استھان لے جایا جائے گا۔ نیل سنگھاسن آپ کے چرنوں سے چھو کر ایک بار پھر امر ہو گیا ہے۔“

”بک چکے...... یا ابھی اور بک بک کرنی ہے؟“ میں نے ان کی ساری باتیں سننے کے بعد کہا۔ وردان سادھانی نے سیوک سندھورتی کی طرف دیکھا اور سیوک سندھورتی محبت سے مسکرا دیا۔

”آپ اگر کچھ کہنا چاہیں تو کہیں نمی ستو۔“

”بیوقوفو، میں صرف تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں سنسار کا بہت بڑا جھوٹ ہوں۔ سمجھے...... بہت بڑا جھوٹ۔“

”جھوٹ؟“ وہ دونوں بیک وقت بولے۔

”ہاں، بہت بڑا جھوٹ۔ پہلی بات تو یہ کہ میں ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا اور ظاہر ہے میرا اپنا ایک دھرم ہے۔ میرا اپنا ایک نام ہے۔ خاقان جمشیدی ہے میرا نام اور میرے باپ کا نام ہمدان جمشیدی تھا۔ تم لوگوں نے پتہ نہیں کیوں مجھے اتنا بڑا درجہ دے

دیا ہے۔"

"مگر مہاراج......"

"بتا دیا ہے میں نے تمہیں، بہت بڑا جھوٹ ہوں میں سنسار کا۔"

"یہ تو آپ ہمیشہ ہی کہتے آئے ہیں مہاراج۔"

"اس وقت بھی یہی کہہ رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میرا مستقبل کیا ہے۔ ایک بات میں تم سے کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اگر کبھی تم پر حقیقتوں کا انکشاف ہوا اور تم یہ جان لو کہ میرے لئے تم صرف غلط فہمی کا شکار رہے ہو اور اس غلط فہمی میں تم نے نجانے کیا کیا کچھ کر ڈالا ہے۔ جہاں تک اس لوح کا تعلق ہے جس کے لئے ہنگامہ آرائی ہوئی تو تم لوگ یہ بھی جانتے ہو کہ نہ وہ میری منزل تھی نہ میں نے اسے اپنی منزل بنایا۔ جبکہ میرے سامنے بہت سی بار یہ بات کہی گئی کہ وہ لوح ایک بہت بڑے خزانے کا نقشہ ہے۔ میرے دوستو! خزانے تو میرے قدموں تلے بکھرے پڑے ہیں۔ میں نے خود ایک ایسے گھرانے میں جنم لیا ہے جہاں اتنی دولت پائی جاتی تھی کہ میری کئی نسلیں ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر شہنشاہوں کی سی زندگی گزار سکتی تھیں۔ پھر اس کے بعد نجانے کیا کیا چکر چلے اور میں دربدر ہو گیا۔ لیکن دولت نے ہمیشہ میرا تعاقب کیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے پھرتی رہی اور میں اسے ٹھوکریں میں مارتا رہا۔ ابھی چند روز پہلے ایک بار پھر مجھے دولت کے ڈھیر نجانے کیسے کیسے لالچ کے ساتھ دکھائے گئے پر میں نے انہیں بھی ٹھوکر مار دی اور یہ جو تم مجھے دکھا چکے ہو، تم یقین کرو میرے لئے بالکل بے مقصد ہے اور میں دوبارہ کبھی اسے دیکھنے یا اس کے حصول کی خواہش کا کوئی اظہار نہیں کروں گا تم سے۔ اب اس کے بعد تمہیں جو بولنا ہے تم بولو۔"

"نمی وردھنا...... ماتھن گھوچنا، کبھی کبھی منش اپنے آپ کو نہیں پہچانتا۔ اس بڑے نے بھی اپنے آپ کو نہیں پہچانا تھا۔ وہ کرنت کردھا تھا شہزادہ سدھارت، جس کے سینے میں چراغ جلتے تھے۔ لیکن جب گیان وردان ہوا اسے تو اس نے سنسار چھوڑ دیا۔ مہا گنی! تم تو شروع ہی سے سنسار کو تیاگے ہوئے ہو۔ تم اسنے بڑے نہ ہو گے تو کیا کوئی اور ہو گا؟"

"پاگل ہو تم سالو! پاگل ہو۔ چلو میرا کیا جاتا ہے۔ آج تک میں تمہارے شوق پورے کرتا رہا ہوں، اب بھی اگر تم اپنا شوق پورا کرنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ اب بولو مجھے کیا کرنا ہے؟"

"آیئے مہاراج! ہمیں اس بات کا یقین ہے، سمے کا ایک لمحہ ایسا آئے گا جب اچانک ہی ہوا کا ایک جھونکا چلے گا اور آپ کے ذہن سے ساری گرد اڑ جائے گی پھر آپ کا ہاتھ اٹھے گا اور آپ ہمیں وجے کا وردان دیں گے۔ آپ ہمیں وجے کی بھینٹ دیں گے۔ ہم اس سمے کو اپنے آپ سے زیادہ دور نہیں سمجھتے نمی ستو۔"

"میں نے کہا نا تمہاری بکواس ہوتی بڑی مزے کی ہے۔ بیوقوفو! اب یہ بتاؤ میں کیا کروں؟ تم لوگ ایک لمحے میں سین بدل دیتے ہو۔ دوسرا سین کیا ہے؟"

"آپ آیئے مہاراج! دھرم شوالہ آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

اور یہ دھرم شوالہ وہی سامنے والی عمارت تھی۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ جس جگہ میں موجود ہوں وہاں خود کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے بہرطور انہی کے رحم و کرم پر رہنا ہے۔ چنانچہ ضد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں ان لوگوں کے ساتھ قدم آگے بڑھ گیا اور فاصلے کم ہونے لگے۔ یہاں تک کہ میں نے اس دھرم شوالہ میں قدم رکھ دیا۔

بہت بڑا ہال نما دروازہ تھا جس سے وہ لوگ مجھے اندر لے گئے۔ اندر آنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ شو مندر کو میں نے پہلے جس ماحول میں دیکھا تھا یہ وہ ماحول نہیں تھا اور اس کے علاوہ اب میرے ذہن کے پردوں پر وہ پرانی یادیں تازہ ہو رہی تھیں۔ یعنی وہ جگہ جہاں میں والد صاحب کے ساتھ آیا تھا اور بعد میں مجھے پتہ لگا تھا کہ یہ شو مندر ہے۔ یہ دوسری جگہ تھی۔ اندر ٹڈی دل بھرا ہوا تھا۔ سفید کپڑوں میں گھٹے ہوئے سر والے بھکشو، جگہ جگہ مہاتما بدھ کے تانبے، کانسی اور سونے کے مجسمے، مجسموں کا شہر آباد تھا۔ بہت بڑی جگہ تھی۔ اتنی صاف شفاف اور اس قدر پرسکون کہ بس لگتا تھا زندگی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔

وہ لوگ مجھے ایک ایک قدم آگے بڑھا رہے تھے اور بدھ بھکشو مدھم مدھم آوازوں میں کچھ گا رہے تھے۔ ان کی آوازوں کی ایک ہی لے تھی۔ وہ لوگ مجھے آگے لیتے چلے گئے۔ سامنے ہی ایک تخت بچھا ہوا تھا جس پر مہاتما بدھ کا ایک بہت بڑا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے ایک خوبصورت قالین اور پھر یہاں ایک بڑے سے برتن میں کوئی عجیب سی خوشبو سلگ رہی تھی۔ لیکن یہ بالکل ناخوشگوار نہیں تھی بلکہ انتہائی خوشگوار سی تھی۔

میں اس سارے ماحول کو دیکھ کر کچھ سحر زدہ سا ہوا جا رہا تھا۔ یہاں پہنچنے کے بعد ان لوگوں نے مجھے اس قالین پر بٹھایا اور اس کے بعد ایک عجیب و غریب رسم ادا کی جانے

لگی۔ مجھے پالتی مار کر یوگا کے آسن میں بٹھا دیا گیا تھا۔ میری دونوں بغلوں کے نیچے دو لکڑیاں لگائی گئی تھیں جو غالباً اخروٹ کی بنی ہوئی تھیں۔ اس طرح میرے دونوں بازو اٹھ گئے تھے۔ پھر سب سے پہلے وردان سادھانی نے میرے دونوں پیروں کے انگوٹھے چھوئے اور انہیں ماتھے سے لگا کر اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا۔ سیوک سندھورتی اور اس کے بعد وہاں موجود تمام بھکشو یہی عمل دوہرانے لگے۔ سفید لباس میں ملبوس بھکشو پجارنیں بھی آئیں۔ انہوں نے بھی یہی عمل کیا اور اس عمل میں کئی گھنٹے صرف ہو گئے۔ میرا بدن دُکھ گیا تھا۔

کچھ ہی لمحوں کے بعد کچھ لوگ عقب سے آئے اور انہوں نے میرے کندھوں، گردن اور چہرے پر کوئی چیز لگائی۔ غالباً کوئی سیال تھا جس کے میرے بدن کو چھوتے ہی آپ لوگ یقین کریں میری ساری تھکن اس طرح دور ہو گئی جیسے تھکن کو نچوڑ لیا گیا ہو۔ پھر یہ سلسلہ دوبارہ جاری ہو گیا اور اس وقت جب سورج ڈوب گیا اور پورے ہال میں شمعیں روشن کر دی گئیں تب کہیں جا کر یہ سلسلہ ختم ہوا۔ لیکن ان کا جشن بدستور جاری تھا۔ جو بھکشو میرے پیروں کے انگوٹھے چھو کر باہر نکل جاتے وہ دوبارہ واپس نہیں آتے۔ یہاں تک کہ آخری آدمی باہر نکل گیا۔ اب صرف وہی دونوں یہاں موجود تھے یعنی وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی۔ وہ خاموشی سے دوزانو بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔

"ہو گیا تمہارا تماشہ یا ابھی کچھ اور ہونا ہے؟"

میری اس بات کا ان لوگوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے پھر کہا۔

"میں تھک گیا ہوں۔ آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اُٹھ کر بھاگ جاؤں گا یہاں سے۔"

سیوک سندھورتی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "کچھ لمحے اور بدھی نمو! کچھ لمحے اور۔"

اور پھر ان دونوں نے میری بغلوں کے نیچے سے لکڑیاں نکال لیں۔ بازو اکڑ کر رہ گئے تھے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں تو بس یہیں لمبا ہوئے جا رہا ہوں۔"

"نہیں بدھی ستو، ابھی تو رات کی مشقت باقی ہے۔"

"اے، اے...... اے بھائی، بات سنو...... بات سنو یارو! دیکھو، ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں وہی کر رہا ہوں جو تم کہہ رہے ہو۔ لیکن اب جب میرے اندر ہمت ہی نہ رہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"آپ کے اندر ہمت پیدا ہو جائے گی۔ یہ لیجئے...... یہ پی لیجئے۔" وردان سادھانی

نے آگے بڑھ کر ایک پیالہ مجھے پیش کیا۔ گڑ کے پانی جیسی کوئی چیز تھی۔

"کیا ہے یہ؟"

"جو کچھ بھی ہے آپ کے شایانِ شان ہے۔"

میں نے اس شایانِ شان چیز کو چکھا، مشک کی خوشبو آ رہی تھی۔ پہلے ہی گھونٹ نے بڑی فرحت بخشی اور میں نے پیالہ خالی کر کے ان کے حوالے کر دیا۔ وردان سادھانی مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"جی مہا ستو...... اب بتایئے؟"

"ٹھیک ہے بابا، ٹھیک ہے۔"

اور واقعی ٹھیک ہی ہو گیا تھا۔ یہ چیز جو کچھ بھی تھی کم از کم اس نے مجھے اس طرح تروتازہ کر دیا تھا کہ اب نہ بدن میں تھکن تھی اور نہ نیند آ رہی تھی۔ بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ طبیعت میں فرحت پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"یارو! تم لوگوں نے ایسی ایسی ایجادات کر لی ہیں کہ واقعی اگر یہ ایجادات دوسروں کو حاصل ہو جائیں تو بہت سوں کی زندگی سنبھل جائے۔ چلو اب بولو۔"

اسی وقت باہر سے چار آدمی اندر آ گئے اور ان دونوں کے کہنے پر میں کھڑا ہو گیا پھر ایک ایک قدم چلتا ہوا اس عمارت سے باہر نکلا تو باہر میں نے بدھوں کا ایک جم غفیر دیکھا۔ چار چار کی قطار میں بہت دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ دروازے کے باہر ایک بہت ہی خوبصورت رتھ نما چیز رکھی ہوئی تھی جس میں ڈوری جیسے چار ڈنڈے لگے تھے۔ مجھے اس رتھ میں بٹھایا گیا تو میں نے پھر کہا۔

"کر لو، کر لو۔ جو دل چاہتا ہے کر لو۔ خود پچھتاؤ گے کہ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔"

عقیدت مندوں نے وہ رتھ نما چیز کاندھوں پر اٹھا لی۔ بڑا آرام دہ بنایا گیا تھا اسے۔ اب نجانے یہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ بیٹا! جو دل چاہے کرتے رہو۔ خود بھگتو گے۔

ویران پہاڑی راستوں پر سفر کا آغاز ہو گیا۔ چیونٹیوں کی طرح یہ لوگ میرے آس پاس چل رہے تھے اور اس طرح کاندھے بدل رہے تھے جیسے مجھے کاندھوں پر اٹھانا ان کے لئے عقیدت کا بہت بڑا عمل ہو۔ میں نے بہت دیر تک آنکھیں کھلی رکھیں۔ آسمان پر

چاند نکل آیا تھا اور تا حد نظر پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ یہ جفاکش لوگ پیدل سفر کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ مجھے اس رتھ میں ہچکولے لیتے ہوئے نیند آ گئی اور میں صحیح معنوں میں بے خبر سو گیا۔ بدن کو لگنے والے ہچکولے گویا ماں کی آغوش بنے ہوئے تھے۔ اور یہ سفر جاری تھا۔

نجانے کتنی دیر کے بعد آنکھ کھلی تو میں نے آسمان کے چاند کو سفر کرتے دیکھا۔ بھکشوؤں کا ٹڈی دل اب بھی سفر کر رہا تھا۔ میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور تیسری بار جب میری آنکھ کھلی تو صبح کا ستارہ ڈگمگا رہا تھا اور بھکشوؤں کا ٹڈی دل ایک پہاڑی پر چل رہا تھا۔ میں نے اس پہاڑی کو فوراً ہی پہچان لیا۔ یہ پھولا کھانچن کا علاقہ تھا۔ یہ جگہ کئی بار میرے قدموں تلے آ چکی تھی اور یہاں میرے ساتھ اس سلسلے میں بڑے عجیب و غریب لمحات گزرے تھے۔

بہرحال وہ لوگ بلندیاں طے کرتے رہے اور کچھ نہیں۔ لیکن میں ان کی جفاکشی کا قائل ہو گیا تھا۔ ساری رات سفر کیا تھا انہوں نے اور اب صبح کا ستارہ ڈوب رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بلندی کی انتہا تک پہنچ گئے اور یہاں میں نے ایک بار پھر دھرم شوالہ دیکھا۔ یہ دھرم شوالہ تھا یا شِو کا مندر، یہ بات میں بالکل نہیں جانتا تھا۔ لیکن وہی خیال دل میں تھا۔ جگہ میری جانی پہچانی تھی۔ میں اس سارے منظر کو دیکھتا ہوا ان لوگوں کے کندھوں پر آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ ایک ایسی جگہ آ گئی جہاں مجھے اتار دیا گیا اور میں نیچے اتر گیا تھا۔

وہ لوگ میرے ساتھ ساتھ آگے بڑھے اور پھر مجھے ایک بڑے سے اونچے چبوترے پر چڑھایا گیا جہاں قالین بچھا ہوا تھا۔ چاروں طرف خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں اور بہت سے پجاری یہاں پہلے سے میرے استقبال کے لئے موجود تھے۔ ان کے گانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ نمی بدھو...... نموستو...... ست گاترے...... ست گاترم...... نمی ستو...... نمی بدھو۔" ایک بار پھر مجھے قالین پر اسی طرح آسن مار کر بٹھا دیا گیا۔

"اب کیا تماشہ ہو رہا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"مہاترم...... مہاوردانی...... دلائی لامہ آنے والے ہیں اور بس وہ تمہارے سر پر مہتر بدھ کا تاج رکھ دیں گے اور آج صبح جب سورج نکلے گا تو ہمارے دھرم میں ایک نئے بدھ کا اضافہ ہو جائے گا جو ہمیں گیان دے گا۔ مہا گیانی نمو بدھو...... نموستو۔" میں ایک

ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ میں نے سوچا۔

"بھائیو! جو دل چاہے کر لو۔ میرا کیا جاتا ہے۔ اب دیکھوں گا کہ تم لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔ تمہارا سلوک پسند نہ آیا تو راہِ فرار اختیار کر لوں گا اور کیا کر سکتا ہوں۔"

انتظار جاری رہا۔ پھر کافی وقت گزرا اور ایک بار پھر باہر سے شور شرابے کی آواز سنائی دی۔ یہ شور شرابا دلائی لامہ کے آنے کا تھا۔ جو شخص اندر لایا گیا وہ ایک چوکی پر بیٹھا ہوا تھا اور چار آدمی یہ چوکی اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ انتہائی بوڑھا اور لاغر آدمی تھا۔ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتا تھا۔ چہرہ بھی بالکل سوکھا ہوا تھا اور سر گھٹا ہوا تھا۔ لیکن اس کے سارے وجود میں اُس کی آنکھیں بڑی جاندار تھیں۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ایک انتہائی تندرست اور توانا آدمی نگاہوں کے سامنے ہے۔ ان آنکھوں میں ایک عجیب سا جلال تھا۔

وہ اندر آ گیا۔ چوکی کو ایک جگہ رکھ دیا گیا۔ یہ جگہ اس جگہ کے بالکل سامنے تھی جہاں مجھے بٹھایا گیا تھا۔ دلائی لامہ مجھے دیکھتا رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں سے کچھ چنگاریاں نکل رہی ہوں اور میرے دماغ میں پیوست ہو رہی ہوں۔ میں نے بھی اس پر سے نگاہیں نہیں ہٹائیں۔ کچھ لمحے ہم دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے، پھر دلائی لامہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر کھنچ گئی اور اس کی آواز ابھری۔

"ہاں! تو کہتا ہے کہ تیرا وجود اس کائنات کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ تو بہت بڑا سچ ہے اور سچائی انسانیت کا دوسرا نام ہے۔ جو انسان ہوتے ہیں وہ سچے ہوتے ہیں اور جو ہوس کے ہاتھوں حیوان بن جاتے ہیں ان کا سارا جیون جھوٹ بن کر رہ جاتا ہے۔ سیوک سندھورتی، وردان سادھانی، تم لوگوں سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ بہت بڑی غلطی۔ یہ تم سے کیا کہتا رہا ہے مجھے بتاؤ؟"

"مقدس رہنما! اس نے کبھی اپنے آپ کو مہتر بدھ تسلیم نہیں کیا۔ اس کے ذہن میں وہ وسعتیں نہیں آئیں جو اسے دھرم کی طرف راغب کرتیں۔"

"بیوقوفو! سارے دھرم سچے ہوتے ہیں۔ اس دھرم کا نام بتا دو مجھے جو تمہیں برائیوں کی طرف لے جاتا ہو، جو تم سے کہتا ہو کہ انسان سے انسان کا جیون چھیننا ثواب ہے۔ جو تم سے کہتا ہو کہ کسی مظلوم کی آہوں پر کان بند کر لینا اچھی بات ہے۔ جو تم سے کہتا ہو

کہ غریبوں سے ان کا حق چھین لینا اچھی بات ہے۔ نہیں...... ہر دھرم نیکیوں کے راستے دکھاتا ہے چاہے بدھ مت ہو چاہے اسلام۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ لوگ خود دین دھرم کے اصولوں کو پیچھے چھوڑ کر صرف اپنی واسناؤں کو اپنا دھرم بنا لیتے ہیں۔ پاپیو! اس نے اس لئے اپنے آپ کو مہتر نہیں تسلیم کیا کہ یہ مہتر نہیں ہے۔"

دلائی لامہ کی آواز رُکی تو چاروں طرف ایک غلغلہ سا مچ گیا۔ لوگ چیخ چیخ کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ اتنا شور ہوا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دی۔ کچھ لمحے اسی طرح گزر گئے۔ پھر دلائی لامہ کی آواز ابھری۔

"خاموش ہو جاؤ۔ میری پوری بات سن لو۔ ہاں...... یہ مہتر نہیں ہے اور یہ برا انسان بھی نہیں ہے۔ ورنہ جس طرح دین دھرم کے باسیوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ مہتر بدھ ہے اور وہ اسے وہ تمام قوتیں دینے پر راضی ہو گئے جنہیں اگر یہ مکمل طور پر حاصل کر لیتا تو بہت بڑی طاقت بن سکتا تھا اور اس کے بعد تم لوگ تو دھوکے ہی میں رہتے۔ یہ تم پر راج کرتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ پہلی بات تو یہ کہ یہ ایک سچے دین کا پیروکار ہے۔ مذہب اسلام نیکیوں اور سچائیوں کے تمام اصولوں سے سجا ہوا ہے اور اگر کوئی ان اصولوں کو مان لے تو وہ بھٹک نہیں سکتا۔ یہ ایک مسلمان کا بیٹا ہے۔ برائیاں تو ہر انسان میں ہوتی ہیں لیکن دین دھرم ان برائیوں کو چھپا لیتے ہیں۔ اس نے تمہاری بات تسلیم نہیں کی اور انسانوں کی طرح ہی زندگی گزاری۔ پھر بڑی بات یہ کہ یہ لالچی نہیں تھا کہ خزانوں کے پھیر میں آ کر دھوکے کی زندگی اپنا لیتا، یہ ایک اچھا انسان ہے اور اچھے انسانوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا ہی چاہئے۔ یہ دوسرے اچھے انسان کا اصول ہوتا ہے اور میں تمہیں وردان سادھانی! اور تمہیں خاقان جمشیدی! حقیقت بتانا چاہتا ہوں۔ قصور نہ وردان سادھانی کا ہے نہ تمہارا۔

تم اس دن اپنے باپ کے ساتھ شکار کھیلتے ہوئے دھرم شوالہ پہنچے جہاں مہاتما بدھ کا مجسمہ ایستادہ ہے اور پھر تمہیں نیند آئی تو تم مہانی بدھوتی کے چرنوں میں سو گئے۔ ان کی آغوش میں لیٹ گئے۔ یہ ہمارا دھرم سرندھ ہے کہ مہتر بدھ جو ہر صدی میں دھرم استھان کرتا ہے، شو مہاراج کے چرنوں ہی میں نمودار ہوتا ہے اور دھرم سیوک اس کی آمد کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ پھر جب وہ مہاتما بدھ کے چرنوں میں نمودار ہوتا ہے تو اسے لے آیا جاتا ہے، اس کی پرورش کی جاتی ہے، اسے سنسار کی نیکیوں سے روشناس کرایا جاتا

ہے، اسے پوتر اور پاک رکھا جاتا ہے تاکہ وہ عقل پانے کے بعد دھرم کا پالن ہار بن جائے۔ جب تم شکار کھیلتے کھیلتے وہاں جا کر مہاتما بدھ کے چرنوں میں سو گئے تو وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی نے تمہیں دیکھا اور یہی سمجھے کہ مہتر بدھ کا سکنڈ ہو گیا ہے اور پھر انہوں نے تمہیں مستقبل کا مہتر بدھ سمجھنا شروع کر دیا اور تمہارے لئے تمام راستے سجائے جانے لگے۔ لیکن تم ظاہر ہے مہتر بدھ نہیں تھے۔ تم نے وہی سب کچھ کیا جو سنسار میں رہنے والے کرتے ہیں، کہیں اچھا کہیں برا۔ تم سنسار کی تمام مشکلوں میں گھرے۔ یہ لوگ تمہاری سہاتا بھی کرتے رہے۔ پرنتو تم تو سنسار باسی تھے، جو تمہارے من میں آیا وہی کرتے رہے۔ اور آخر کار یہ باولے تمہیں یہاں تک لے آئے اور تم سے یہ سب کچھ چاہنے لگے۔ وردان سادھانی! مہتر بدھ ابھی تک نہیں پہنچا ہے لیکن وہ شو مہاراج کے چرنوں میں آ چکا ہے۔ دیکھو...... میں تمہیں دکھاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر دلائی لامہ نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے اور سامنے کے حصے میں ایک تصویر سی ابھرنے لگی۔ میں نے حیرت اور دلچسپی سے دیکھا کہ پھولا کھانچن کا دھرم شوالہ نگاہوں کے سامنے واضح ہونے لگا۔ وہ تمام راستے نظر آنے لگے جو میرے جانے پہچانے تھے۔ وہ جگہ نظر آنے لگی جب میں سیتا گڑھی سے کچھ فاصلے پر والد صاحب کے ساتھ شکار کھیلنے گیا تھا اور پھر راستہ بھٹک کر وہاں تک پہنچا تھا جہاں وہ عظیم الشان مجسمہ تھا۔ اس مجسمے کی آغوش میں مجھے نیند آ گئی تھی۔

یہ مجسمہ نہ صرف میری بلکہ تمام لوگوں کی نگاہوں کے سامنے تھا اور دس گیارہ سال کا ایک خوبصورت سا بچہ اس مجسمے کی آغوش میں سو رہا تھا۔ اتنا حسین اور پُر وقار بچہ تھا یہ کہ دیکھ کر دل اس کی جانب کھنچتا تھا۔ دلائی لامہ کی آواز ابھری۔

"اوم نموتی...... اوم نموتی...... اوم دھرم نموتی۔"

وہاں جتنے افراد تھے ان کے سر جھک گئے۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور ہر طرف سے اوم نموتی کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ تب دلائی لامہ نے کہا۔

"اور وردان سادھانی، سیوک سندھورتی! جاؤ اور جنم لینے والے مہتر بدھ کو اپنی تحویل میں لے لو۔ تمہارا کام وہاں سے شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ہے اصل مہتر بدھ تمہیں جس کی پرارتھنا کرنی پڑے گی۔ اور اس کے بعد تمہیں اسے اپنا سندھان بنانا ہو گا۔"

چاروں طرف ایک شور مچ گیا تھا۔ اوم نموتی، اوم نموتی کی آوازیں ہر طرف سے اُبھر

رہی تھیں۔ بدھ راہبوں نے مندر سے بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہاں صرف دس پندرہ راہب رہ گئے۔ یہ بھکشو دلائی لامہ کے گرد بکھرے ہوئے تھے۔

تب دلائی لامہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بڑے اور اچھے انسان! تم نے ہمارے دھرم کو خراب کرنے کی بجائے اس کی سیوا کی ہے۔ تم نے وہ کیا ہے جو کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ تم نے اس عظیم الشان خزانے کو بھی اہمیت نہیں دی۔ کیونکہ تم اندر سے اس خزانے سے کہیں زیادہ بڑے ہو۔ ہمیں بتاؤ کہ اب ہم تمہاری کیا سیوا کریں؟ تم جب تک چاہو ہمارے مہمان رہ سکتے ہو، جب چاہو یہاں سے جا سکتے ہو۔ ہم تمہیں ہر طرح کی مدد دیں گے۔"

"خیر، مجھے کسی کی مدد درکار نہیں ہے۔ اگر میری زندگی کے کچھ حالات آپ کو معلوم ہیں بزرگ راہب! تو ان میں سے کچھ باتیں اہم ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہندوستانی پولیس، انگریز حکومت مجھے ایک مجرم سمجھتی ہے اور ایک بڑے افسر کے قتل کے الزام میں میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ میں یہاں آ گیا ہوں لیکن میرے ذہن میں یہ خیال ہے کہ اب اگر میں اپنی دنیا میں واپس جاتا ہوں تو مجھے اس مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"دھرم سدھو...... سہاگ منی! ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ہم تو سنسار کے کمزور ترین لوگ ہیں۔ لیکن جو کچھ ہمیں دیا گیا ہے اس کا سہارا لے کر میں پہلی بات تم سے یہ کہتا ہوں خاقان جمشیدی! کہ ان تمام متعلقہ محکموں، اداروں، انسانوں کے ذہن سے یہ بات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹا دی گئی ہے کہ تم نے ہندوستان میں کوئی جرم کیا ہے اور تم پولیس کو درکار ہو۔ اگر کوئی تمہاری نشاندہی بھی کرے گا تو کبھی کوئی تسلیم نہیں کرے گا کہ ایسا کوئی جرم تم سے سرزد ہوا ہے۔ سمجھ لو تمام متعلقہ لوگوں کے ذہن سے یہ بات مٹا دی گئی ہے اور یہ بالکل جھوٹ یا دھوکا نہیں ہے۔ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہی سچ ہے۔ اور جب تم نے ہم سے جھوٹ نہیں بولا تو ہم بھی تم سے جھوٹ نہیں بولیں گے۔ اب تم انگریز حکومت کے مجرم نہیں رہے اور ہندوستان بھر میں آزاد ہو۔ اس کے علاوہ ہم چار محافظ تمہارے اردگرد اکٹھا کرتے ہیں۔ تمہارے دشمنوں کو یا انہیں جو تمہیں نقصان پہنچانا چاہیں گے یہ چاروں سنبھال لیں گے اور تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچنے دیں گے چاہے دن ہو یا رات۔ اس کے علاوہ تمہیں اس خزانے میں سے جو کچھ چاہئے ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں کہ وہ لے لو۔ یہ تو ہماری طرف سے پیشکش ہے۔ اس کے بعد تم بتاؤ تمہیں کیا چاہئے؟"

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ "انسانی خواہشات اتنی ہی ہوتی ہیں کہ زندگی سکون اور آرام سے گزر جائے اور اس کے لئے میرے پاس معقول بندوبست ہے۔ خوف صرف یہی ہے کہ ہندوستان واپس جانے کے بعد انگریز حکومت مجھے پریشان نہ کرے۔"

"اس بارے میں تمہیں ہم پر بھروسہ کرنا ہو گا اور بہت مختصر وقت تمہیں یہ بتا دے گا کہ ہم نے جو کچھ کہا ہے غلط نہیں کہا ہے۔"

"نہیں، مجھے اس بات کا یقین ہے کہ آپ لوگ غلط نہیں کہیں گے۔"

بہرحال یہ سارے معاملات چلتے رہے اور اس کے بعد ایک دن مجھے یہاں سے رخصت کر دیا گیا۔ دلائی لامہ نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ ثابت ہوا تھا۔ جو منظر اس نے یہاں دھرم شوالہ میں دکھایا تھا وہ شو مندر میں حقیقی شکل میں موجود تھا یعنی ایک ایسا بچہ جو مستقبل کا مہتر بدھ تھا۔

میں وہاں سے چل پڑا۔ میرا سفر بے مقصد ہی تھا۔ اپنے ساتھ میں نے بہت بڑی رقم نہیں لی تھی بس ضروریات کی کچھ چیزیں۔ رخ سیتا گڑھی کی طرف ہی تھا۔ اعتماد بے شک تھا لیکن پھر بھی محتاط رہنا چاہتا تھا۔ جن چار محافظوں کو میرے ساتھ بھیجا گیا تھا وہ البتہ میرے لئے بہت ہی پراسرار شخصیتوں کے مالک تھے۔ میں نے ان چاروں کو دیکھا تھا جو اپنے چہرے کے نقوش سے پتھر کے لوگ معلوم ہوتے تھے اور اس طرح میری ہر بات پر سر جھکاتے تھے جیسے انسان نہ ہوں مشین ہوں۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ یہاں تک کہ سفر کے دوران میں نے یہ بات بھی محسوس کی تھی کہ وہ کسی دوسرے کی نگاہوں میں نہیں آتے۔ اور میں نے یہ سوال ان سے کر ہی ڈالا۔

"سنو...... کیا دوسرے لوگ تمہیں نہیں دیکھ سکتے؟"

"نمی ستو...... ہم آپ کے خادم ہیں، صرف آپ کے۔ اور ہمیں صرف آپ ہی دیکھ سکتے ہیں۔ نہ کوئی ہمیں چھو سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے۔ ہم اپنی ضروریات بھی خود ہی پوری کر لیتے ہیں۔ آپ کی طرف سے ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں نمی ستو...... جس چیز کی آپ کو طلب ہو بس ایک بار اس کا نام لے دیں، وہ آپ کو حاضر کر دی جائے گی۔"

یہ واقعی ایک بہت بڑی تقویت تھی اور مجھے اپنے آپ پر اعتماد ہوتا جا رہا تھا۔ سیتا گڑھی تک کے سفر کے دوران میں اپنے ان تمام رشتوں کو یاد کرنے لگا جن سے پہلے کبھی

مجھے کوئی رغبت نہیں رہی تھی۔ میں نے تو زندگی میں صرف دو ہی کردار دیکھے تھے، ماں اور باپ۔ حالانکہ والد محترم نے بڑے جھنڈے گاڑے تھے اور وہ جھنڈے آج بھی سیتا گڑھی کے مختلف حصوں میں لہرا رہے تھے۔ انہیں میرے ہی خاندان سے منسوب کیا جاتا تھا اور ان میں وہ نرس صاحبہ بھی تھیں جنہوں نے میری پیدائش کرائی تھی اور جنہیں والد صاحب نے بعد میں نئی بیگم کا اعزاز دے دیا تھا بلکہ شاید یہی ان کی آخری بیگم تھیں۔ بھلا ہمدان جمشیدی جیسے شخص کے لئے اتنی ساری بیویاں پال لینا کون سا اہم مسئلہ تھا۔ وہ سبھی کی پرورش کر سکتے تھے اور سبھی کا انتظام موجود تھا۔ یہ تمام تفصیلات تو مجھے سیتا گڑھی پہنچنے کے بعد معلوم ہوئیں۔

بہرحال ایک دلچسپ عمل تھا۔ انسان کی زندگی کے مختلف ادوار ہوتے ہیں اور ان مختلف ادوار میں اس کے مختلف شوق۔ مثلاً بچپن میں والد نے سیر و شکار کی عادت ڈال دی تھی اور لگتا تھا کہ زندگی اسی میں گزر جائے گی۔ لیکن بعد میں حالات تبدیل ہو گئے۔ سیر و شکار کی منزل سے نکلا تو تعلیم کی دنیا میں بھیج دیا گیا۔ تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد عملی زندگی میں لایا گیا۔ بے شک وہاں سے حالات بگڑ گئے۔ لیکن پھر جو فیصلے کئے وہ اپنی مرضی سے کئے اور اپنی مرضی کے ان فیصلوں میں ایلس فیوری، عالیہ، امینہ اور دوسرے کردار شامل تھے۔ یہاں تک کہ ہشمان ذکری، ہیگ اور نجانے کون کون۔ پھر گاشر برم اور اس کے بعد کے سارے چکر۔ لیکن اب سیتا گڑھی آنے کے بعد جب میں نے سیتا گڑھی کی فضاؤں میں قدم رکھا تو نجانے کیوں دل میں بہت سے جذبے ابھر آئے۔ کچھ رشتے، کچھ ناطے، کچھ اپنے، کچھ بیگانے۔ سیتا گڑھی میں تو خیر دوست وغیرہ نہیں تھے البتہ کلکتے میں بہت سی شناسائیاں ہو گئی تھیں۔ لیکن یہ خوف دل سے نہیں نکال سکا تھا کہ کلکتہ میرے لئے خطرناک ہو سکتا ہے اور کلکتہ جانے کے بارے میں بالکل نہیں سوچا تھا۔

آخر کار سیتا گڑھی کی حویلی پر پہنچ گیا۔ حویلی کی شکل دیکھ کر دل میں بہت سے خیالات جاگ اٹھے تھے۔ یہی کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے بچپن کو کبھی نہیں بھولتا اور بچپن بھی اسے کبھی نہیں بھولتا۔ حویلی کا عظیم الشان پھاٹک جو انتہائی موٹی اور مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا، آج بھی پورے وقار کے ساتھ گردن اٹھائے ہوئے تھا۔ ذیلی کھڑکی کی دوسری طرف بابا نظام ہوا کرتے تھے، مضبوط اور طاقتور جسامت کے مالک جنہوں نے پوری زندگی حویلی کے اس داخلی دروازے کی حفاظت کی تھی۔ میں نے ذیلی کھڑکی کو تھوڑا

دھکیلا تو وہ کھل گئی۔ لیکن بابا نظام دوسری طرف موجود نہیں تھے۔ ڈیوڑھی میں چارپائی بچھی ہوئی تھی، اس پر بستر اور تکیہ بھی تھا۔ لیکن یہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ بابا نظام اب یہاں ڈیوٹی پر نہیں ہیں۔ اسی وقت ایک جوان آدمی بھاگا ہوا آیا اور مجھے گھورتا ہوا بولا۔

"بغیر اجازت اندر کیسے گھس آئے بھائی، کسی سے پوچھا گچھا؟"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ نیا دربان معلوم ہوتا تھا۔ میں نے کہا۔ "کوئی تھا ہی نہیں دروازے پر۔ کس سے پوچھتا؟"

"اب بحث بھی کرو گے۔ بتاؤ کس سے ملنا ہے؟"

"سب سے ملنا ہے۔ کون کون ہے یہاں؟ کون مل سکتا ہے؟"

"تمہیں کس سے ملنا ہے، یہ بتاؤ؟"

"ہاں مجھے کس سے ملنا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ طارق صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"وہ سامنے کھڑے ہیں۔" اس شخص نے اشارہ کیا اور میں آگے بڑھا تو اس نے جلدی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"پھر وہی...... ارے کون ہو؟ کیا ہو؟ اپنی شناخت تو کراؤ۔"

"رہنے دو یار۔ میں مل لوں گا ان سے جا کر۔ میری شناخت خودبخود ہو جائے گی۔ تمہارے حق میں یہ بہتر ہے کہ تم میری شناخت نہ حاصل کرو۔"

"باہر نکلو...... چلو باہر جا کر کھڑے ہو۔ نام پتہ بتاؤ...... گھر ہے یہ، بڑے آدمیوں کا گھر ہے۔ طریقہ سلیقہ سیکھو۔ شناخت کرائے بغیر تم اندر نہیں جا سکتے۔"

"شناخت چاہتے ہو میری؟" میں نے کہا۔

"بالکل...... بالکل چاہتے ہیں۔ تم باہر نہیں نکلو گے؟"

دوسرے لمحے میرا مضبوط تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ پٹاخے کی آواز ہوئی اور وہ ٹیڑھے منہ کے ساتھ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن پھر یوں لگا کسی نے اس کے لات ماری ہو۔ اس نے قلابازی کھائی اور نیچے جا گرا۔ تبھی کسی نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا۔ دوسری قلابازی، تیسری اور پھر چوتھی اور اس کے بعد وہ لمبا پڑ گیا۔ طارق جمشیدی نے دور سے یہ اچھل کود دیکھ لی تھی۔ چنانچہ وہ حیرت سے اس طرف مڑے۔ یہ طارق جمشیدی صاحب ماضی قدیم کے آدمی تھے یعنی اس وقت کے جب میرے والد زندہ تھے اور میرے والد

کے چچا زاد بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ چچا کا تو خیر عالم جوانی میں ہی انتقال ہو گیا تھا لیکن طارق جمشیدی صاحب اپنی پوری فیملی کے ساتھ یہیں ہوا کرتے تھے۔ اس وقت بھی ان کی صحت قابل رشک تھی۔ دیکھنے دکھانے سے تعلق رکھتے تھے اور بذاتِ خود بڑے تیز طرار تھے۔ یہ ہنگامہ آرائی دیکھ کر اس طرف لپکے اور تیزی سے قریب آ گئے۔ انہوں نے دربان کو بے ہوش پڑے ہوئے دیکھا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔

"یہ...... یہ کیا ہوا؟"

"پتہ نہیں۔ بیچارے کو کوئی مرض معلوم ہوتا ہے۔ پہلے تو مجھ سے کہنے لگا کہ میں اپنی شناخت کراؤں۔ میں نے صرف ایک تھپڑ مارا تھا، بعد میں اس نے کئی قلابازیاں کھائیں اور بے ہوش ہو گیا۔

"تم نے اسے تھپڑ مارا تھا؟" طارق جمشیدی نے کہا۔

"جی چچا جان! اب بھلا اپنی شناخت کس طرح کراتا اسے؟"

"چچا جان......؟" طارق جمشیدی نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور اس کے بعد مجھے گھورنے لگے۔ پھر ان کی آنکھوں میں حیرت کے نقوش ابھرے اور اس کے بعد ان کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو گیا۔

"تت...... تم...... تم خاقان......"

"خدا کا شکر ہے۔ آپ کے دربان نے تو مجھے نہیں پہچانا، آپ ہی نے پہچان لیا۔ بڑی مہربانی آپ کی۔ ویسے یہاں بابا نظام ہوا کرتے تھے، وہ کہاں گئے؟"

"ارے، ارے تم آؤ...... آؤ...... ارے تم...... ارے تم زندہ سلامت ہو۔"

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ "پتہ نہیں میرے زندہ سلامت ہونے سے آپ کو خوشی ہوئی ہے یا دُکھ۔"

"تم واپس آ گئے خاقان، تم واپس آ گئے؟" چچا جان کے انداز میں اب بھی وہی حیرت اور وحشت تھی پھر مجھ سے کچھ کہے بغیر تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اندر دوڑ گئے۔ میں ان کی اس بوکھلاہٹ پر مسکرا رہا تھا۔ دنیا داری سے بہت زیادہ واسطہ نہیں پڑا تھا لیکن اب عمر کی اس منزل میں تھا کہ بے عقلی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اتنی عقل رکھتا تھا کہ یہ جان سکوں کہ میری آمد سے کسے کسے کیا نقصان اور کیا دُکھ ہو سکتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد حویلی کے سارے کردار ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ رشتے کی

ایک پھوپھی جان تھیں جنہیں والد صاحب بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے، جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ بے اولاد تھیں اس لئے ان کے زیادہ مسائل نہیں تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے چچا، تایا زاد بہن بھائی، کچھ بزرگ، یہ سارے کے سارے یہاں موجود تھے اور مجھ سے اپنی محبتوں کا اظہار کر رہے تھے۔ البتہ چند ہی لمحوں میں ایک بات میں نے بخوبی محسوس کر لی تھی کہ یہاں اقتدار طارق جمشیدی کے پاس ہی ہے۔ طارق جمشیدی کے علاوہ دو اور چچا حضرات بھی تھے جو اپنے خاندانوں کے ساتھ یہیں رہا کرتے تھے۔ یہ طارق جمشیدی کے سگے بھائی نہیں تھے بلکہ والد صاحب کے اور دوسرے رشتے داروں میں سے تھے۔

چنانچہ سب کی محبتوں کے ڈونگرے برسنے لگے۔ میں ان سب سے بہت محبت سے پیش آ رہا تھا۔ پھوپھی رقیہ بیگم نے بہت دیر تک مجھے سینے سے لگائے رکھا تھا اور روتی رہی تھیں۔ طارق جمشیدی صاحب بھی بڑی محبت کا اظہار کر رہے تھے اور اب ساری حیرانی دور ہو گئی تھی۔ طرح طرح کے سوالات کئے جا رہے تھے۔

"کہاں رہے بیٹے؟ تم تو اس طرح گم ہو گئے جیسے آسمانوں میں کھو گئے ہو۔ نجانے کہاں کہاں تلاش کیا ہم نے تمہیں۔ ہمدان بھائی مرحوم اور بھابی صاحبہ رو رو کر اندھے ہو گئے تھے تمہارے لئے۔ پتہ نہیں کیا کیا الزامات عائد کئے گئے تم پر۔ یہ انگریز حکومت بھلا کسی کی دوست ہو سکتی ہے۔ بہت سے لوگ آتے جاتے رہے تمہاری تلاش میں۔"

"جی چچا جان! ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ انگریز حکومت کے لئے اس لئے قابل توجہ تھا کہ وہ مجھے افسر اعلیٰ بنانا چاہتی تھی اور میں نے انگریز کی نوکری کرنا قبول نہیں کیا۔"

بہرحال یہ ساری باتیں ہوتی رہیں اور میں ان سب کی سنتا رہا۔ طارق جمشیدی نے بظاہر تو بڑی محبت کا ثبوت دیا تھا لیکن مجھے اس کی آنکھوں کی مکاری بہت عجیب لگ رہی تھی۔ یوں اس حویلی میں میری آمد بظاہر تو بڑی خوشگوار محسوس کی گئی تھی۔ بہت سے رشتے ناطے دار تھے، لڑکیاں بالیاں بھی تھیں، سارے کے سارے تھے۔ لیکن مجھے اپنے ماں باپ کی کمی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔

پھر مجھے آرام کے لئے میرے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ بڑا شاندار کمرہ تھا۔ اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے آراستہ۔ طارق چچا نے کہا۔

"بس یوں سمجھ لو خاقان! دن رات تمہارے بارے میں بات چیت ہوا کرتی تھی۔ کسی نہ کسی موقع سے تمہارا ذکر نکل ہی آیا کرتا تھا۔ بھلا تم کوئی بھلائے جانے کے قابل

تھے؟ یہ کمرہ تمہارے لئے ہی تیار رکھا گیا تھا۔ اور کیسی کیسی دعائیں نہیں مانگتے تھے ہم کہ معبودِ الٰہی! اس کمرے کے مکین کو ضرور بھیجنا۔ ہماری آنکھیں اسے دیکھنے کو ترستی ہیں۔ اللہ نے ہماری دعا پوری کر دی بیٹا! بہت خوش ہیں تمہاری آمد سے ہم۔"

"کیوں نہیں چچا جان۔"

"بیٹا! ایک بات بتاؤ، کہیں ملک سے باہر رہتے ہو؟"

"رہتا تھا چچا جان! اب سب کچھ ترک کر کے گھر واپس آ گیا ہوں۔ ظاہر ہے یہ گڑھی بھی میری رہائش گاہ ہے۔ کہیں نہ کہیں تو وقت گزارنا ہی ہوگا۔"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ کہیں نہ کہیں کیوں، تمہارا گھر ہے۔ بس اب یہیں رہو، عیش کرو۔ زندگی آرام سے گزارو۔"

"جی چچا جان۔"

محبتوں کے یہ ڈونگرے برستے رہے۔ رات کو آرام کرنے کے لئے لیٹا تھا اور نجانے کس کس کے بارے میں کیا کیا سوچتا رہا تھا۔

دوسرے دن پھر وہی ہنگامے تھے۔ سارے کے سارے مجھے گھیر کر بیٹھ گئے تھے۔ مجھ سے میرے بارے میں پوچھا جا رہا تھا اور بڑی ہنگامہ آرائیاں ہو رہی تھیں۔ میں نے بھی ان لوگوں میں خاصا دل بہلایا۔ شام کو کوئی سات بجے کا وقت تھا، پھوپھی رقیہ خانم کمرے میں آ گئیں۔ ایک بار پھر انہوں نے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور پھر بیٹھ گئیں۔

"بیٹا! ہمارا خون ہو۔ اور پھر وہ جو کہتے ہیں کہ ماں جائے ایک ذات پھوپھی بھتیجا ایک ذات۔ بیٹا، پھوپھی ہوں میں تمہاری۔ یہ سچ ہے کہ سگی پھوپھی نہیں ہوں لیکن سگا سوتیلا کیا ہوتا ہے، اللہ ہی بہتر جانے۔ جان جاتی ہے تم پر۔ مجبوری کا نام صبر ہے۔ بیٹھ گئے تمہیں یاد کر کر کے۔ ہمدان بھیا گئے تو سمجھ لو کہ دنیا ہی ختم ہو گئی۔ ارے دشمنوں نے کیا کیا عیش کئے ہیں۔ دیکھو بیٹا! برا مت ماننا اور یہ نہ سمجھنا کہ میں کسی کی غیبت کر رہی ہوں۔ طارق جمشیدی سب سے زیادہ چالاک نکلے۔ ایک ایک کو شکست دے دی انہوں نے اور ہر چیز کے مالک بن بیٹھے۔ کہیں سے ایک جعلی وصیت نامہ بھی تیار کرا لیا جس میں یہی کہا گیا تھا کہ اگر میرا بیٹا نالائق نکلے اور زمین اور جائیدادوں کا کاروبار نہ سنبھال سکے تو پھر طارق جمشیدی ہر چیز کے نگراں ہوں گے اور انہی کی مرضی سے حویلی اور زمینوں کے معاملات چلیں گے۔ دور دور کی ساری زمینیں بیچ دیں۔ پیسہ بینکوں میں ڈلوا

دیا۔ خود ان کا منافع کھاتے ہیں اور نیک نام بھی بنے ہوئے ہیں۔ بات یہ کہی کہ اب اتنی دور کی زمینوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ باقیوں پر تو انہیں کسی طرح اعتماد نہیں ہے۔ دونوں بیٹے ہیں کہ نکمے پن کی اعلیٰ مثال، چھٹے ہوئے غنڈے بدمعاش ہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ طارق جمشیدی نے احمد اور شاہنواز کو غنڈہ بنایا ہے تاکہ زمینوں پر قبضہ قائم رکھیں۔ بیٹی ہے کہ آفت کی پرکالہ۔ طارق جمشیدی نے ہر ایک شخص کو اپنے پیروں میں جھکا رکھا ہے۔ اب اسی کی بنتی ہے جو طارق جمشیدی کے جوتے چاٹے۔ باقی تمہارے دونوں چچا صرف طارق جمشیدی کے باج گزار ہیں۔ وہ بیچارہ حافظ تو حویلی سے ہی نکال دیا گیا۔ چھوٹی سی جھونپڑی لے کر بیٹھ گیا ہے بیوی بچوں کے ساتھ۔"

"ارے ہاں، ہمارے ماموں حافظ بھی تو تھے۔ کیا کہا آپ نے ان کے بارے میں پھوپھی جان! کہاں چلے گئے وہ؟"

"بیٹا، جاتے کہاں۔ ذرا خوددار تھے۔ نکال دیئے گئے حویلی سے۔ طارق جمشیدی کی ہر الٹی سیدھی ماننے پر، ہر بات پر ہاں میں ہاں ملانے پر تیار نہ ہوئے تو راندۂ درگاہ ہو گئے اور بھگا دیئے گئے حویلی سے۔ عزت لے کر نکل گئے حویلی سے۔ اب چھوٹا موٹا کماتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ لیکن اچھا ہے بیٹا، خودداری اور عزت بھی کوئی چیز ہے۔"

"مگر چچا جان کو یہ حق کس نے دیا؟ ماموں حافظ تو واقعی بہت اچھے آدمی تھے۔ مجھے تو یاد ہی نہیں آئے۔ میرے والد اور والدہ انہیں بہت زیادہ عزت اور حیثیت دیتے تھے۔"

"یہی بات تو دشمنوں کے کلیجوں میں چبھتی تھی، سانپ بن کر لوٹتی تھی۔ وہ کھری کہتے تھے۔"

"کہاں ہیں وہ پھوپھی؟"

"بیٹا! الیاس کو معلوم ہے۔ الیاس تمہیں بتا دے گا۔"

"الیاس کون ہے؟"

"نوکر ہے گھر کا۔ اسے حافظ کے گھر کا پتہ معلوم ہے۔"

"میں ضرور جاؤں گا ان کے پاس۔"

"بیٹا! ایک بات کہوں تم سے؟"

"جی پھوپھی جان، ضرور کہئے۔"

"دیکھو، میری تو کوئی اولاد ہے نہیں۔ دو وقت کی روٹی اور کپڑے کے علاوہ میری

زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ جب تک بھی زندگی ہے جی لوں گی۔ اور جب زندگی ختم ہوگی تو اس بات کا تو اللہ پر پورا پورا بھروسہ ہے کہ قبر اور کفن مل ہی جائے گا۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ لیکن ایک بات میں تمہیں بتائے دیتی ہوں، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری آمد سے ان لوگوں کو خوشی ہوئی ہے تو بیٹا! یہ خیال دل سے نکال دینا۔ اب تو ہزاروں وسوسوں نے جنم لیا ہوگا۔ جس جائیداد اور دولت پر ناگ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں یہ لوگ اب اس کا حساب کتاب دینا پڑے گا۔ ذرا ہوشیار رہنا، کہیں دشمن تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔"

"آپ فکر نہ کریں پھوپھی جان! میں ہوشیار رہوں گا۔"

اپنی آرام گاہ میں آ کر میں نے پھوپھی جان کی باتوں پر غور کیا، خوب مزہ آیا۔ گھروں میں یہ حالات ہوا ہی کرتے ہیں اور جہاں تک چچا طارق کا معاملہ تھا تو ان کے چہرے کی مکاری ہی یہ بتاتی تھی کہ بڑے زمانہ ساز آدمی ہیں اور یقینی طور پر خاصے گڑبڑ ہیں۔ ان کی طرف سے ہوشیار رہنا بڑا ضروری ہے۔ دفعتہً ہی میرے چاروں محافظوں میں سے کسی ایک نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"ہم آپ کے اردگرد ہیں جناب! لیکن اگر آپ کہیں کسی جگہ سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔"

میں چونک پڑا۔ میں نے کہا۔ "کیسے؟"

"یہ دیکھئے...... یہ وہ کمرہ ہے جہاں آپ کے چچا طارق جمشیدی رہتے ہیں۔ اس کے اندر کے ماحول کو دیکھ لیجئے۔ ہم ہر اس جگہ کو آپ کے سامنے نمایاں کر دیں گے جس کی فرمائش آپ ہم سے کریں گے۔"

اب میں واقعی دلائی لامہ کے دیئے ہوئے اس انعام کا دل سے قائل ہوا۔ یہ تو بڑے کمال کی بات تھی کہ میں اس طرح اپنے دشمنوں سے یا پھر اپنے خلاف کچھ کرنے والوں سے باخبر رہوں۔ میں نے کہا۔

"سنو...... کیا یہ کام تم ہمیشہ کر سکتے ہو؟"

"آپ کے حکم کے مطابق نمی ستو...... آپ ہمارے محسن ہیں اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم آپ کی ہر خواہش اور ضرورت پوری کر سکیں جو ہمارے بس میں ہو۔"

"ذرا ان آوازوں کو میرے لئے نمایاں کرو۔" میں نے کہا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سامنے وہ فلم چل رہی ہو یا وہ جیتے جاگتے کردار میرے پاس پہنچ گئے ہوں۔

چچا طارق جمشیدی مسہری پر بیٹھے ہوئے پائپ پی رہے تھے۔ چچی صاحبہ متفکر ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں اور غالباً کسی کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ پھر وہ دونوں نوجوان آ گئے جن کے چہروں پر میں نے کینہ توزی کی جھلک دیکھی تھی۔ تعارف کراتے ہوئے مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ احمد اور شاہنواز ہیں، طارق جمشیدی کے دونوں بیٹے۔ اور ان کے بارے میں پھوپھی جان نے بتایا تھا کہ انہیں باقاعدہ غنڈہ بنایا گیا ہے۔ میں حیرت اور دلچسپی سے یہ مناظر دیکھ رہا تھا۔

یہ مناظر جس طرح میری نگاہوں کے سامنے نمایاں ہوئے تھے وہ ایک انتہائی دلچسپ عمل تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ چلو ٹھیک ہے۔ وہ سارے ہنگامے تو پس پشت رہ گئے۔ اب نہ لوح کا کوئی چکر ہے اور نہ مہتر بدھ بننے کے لئے کوئی مسئلہ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دوران مجھے جیسی مراعات سے نوازا گیا تھا، کوئی اور ہوتا تو ان سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا۔ میں نے تو ان چیزوں کو بہت ہی سرسری انداز میں لیا تھا ورنہ بھوج پتر جیسی چیز جو آنے والے لمحات کا پتہ دیتی تھی اور یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے سخت دہشت اور سنسنی پھیل جاتی تھی۔ بات اگر اتفاقیہ طور پر کچھ ہو جائے تو الگ حیثیت رکھتی ہے اور اگر اس کے بارے میں تفصیلات معلوم ہوں تو پھر وہ مزید خوفناک ہو جاتی ہے۔ لیکن میں نے کبھی اسے باقاعدہ استعمال ہی نہیں کیا اور اس سے نفرت ہی کرتا رہا۔ کتنی ہی بار میں نے بھوج پتر اٹھا کر پھینکا تھا لیکن بہرحال وہ صورتحال بھی الگ ہی تھی۔ مجھے حقیقت معلوم ہی نہیں تھی۔ اور جب حقیقت معلوم ہوئی تو بلاشبہ میں نے بھی ان لوگوں کو قابل معافی سمجھ لیا۔ انہوں نے جو کچھ بھی کیا تھا صرف غلط فہمی کی بنیاد پر کیا تھا۔ حقیقت تو بہرحال ایک دن عیاں ہونی ہی تھی۔ دلائی لامہ ایک صاحب علم انسان تھا۔ بہرحال بدھ مت کے پیروکاروں کی تعداد شاید دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے لیکن بڑا منظم اور پراسرار مذہب ہے یہ۔

میں اپنی سوچوں کے دائرے سے نکل آیا۔ کیونکہ مجھے دوسری طرف کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ طارق جمشیدی کہہ رہا تھا۔ "میں نے انتظار کیا تم لوگوں کا کہ تم خود آ کر اس بارے میں مجھ سے بات کرو۔ کیا تمہیں اس برے وقت کا کوئی احساس نہیں ہے جو اچانک ہی ہم پر نازل ہو گیا ہے؟"

"برا وقت؟"

’’ہاں، بہت برا وقت۔ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا ہم نے کہ خاقان جمشیدی اس طرح واپس آ جائے گا۔ یہ کس قدر خوفناک بات ہے کہ وہ واپس آ گیا ہے اور تم لوگ یہ بات جانتے ہو کہ یہ دولت، یہ جائیداد نہ تو ہماری موروثی ہے اور نہ ہی کسی قسم کے وہم کی پیداوار کہ ہم یہ ثابت کر سکیں کہ اس میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے۔ نہیں میرے بچو! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس میں سے ایک پیسہ بھی ہمارا اپنا نہیں ہے۔ یہ سب ہمدان جمشیدی کا چھوڑا ہوا ترکہ ہے اور وہ تنہا اس کے مالک تھے۔ ہم تو بس ایک طرح سے طفیلی ہیں، انہوں نے صرف رشتوں کی بنیاد پر اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ خاقان جمشیدی کو یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جائیداد میں کسی اور کا حصہ نہیں ہے، یہ بات تو ثابت ہے۔ ہندوستان بھر کی عدالتیں اس بات کو ظاہر کر سکتی ہیں۔‘‘

’’تو پھر؟‘‘

’’اُلو کے پٹھو...... پھر، پھر کی رٹ لگا رہے ہو۔ یہ سب کچھ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ بلکہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس کی جوابدہی کرنا مشکل ہو جائے گی۔‘‘

’’مگر بابا میاں! جوابدہی ہمیں کسے کرنا پڑے گی۔ خاقان جمشیدی کو؟‘‘

’’اب بھی تم یہ سوال کر رہے ہو؟‘‘

’’سوال نہیں کر رہے آپ سے، پوچھ رہے ہیں کیا آپ اسے اس قابل سمجھتے ہیں؟‘‘

’’اچھا...... کوئی کسی چیز کا مالک ہو تو آپ یہ سوال کریں گے کہ وہ اس قابل ہے یا نہیں کہ ہم اسے جواب دیں؟‘‘

’’اسے مالک تسلیم کون کرتا ہے؟‘‘

’’برطانوی حکومت کا قانون۔‘‘

’’ہوں...... اور آپ کے خیال میں حکومت برطانیہ اپنے ایک اعلیٰ افسر کے قاتل کو اس طرح آزاد چھوڑ دے گی۔‘‘

’’گڈ...... گویا یہ پوائنٹ تمہارے ذہن میں ہے۔‘‘

’’مگر ہم اس پوائنٹ سے کام نہیں لیں گے۔‘‘ احمد نے کہا۔

’’تو پھر؟‘‘

’’بابا میاں! نجانے آپ کیوں اتنے پریشان ہو رہے ہیں۔ آپ کو اپنے بیٹوں پر بھروسہ نہیں ہے؟ دو منٹ میں چٹنی بنا کر پھینک دیں گے اس کی۔ وہ ہے کیا بلا۔ آپ بس

حکم دے دیجئے، جب بھی آپ کہیں گے وہ آپ کو یہاں نظر نہیں آئے گا۔ ہم آپ کو بس یہی اطمینان دلا سکتے ہیں۔‘‘

’’وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میری بات سنو، ہر مسئلے کو اس طرح اتنی آسانی سے نہیں لیا جانا چاہئے۔ آج کا کام کل پر چھوڑنا بالکل مناسب نہیں ہوتا۔‘‘

’’کوئی پرواہ کی بات نہیں ہے۔ اتنے دن کے بعد وہ آیا ہے، اسے سیر کرانے لے جاتے ہیں۔ خاص طور سے ہمارا پالن باغ جو ہندوستان بھر میں سب سے اچھے آموں کے لئے مشہور ہے اور فصل بھی پک رہی ہے، ہمارے خاقان بھیا پالن باغ تو دیکھنا پسند کریں گے نا۔ اور پھر پالن باغ میں وہ کالا کنواں کس کام آئے گا۔ کتنی محنت سے بنایا ہے ہم نے اسے ہمارے اور بھی کچھ دوست اس کالے کنوئیں میں رہتے ہیں۔ خاقان بھیا کی ان سے ملاقات کرا دیں گے، بات ختم ہو جاتی ہے۔‘‘

’’اور دوسرے لوگوں سے کیا کہو گے؟‘‘ طارق جمشیدی نے سوال کیا۔

’’اول تو دوسرے لوگ ہیں ہی کون۔ ہم بھلا کسی کو کیوں جواب دیں گے۔ اور فرض کیجئے خاندان میں اگر کسی نے پوچھ بھی لیا خاقان جمشیدی بھیا کے لئے تو بتا دیں گے کہ لاپرواہ آدمی ہیں، نکل گئے ہوں گے کہیں گھومنے پھرنے۔ آ جائیں گے کبھی ٹہلتے ہوئے۔ اچھی پرواہ کی آپ نے۔‘‘ احمد نے بڑی لاپرواہی سے کہا۔ طارق جمشیدی کے چہرے پر بدستور تشویش کے آثار تھے۔ کچھ دیر وہ خاموش رہا، پھر اس نے کہا۔

’’دیکھو، میں پھر وہی بات کہوں گا۔ پوری عمر کا تجربہ ہے میرا۔ دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہئے۔ بہت سے مرحلے آ سکتے ہیں اس میں اور تمہیں ہر ایک کا نعم البدل سوچنا ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ تمہارے ساتھ جانے سے انکار کر دے۔ اور بھی بہت سے معاملے ہو سکتے ہیں۔‘‘

’’بات اصل میں یہ ہے کہ ہم آپ سے صرف ایک بات کہیں اور اس کے لئے ہم پر اعتماد کریں۔ آپ ہم سے یہ کہیں کہ میرے بچو، اس نازک صورتحال میں تم اپنی ذہانت اور فراست سے کام لو اور اس مسئلے کو نمٹا لو۔ بس اس کے بعد آپ بے فکر ہو جائیں۔‘‘

’’وہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن بس ایسے ہی ڈر لگتا ہے۔ کسی بھی معاملے کو اتنے معمولی انداز میں لینا خطرناک بات ہوتی ہے۔ لیکن بہرحال اگر تمہیں اپنے اس خیال پر اعتماد ہے تو دیکھ لو، جیسے مناسب سمجھو۔‘‘ طارق جمشیدی نے کہا۔

"آپ مطمئن ہو جائیے، تین دن کا وقت دے دیجئے ہمیں۔ تیسرے دن آپ کو خوشخبری سنا دیں گے۔ کالا کنواں آباد ہو جائے گا۔ پالن باغ ایک بہترین جگہ ثابت ہو گی۔" شاہنواز نے کہا اور طارق جمشیدی تعریفی انداز میں ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ میں نے تھوڑی دیر تک ان کے مزید بولنے کا انتظار کیا۔ پھر جب میں نے دیکھا کہ وہ دونوں اٹھ کر باہر نکل گئے تو میں نے گردن اٹھائی اور اپنے نادیدہ محافظوں سے کہا۔

"ٹھیک ہے بس۔"

اور اچانک ہی وہ منظر غائب ہو گیا۔ اب میرے سامنے سپاٹ دیوار کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ زندگی کے کتنے سارے روپ ہوتے ہیں، کسی کو کوئی اندازہ نہیں ہے۔ یہ لوگ میرے لئے اتنے پریشان تھے اور میرے خلاف اس طرح کی سازشیں کر رہے تھے۔ مقصد صرف ان کا اتنا سا تھا کہ یہ دولت جس پر ان کا بے جا تصرف تھا اور جسے وہ صحیح معنوں میں باپ کا مال سمجھ کر استعمال کر رہے تھے ان کے قبضے میں رہے۔ نجانے کیوں بہت ساری باتیں اپنی جگہ، حرص و ہوس کی بہت سی منزلیں طے کی تھیں میں نے لیکن دولت کے کھیل سے متاثر نہیں ہوا تھا۔ اگر متاثر ہوتا تو عظیم الشان خزانہ جس کا اگر چھوٹا سا حصہ بھی مجھے حاصل ہو جاتا تو نجانے میں کس قدر دولت مند آدمی ہوتا۔ میں اس کے حصول کے لئے کوشش ضرور کرتا۔ مگر یہ چیز تو فطرت کا حصہ ہی نہیں تھی اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ بچپن سے دولت کا کھیل دیکھتا رہا تھا۔ کبھی غور ہی نہیں کیا تھا اس کے بارے میں۔

بہرحال اب معاملہ ان لوگوں کا تھا اور بڑے دلچسپ اور سنگین حالات سامنے آ گئے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ چلو ٹھیک ہے، کم از کم کوئی مشغلہ تو شامل حال رہے گا۔ اور کچھ نہیں تو ان لوگوں سے ہنگامہ آرائی ہی کچھ وقت گزروا دے گی۔ چنانچہ اب میں انتظار کرنے لگا کہ میرے پیارے پیارے چچا کے پیارے پیارے بیٹے مجھے سیر و سیاحت کی پیشکش کریں اور میں ان سے دو دو ہاتھ کروں۔ منصوبہ بندوں نے زیادہ وقت صرف نہیں کیا۔ فوراً ہی شاہنواز نے مجھ سے ملاقات کی اور بڑے پیار بھرے انداز میں بولا۔

"مجھے یوں لگتا ہے بھائی جیسے آپ ہم سے کھنچے کھنچے رہتے ہیں۔"

"کھنچے کھنچے کیوں بھائی، ایسا کیوں لگتا ہے آپ کو؟" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"نہیں، میرا مطلب ہے کہ ہمارے آپ کے درمیان ملاقاتیں ہی نہیں ہوتیں۔"

"تو یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"آپ سمجھے نہیں میرا مطلب۔"

"سمجھا دو۔ اصل میں ایک خرابی ہے میرے اندر۔ بات سمجھ میں آ تو جاتی ہے مگر ذرا دیر سے آتی ہے۔"

شاہنواز کے چہرے پر کسی قدر بوکھلاہٹ کے آثار نظر آئے۔ غالباً وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کہیں میں اس کا مذاق تو نہیں اڑا رہا۔ میرے اندر خود بخود ایک تمسخرانہ سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جس کا مجھے خود بھی احساس تھا۔ حالانکہ میں اس کیفیت سے بچنا چاہتا تھا۔ ان لوگوں کو ایک سبق دینا ضروری تھا۔ بیوقوف! اگر خود مجھ سے اس موضوع پر بات کر لیتے تو میں انہیں اطمینان دلا دیتا کہ بیٹا کھاؤ پیو، عیش کرو۔ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ دولت میرے لئے ایک مذاق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ حالانکہ یہ الفاظ بڑے عجیب اور میرے خیال میں غیر مناسب ہیں۔ کیونکہ جن لوگوں کے پاس کچھ نہیں ہوتا، ان سے ذرا پوچھیں کہ سارے مذاق اپنی جگہ، کم از کم دولت کبھی مذاق نہیں ہوتی۔

لیکن بہرحال اتنی دیر میں احمد بھی آ گیا۔

"میں شاہنواز سے پوری طرح متفق ہوں خاقان بھائی! ایسا لگتا ہے جیسے آپ ہم سے کچھ کھنچے کھنچے رہتے ہیں۔"

"اگر میں واقعی کچھ زیادہ کھنچا ہوا ہوتا تو لمبا ہو جاتا۔ میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"آپ کو پتہ ہے کہ آپ کی غیر موجودگی میں ہم لوگوں نے کیسی کیسی محنت کی ہے؟"

"اوہو، خیریت...... کیا حالات کچھ خراب ہو گئے تھے؟ میرا مطلب ہے مالی حالات کچھ گڑبڑ ہو گئے تھے؟"

"نہیں تو۔" احمد حیرت سے منہ پھاڑ کر بولا۔

"تو پھر محنت مزدوری کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟"

"مزدوری وزدوری نہیں، میں خالی محنت کی بات کر رہا ہوں۔ بھئی دیکھئے نا، اپنی چیز پر اگر توجہ نہ دی جائے تو باہر کے لوگ تو کبھی غور نہیں کریں گے کہ آپ کا کیا نفع ہو رہا ہے کیا نقصان۔"

"بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ ایسی ہی بات ہے۔"

"ہم نے اپنی زمینوں پر خود محنت کی ہے۔"

"ہل چلایا ہے؟" میں نے فوراً ہی سوال کیا۔

"ہل تو نہیں چلایا بے شک۔ آپ نے پالن باغ دیکھا ہے؟"

"پالن باغ...... یہ کیا بلا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"پھلوں کا باغ ہے ہمارا۔ اور ہم اس پر ناز کرتے ہیں۔"

"کرنا چاہئے۔ جو چیز سب سے بڑے مقصد کے حصول کا ذریعہ بن جائے اس پر تو ناز کرنا ہی چاہئے۔"

میرے ان الفاظ پر وہ دونوں بری طرح چونک پڑے۔ شاہنواز نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مطلب...... مم...... مطلب......"

"بھئی محنت کر کے تم نے یقینی طور پر بڑے خوبصورت پھل اُگائے ہوں گے۔ مقصد ہوا نا آخر۔"

"ہاں ہاں...... کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ لیکن ایسے نہیں۔ آپ چلیں ہمارے ساتھ۔ ذرا دیکھیں ہم نے کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔"

"کارنامہ سرانجام دے بھی دیا؟" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔"

"یار! وقت سے پہلے فیصلے نہیں کر لینے چاہئیں۔ وقت کا انتظار کیا کرو۔ یہ دیکھا کرو کہ جو کچھ تم نے سوچا ہے اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ پہلے سے ہی طے کر لیا کہ کارنامہ سرانجام دے ڈالا۔"

میرے ان الفاظ پر وہ دہشت زدہ ہو گئے تھے۔

"آپ کی باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آتیں۔"

"اصل میں خاقان بھائی باہر کے ملکوں میں رہے ہیں نا، اس لئے اس معیار کی باتیں کرتے ہیں۔ ہم ٹھہرے سیدھے سادھے سیتا گڑھی کے لوگ۔ اتنی گہرائیاں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔"

میں ہنس کر خاموش ہو گیا تھا۔ پھر احمد نے کہا۔ "تو پھر کیا فیصلہ کیا؟"

"فیصلہ تو تم لوگ کر چکے ہو۔" میں نے پھر نشتر چلایا۔

"میرا مطلب ہے چلیں گے آپ ہمارے ساتھ؟"

"نہیں چلیں گے تو بزدل کہلائیں گے نا۔" میں نے کہا۔ درحقیقت میں نے اپنی باتوں سے انہیں زچ کر دیا تھا اور وہ اس شک وشبے کا شکار ہو گئے تھے کہ کہیں میں ان کا مطلب سمجھ تو نہیں گیا ہوں۔ لیکن بہرحال کر بھی کیا سکتے تھے۔ میں ان کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلتا رہا۔

پھر انہوں نے وقت وغیرہ کا تعین کر لیا اور میں نے اس پر آمادگی کا اظہار بھی کر دیا۔ اللہ کی ذات پر بھروسہ تھا اور اس کے بعد دلائی لامہ کی اس مہربانی پر جو اس نے کی تھی۔ ویسے بھی نہ کوئی آگے تھا نہ پیچھے، حالات جس رخ پر لے جا رہے ہیں لے جاتے رہیں۔ نتیجہ جو کچھ بھی نکلتا ہے نکلتا رہے۔ جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔ چنانچہ میں نے بھی تیاریاں مکمل کر لیں اور پھر وقت مقررہ پر ان کے ساتھ چل پڑا۔

ایک بڑی سی پرانی طرز کی جیپ جو عام طور سے میں نے یہاں ان لوگوں کے استعمال میں دیکھی تھی ہم لوگوں کو لے کر چل پڑی۔ احمد ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ میں نے سیتا گڑھی کے اطراف دیکھ لئے تھے اور ویسے بھی جو کچھ میں نے دیکھا تھا ان لوگوں کے فرشتوں نے ہی دیکھا ہو گا۔ والد صاحب کے ساتھ نجانے کہاں کہاں گھومتا پھرتا تھا۔ تھوڑی بہت تبدیلیاں بے شک ہو گئی تھیں اس دوران لیکن اب ایسا بھی نہیں ہے کہ وقت بھی بھول جاتا۔

پالن باغ، آبادی سے کافی فاصلے پر نکل کر تھا۔ چوڑی پگڈنڈی پر سفر کرتے ہوئے ہم پالن باغ میں داخل ہو گئے۔ اس دوران میں نے یہ جائزہ لیا تھا کہ ہو سکتا ہے ان دونوں کے آدمی ساتھ ساتھ ہی ہوں۔ لیکن بعض ایسی جگہیں آئیں جہاں سے دور دور تک دیکھا جا سکتا تھا اور وہاں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ جہاں تک میرے نادیدہ محافظوں کا معاملہ تھا تو وہ تو کسی کو نظر ہی نہیں آتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات مجھے بھی نہیں۔ البتہ وہ میری جانب سے غافل نہیں ہوں گے۔

بہرحال پالن باغ کا سفر طے ہوتا رہا۔ ان لوگوں نے یقینی طور پر اپنے آدمیوں کو وہاں پہنچا دیا ہو گا۔ ہم پالن باغ کے دروازے پر پہنچے تو میں نے ایک لمبے چوڑے آدمی کو دیکھا جو مالیوں جیسا لباس پہنے ہوئے تھا لیکن چہرے ہی سے خطرناک نظر آتا تھا۔ میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا کہ یہ اصل مالی نہیں ہو سکتا بلکہ انہی غنڈوں میں سے

ایک ہو سکتا ہے جو یہاں میرا حساب کتاب کرنے کے لئے پہلے سے پہنچا دیئے گئے ہیں۔ کم از کم یہ مخص شکل سے مالی نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اصل مالی کو ان لوگوں نے اپنے قبضے میں کرلیا ہے۔

غرض یہ کہ پائن باغ میں پہنچنے کے بعد جیپ رک گئی۔ باغ واقعی بڑا سرسبز و شاداب تھا۔ پھلوں سے لدے ہوئے درخت ہر طرف جھول رہے تھے اور ان پھلوں کی خوشبوئیں فضا میں چکراتی پھر رہی تھیں۔ شاہنواز نے تعریفی انداز میں باغ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''دور دور تک کے علاقے میں کوئی ایسا باغ نکال کر دکھا دے۔''

''باغ نکالے نہیں جاتے، لگائے جاتے ہیں۔'' میں نے تصحیح کی۔

''وہی میرا مطلب ہے۔ آپ کو کیسا لگا یہ باغ؟''

''بہت خوبصورت۔''

''بس یہ سمجھ لیجئے یہی ہماری محنت ہے۔ آیئے۔''

وہ لوگ مجھے آہستہ آہستہ اپنی دانست میں مقتل گاہ کی طرف لے جا رہے تھے مگر میں اسے ان کا مقتل سمجھ رہا تھا۔ مختلف راستوں کو عبور کرتے ہوئے آخر کار وہ اس کالے کنوئیں کے پاس پہنچ گئے جو زمانہ قدیم میں بھی کالا کنواں تھا۔ اتنا پرانا کہ شاید ہمارے دادا پردادا کے دور کا ہوگا۔ خاصا چوڑا تھا لیکن اس میں کوئی ٹیوب ویل وغیرہ نہیں لگا ہوا تھا۔ احمد نے کہا۔

''آپ کو اس کالے کنوئیں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہیں؟''

''اندر جاؤں گا تو پتہ چلے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''اندر؟''

''میرا مطلب ہے آگے جا کر اس میں جھانکوں گا تو پتہ چلے گا۔''

''تو جھانکئے۔'' شاہ نواز کا لہجہ بدل گیا۔ اب اس کی آواز میں غنڈہ پن نمودار ہو گیا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

''پہلے تم جھانکو۔''

جواب میں شاہنواز نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''ہم بیوقوف نظر آتے ہیں آپ کو؟''

''لگتا تو ہے۔''

''بھول جایئے خاقان جمشیدی! بس یوں سمجھ لیجئے کہ زندگی سے اگر کچھ مانگنا ہے تو

اور مانگ لیجئے۔ آپ کی آخری آرام گاہ یہی کنواں ہے۔''

''اچھا...... تمہیں کیسے معلوم؟'' میں نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

''بس بہت سی باتیں خود بخود معلوم ہو جاتی ہیں۔''

''خود بخود کبھی کچھ نہیں معلوم ہوتا مائی ڈیئر! کچھ معلوم کرنے کے لئے تو بڑی محنت کرنا پڑتی ہے اور تم محنت کے عادی نہیں ہو۔ بولو، کی ہے کبھی زندگی میں محنت میرے پیارے بھائی! کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے بھی تھوڑا سا ہوم ورک کرنا پڑتا ہے۔''

''وہ ہم نے کرلیا ہے۔ دیکھنا چاہتے ہیں آپ؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ اپنے بھائیوں کی محنت کو نہیں دیکھوں گا تو اور کیا کروں گا۔''

''آ جاؤ ہوم ورک۔'' احمد نے تمسخرانہ انداز میں کہا اور درختوں کے اوپر سے لوگ نیچے کودنے لگے۔ ان کی تعداد چار تھی۔ ایک وہی مالی تھا جو نجانے کب آ کر درخت پر چڑھ گیا تھا۔ شاہنواز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ ہے ہمارا ہوم ورک۔''

''اوہو...... یہاں اس طرح کا ہوم ورک ہوتا ہے؟ بڑے ناکارہ لوگ ہو تم تو۔ اسے ہوم ورک کہتے ہیں؟''

''ہاں، مگر آپ نے ہمیں ناکارہ کیوں کہا خاقان جمشیدی صاحب؟''

''اس لئے کہ ان بیوقوف لوگوں کو تم نے جو ذمہ داری سونپی ہے وہ یہ پوری نہیں کر سکتے۔''

''ابھی دیکھو کس طرح سے کرتے ہیں۔'' شاہنواز نے کہا اور چاروں غنڈے دانت نکالے ہوئے میری جانب بڑھنے لگے۔

''ارے واہ...... یہ تو باقاعدہ فلموں کا سا منظر ہے۔ لیکن تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو؟''

''صفائی۔'' احمد نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

''بھنگی لگے ہوئے ہو؟''

''یہی سمجھ لو۔ اس وقت بھنگی بن کر تمہاری صفائی کرنا چاہتے ہیں۔ تمہیں شرم نہیں آئی ہمارا راستہ روکنے آ گئے تھے۔''

''تمہارا راستہ؟ الّو کے پٹھے! میرے باپ نے تمہارے باپ کو زندگی بھر کھلایا، ہر طرح کی ضرورتیں پوری کیں اس کی، تم حرام کی کمائی کھا کر یہاں پلے بڑھے اور اس

کے بعد میری ہر چیز پر قبضہ کرنا چاہتے ہو؟"

میرے ان الفاظ پر وہ بری طرح بپھر گئے اور انہوں نے اپنے غنڈوں سے کہا۔

"مارو اسے۔"

وہ سارے کے سارے میری جانب لپکے۔ لیکن پھر اس دلچسپ منظر کا آغاز ہو گیا جو میرے لئے بھی دلچسپ ہی تھا۔ اچانک یوں لگا جیسے کسی نے انہیں کمر سے پکڑ لیا ہو۔ وہ دوڑ کر میرے پاس آنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کے پاؤں زمین پر گھسٹ رہے تھے اور ہاتھ اس طرح فضا میں چل رہے تھے جیسے وہ اپنے آپ کو کسی نادیدہ وجود سے چھڑانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ پلٹ پلٹ کر دیکھ بھی رہے تھے۔ لیکن انہیں کمر سے پکڑنے والے نظر ہی نہیں آ رہے تھے۔ چاروں کے چہرے پر دہشت کے آثار اُبھر آئے۔

"کک...... کون ہے...... کون ہے...... کک...... کون ہے؟" ان کے منہ سے آوازیں نکل رہی تھیں اور احمد اور شاہنواز حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"یہ کیا تماشہ کر رہے ہو حرامیو! مارو اسے، ٹکڑے کر دو اس کے۔"

مگر حرامی جو تماشہ کر رہے تھے، وہی تماشہ کرتے رہے۔ وہ ایک انچ آگے نہیں بڑھ پائے تھے۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔

"یہ لوگ کیا خلا میں تیر رہے ہیں؟"

اسی وقت ان دونوں کو غصہ آ گیا اور دونوں گردنیں جھکا کر میری جانب لپکے۔ لیکن یہ بھی ان کی بیوقوفی تھی۔ جیسے ہی وہ میرے قریب پہنچے میں بیٹھ گیا اور وہ بری طرح آپس میں ٹکرائے۔ ان کے سر ایک دوسرے سے ٹکرائے تھے اور بالکل ایسی ہی آواز آئی تھی جیسے دو خول آپس میں ٹکرائے ہوں۔ انہیں چکر آ گیا تھا۔ ادھر نادیدہ محافظوں نے ان چاروں کو اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹخنا شروع کر دیا۔ ان کے حلق سے چیخیں نکلنے لگیں اور بعض کے جسم اور چہروں سے خون بھی بہنے لگا۔ وہ دہشت بھرے انداز میں چیخ رہے تھے کیونکہ انہیں نقصان پہنچانے والے انہیں نظر ہی نہیں آ رہے تھے اور یہ بات ظاہر ہے ان کے لئے حیرانی کا باعث ہی نہیں بلکہ خوف کا باعث بھی تھی۔

میں پُر اطمینان انداز میں ایک طرف کھڑا ان کی کاوشیں دیکھ رہا تھا۔ احمد اور شاہنواز اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ایک بار پھر مجھ پر حملہ کیا لیکن میرے محافظوں میں سے شاید کچھ محافظ فارغ ہو گئے تھے۔ کیونکہ احمد اور شاہنواز قلابازیاں کھا کھا کر نیچے

گرنے لگے اور ان کے حلق سے بھی چیخیں نکلنے لگیں۔ دو تین پٹخنیاں انہوں نے کھائیں تو میں نے کہا۔

"نہیں...... یہ مجھے اندھا کنواں دکھا رہے تھے۔ میرا خیال ہے اب ہم انہیں اندھا کنواں دکھاتے ہیں۔"

اب تو ان دونوں کی حالت بری ہو گئی تھی۔ میں نے انہیں بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا لیکن بھلا وہ کہاں بھاگ سکتے تھے۔ انہیں پکڑ لیا گیا تھا۔ تب وہ رونے اور گڑگڑانے لگے۔

"معاف کر دو۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہمیں معاف کر دو۔"

"ارے ارے...... یہ بڑی خرابی ہے۔ انسان اپنی کوششوں میں تو کوئی کسر نہیں چھوڑتا، برائیاں اس طرح کرتا ہے جیسے وہ اس کا قومی فرض ہو۔ اور جب پھنس جاتا ہے تو پھر خدا کے واسطے دینے لگتا ہے۔"

"ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں، ہمیں نہ مارو۔"

"کون مار رہا ہے بھائی۔ تم میرے چچا زاد بھائی ہو۔ میرے پیارے چچا جان کو کتنا دکھ ہو گا اگر تم اس دنیا سے چلے گئے۔ اس کے بعد کون رہ جاتا ہے ان کے پاس۔ ظاہر سی بات ہے وہ تمہارے بغیر جی بھی نہیں سکیں گے۔ جبکہ میں چاہتا ہوں وہ جئیں...... ایسا کرو میرے دوستو! ان کی ٹانگیں باندھو اور انہیں اس اندھے کنوئیں میں الٹا لٹکا دو۔"

"نہیں نہیں، مر جائیں گے ہم...... مر جائیں گے۔"

"اگر موت ہی تمہارا مقدر ہے اور اتنی سی بات پر تم مر جاؤ گے تو مر جاؤ بھائی! کون کسے بچا سکتا ہے۔" میں نے تفریحی انداز میں کہا۔

بہرحال اب اس طرح تو نہیں چھوڑ سکتا تھا انہیں۔ چنانچہ میرے محافظوں نے ان کی ٹانگیں باندھیں اور اس کے بعد ان کی چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ کالے کنوئیں میں انہیں رسیوں سے باندھ کر لٹکا دیا گیا تھا۔ وہ چیخ رہے تھے۔ ان کی دہاڑیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ لیکن ان سے فراغت حاصل کر کے میرے محافظوں نے ان چاروں کو بھی رسیوں سے باندھ دیا جو پٹ پٹ کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ دیکھنے کے قابل منظر تھا۔ چھ افراد عذاب میں گرفتار تھے اور واقعی یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ اس وقت مجھے بڑی سرخروئی بخشی گئی تھی۔

پھر میں اپنے اس پالن باغ کی سیر کے لئے نکل گیا اور مجھے وہ مالی نظر آ گیا جو کافی ضعیف تھا۔ مالی کا بیٹا بھی اس کے ساتھ یہیں جھونپڑی میں رہتا تھا۔ مالی کو ایک پرانے درخت کے پاس باندھ کر ڈال دیا گیا تھا جو بالکل دور دراز اور آخری علاقے میں تھا اور یہی سلوک اس کے بیٹے کے ساتھ کیا گیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے ان دونوں کو کھولا تو مالی دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا اور اس کے رونے کی آوازیں فضا میں منتشر ہونے لگیں۔

”نہیں مالی بابا! رونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے پتہ ہے کس نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ مگر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آخر کار ہر برائی کی کوئی نہ کوئی انتہا ہو جاتی ہے۔ اب آپ دیکھ لیجئے، وہ آپ کو باندھنے کے بعد مجھے قتل کرنے کے لئے یہاں لائے تھے۔ لیکن آیئے، میں آپ کو ان کا حشر دکھاؤں۔“

مالی بابا اور اس کے بیٹے کو لے کر میں کالے کنوئیں کے پاس پہنچا۔ یہیں پر وہ چاروں غنڈے بھی بندھے پڑے تھے اور یہیں وہ دونوں بھی کالے کنوئیں میں الٹے لٹکے ہوئے تھے۔ وہ ہوش میں تھے، ان کی آوازیں بیٹھ چکی تھیں چیخ چیخ کر۔ ان کے حواس خراب ہو گئے تھے۔ ان کے چہروں پر شدید وحشت تھی۔ مالی انہیں دیکھنے لگا اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

”ہمیں یہاں سے لے چلو بیٹے! ہمیں یہاں سے لے چلو۔ تم پہچان گئے نا اپنے مالی بابا کو؟“

”بالکل پہچان گیا مالی بابا! آپ تو میرے لئے میرے سب سے بڑے اور اہم بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔“

مالی بابا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ ہمدان جمشیدی کو یاد کر رہا تھا۔ اس دور کو یاد کر رہا تھا۔ رو رو کر فریاد کر رہا تھا۔

”عزت دیتے تھے ہمیں مالک۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنے ہر نوکر کو عزت دیتے تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ ہمیں کبھی بھی انہوں نے شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ عزت اور محبت، بس یہی ہمارا سرمایہ تھا۔ ہماری کبھی کسی ضرورت کو رد نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر اب...... اب تو پیسے بھی بھیک کی طرح مانگنے پڑتے ہیں۔ ہماری تنخواہ تک وقت پر نہیں ادا کی جاتی۔ بیٹے کو بڑی مشکل سے ہماری جگہ دی گئی ہے۔ ہمیں ایک پیسہ بھی نہیں دیا جاتا۔ تمہارے ماموں حافظ کو بھی حویلی سے نکال دیا گیا ہے۔ شروع میں انہوں

نے ان کے رویے کی مخالفت کی تھی، بس حویلی سے ہی نکال دیا گیا۔“

”ماموں حافظ......؟“ میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ مجھے ماموں حافظ یاد آ گئے۔ میری والدہ کے بھائی تھے۔ گو رشتے کے بھائی تھے لیکن پھر بھی ہم لوگ ان کی بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ ان کے کچھ بچے بھی تھے۔ ارے باپ رے...... ماموں حافظ تو میرے ذہن سے بالکل ہی نکل گئے۔ میں نے مالی بابا سے ماموں حافظ کے بارے میں مزید تفصیل معلوم کی تو پتہ چلا کہ ماموں حافظ حویلی سے تھوڑے فاصلے پر ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا کر رہتے ہیں۔ ان کے بیٹے محنت مزدوری کرتے ہیں اور اس طرح وہ اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔

”حویلی سے انہیں کچھ نہیں ملتا؟“

”ایک پائی نہیں۔ پچھلے دنوں بہت بیمار ہو گئے تھے۔ علاج کرانے تک کے لئے پیسے نہیں تھے۔ نجانے کیسے کیسے گزارا کر کے بیچاروں نے علاج کرایا۔ وہ جو کہتے ہیں نا بیٹا کہ دنیا انسان کے ساتھ کچھ بھی کر لے، اللہ سب کا محافظ ہوتا ہے۔ اللہ نے انہیں صحت دے دی۔ اب سب بالکل ٹھیک ہے۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ مالی بابا، آپ نے مجھے ماموں حافظ کے بارے میں بتایا۔ بہرحال آپ لوگ اطمینان رکھئے، اب میں آ گیا ہوں۔ اب آپ کے ساتھ یہ ناانصافی نہیں ہو گی۔ میں کچھ کر لوں گا۔“ میں نے کہا۔

مالی بابا بدستور رو رہا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ ”آپ ایسا کرو مجھے باندھ کر وہیں ڈال دو جیسے ان لوگوں نے باندھ دیا تھا مجھے۔ ہوش میں آئیں گے تو مجھے مار ڈالیں گے یہ۔“

”نہیں ماریں گے مالی بابا۔ آپ آرام سے جس طرح اپنا وقت گزارتے رہے ہو اسی طرح اپنا وقت گزارو۔ میں دیکھوں گا۔“ اور پھر میں نے خاموشی سے اپنے محافظوں سے کہا۔ ”مالی بابا اور اس کے بیٹے کا خیال رکھا جائے۔“

”آپ اطمینان رکھیں۔“ مجھے جواب ملا۔ اور جب یہ جواب مجھے مل گیا تو پھر اطمینان کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں تھا۔

پورے چار گھنٹے تک میں نے احمد اور شاہنواز کو اس اندھیرے کنوئیں میں لٹکائے رکھا۔ چاروں آدمی بندھے پڑے تھے۔ اس کے بعد میں نے اپنے محافظوں سے کہا۔

”ٹھیک ہے، نکال لو انہیں۔ میں ان کی موت نہیں چاہتا۔“

محافظوں نے میری ہدایت پر ان کے پیروں سے رسیاں نکال دیں اور انہیں زمین پر ڈال دیا۔ وہ اپنے بدن کی توانائی کھو چکے تھے۔ ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکے تھے۔ بس زمین پر پڑے زار و قطار رو رہے تھے۔ میں نے ان دونوں سے کہا۔

"پتہ چلا تھا مجھے کہ تم دونوں غنڈے ہو، غنڈہ گردی کرتے ہو۔ بہت اندھیر مچا رکھا ہے تم نے۔ سنو...... جو کچھ تم نے دیکھ لیا ہے اگر تمہارے لئے کافی ہے تو تمہارے حق میں بہتر رہے گا۔ کسی بوڑھے آدمی کو میں بیٹے کا داغ نہیں دینا چاہتا ورنہ تم دونوں کو اسی کالے کنوئیں میں موت کی نیند سلا دیتا۔ معاف کر دیا ہے میں نے تمہیں اس وقت۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا، جو کچھ تم نے دیکھا ہے وہ مذاق نہیں ہے۔ میں تمہیں آسانی سے زندہ درگور کر سکتا ہوں۔ دو تین چیزیں بتا رہا ہوں، اس کے بعد میرے خلاف کوئی سازش کرنے کی کوشش نہیں کرنا۔ میں تو شاید تمہیں چھوڑ بھی دوں لیکن وہ جو مجھ سے محبت کرتے ہیں وہ تمہیں کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ پڑے رہو۔ بلکہ نہیں، پڑے نہیں رہو۔ ہم لوگ ساتھ ہی واپس چلیں گے۔ تم اپنے باپ کو یہ خوشخبری سناؤ گے کہ تم چار گھنٹے کنوئیں میں اُلٹے لٹکے رہے۔ یقیناً تمہارا باپ تمہاری اس کارکردگی سے بہت خوش ہو گا۔ چلو، کھڑے ہونے کی کوشش کرو۔"

وہ لوگ اپنے آپ کو سنبھالنے لگے۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے وہ اپنی جگہ سے اٹھے۔ احمد نے جیپ سنبھالی۔ چاروں ساتھیوں کو وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "مالی بابا کو اگر ذرہ برابر نقصان پہنچایا گیا تو سمجھ لینا کہ میں تم لوگوں کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ پہلے سے تمہیں سمجھائے دے رہا ہوں۔ جن لوگوں نے تمہیں باندھ کر کنوئیں میں لٹکایا ہے میں نے انہیں ہدایت کر دی ہے کہ مالی بابا کو نقصان نہ پہنچنے دیا جائے۔ آگے تمہاری مرضی ہے جس طرح چاہو وقت گزارو۔ اور کیا کہتے ہو اس بارے میں؟"

"نہیں...... بالکل نہیں۔ ہم اب کسی کو نقصان پہنچانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ہمیں اندازہ ہو گیا ہے کہ ہم تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"چلو......" میں نے کہا اور جیپ حویلی کی جانب چل پڑی۔

☆

حالانکہ مجھے تجسس تھا اور میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ سورما واپس آنے کے بعد چچا صاحب کو کیا بتاتے ہیں لیکن دونوں سورما اپنے کمروں میں بند ہو گئے تھے اور رات تک ان سے طارق چچا کی کوئی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ طارق چچا شام کو چار بجے کسی کام سے چلے گئے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں۔

بہرحال میں نے بھی سکون سے وقت گزارا۔ ردِعمل دیکھنا تھا کہ کیا ہوتا ہے۔ مگر رات گزر گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ طارق جمشیدی نے اس بارے میں کسی تجسس کا اظہار کیوں نہیں کیا۔ یا پھر وہ کون سی مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ بہرحال اب ساری باتوں کا پتہ اپنے محافظوں سے نہیں چل سکتا تھا چنانچہ میں نے بھی خاموشی اختیار کی۔ البتہ دوسرے دن میرے ذہن میں ماموں حافظ ابھر آئے۔

مالی بابا سے میں ان کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر چکا تھا۔ سیتا گڑھی کے ایک دور دراز علاقے میں حافظ علی صاحب کا گھر تلاش کرنے میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ مجھے فوراً ہی ایک جھونپڑی کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ ماموں حافظ جھونپڑی میں موجود تھے۔ ان کے بھی دو بیٹے تھے، دُبلے پتلے قد و قامت کے مالک۔ ماموں حافظ نے مجھے دیکھا اور دفعتہً ہی ان کے جذبات اُبل پڑے۔ میرا بچہ کہہ کر دونوں ہاتھ پھیلائے اور مجھ سے لپٹ کر بلکنے لگے۔ زار و قطار رو رہے تھے۔ میں خود بھی متاثر ہو گیا۔ نجانے کیوں مجھے یہ لگا جیسے یہ لمس میرے لئے بالکل سچا ہے۔

بہرحال بہت دیر تک میں انہیں سینے سے لپٹائے رہا، اس کے بعد ان کے دونوں بیٹے بھی آ گئے تھے۔ شکل ہی سے سلیقے کے نوجوان معلوم ہوتے تھے۔ لیکن چہروں پر افسردگی اور غربت منجمد تھی۔ ایاز اور محمود ان کے نام تھے۔ میں اندر جھونپڑی میں چلا گیا۔ ممانی صاحبہ بھی بہت محبت سے پیش آئیں۔ مجھے یہاں بڑی اُنسیت کا احساس ہوا تھا۔ ماں کے خون سے تعلق تھا ان کا۔ باپ کا خاندان تو خیر حالات کی بنا پر کافی سرکش ہو گیا تھا لیکن ماموں

حافظ کو ایک طرح سے بالکل ہی چھانٹ کر رکھ دیا گیا تھا۔ ایک جھلنگا چارپائی پر فوراً ہی چادر بچھائی گئی۔ ماموں حافظ سامنے بیٹھ گئے اور بولے۔

"بیٹے! آج ہی تمہارے آنے کی خبر ملی تھی ہمیں۔ یہ ایاز کسی کام سے کھیت کی طرف سے گزرا تھا، ایک ہاری نے بتایا کہ چھوٹے مالک گھر آ گئے ہیں۔ بڑا دل تڑپ رہا تھا تمہارے لئے۔ میں نے محمود سے کہا تھا کہ بیٹا، تاک میں رہو۔ اگر کبھی خاقان تنہا نظر آ جائیں تو انہیں بتا دینا کہ ماموں حافظ کہاں رہتے ہیں۔ اگر ملنا چاہیں گے تو آ جائیں گے۔"

"میں آ گیا ماموں جان! مجھے بھی آپ کا پتہ ذرا دیر سے ہی معلوم ہوا۔ لیکن دیکھ لیجئے، میں نے پتہ لگا ہی لیا۔"

"اللہ تمہیں بڑائی دے بیٹا! خوش رہو۔ بیٹا، برا نہیں ماننا ذرا تھوڑی سی تنگی ہے۔ چائے پیو گے۔ اور کچھ نہیں دے سکیں گے ہم تمہیں۔"

"لیجئے، اگر تنگی ہے تو آپ چائے کہاں سے پلائیں گے مجھے؟"

"نہیں، چائے کا سامان تو ہے۔ مگر وہ برتن وغیرہ......"

"ممانی جان! چائے لے آیئے، زیادہ بہانہ بازی نہ کریں آپ۔ چلیں چائے پلائیں۔"

میں نے اپنائیت سے کہا اور ممانی جان خوشی خوشی جھونپڑی کے ایک حصے میں چلی گئیں۔

"جی ماموں جان! اب آپ مجھے حالات سنایئے۔"

"بیٹا، پہلے تم سناؤ۔ یہ بتاؤ کیفیت کیا ہے تمہاری؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں، تندرست و توانا ہوں۔"

"کہاں تھے؟"

"ملک سے باہر۔ بس جن حالات میں گھرا ہوا تھا ان کا آپ کو بھی علم ہوگا۔"

"اب صورتحال کیا ہے؟"

"سب ٹھیک ہو چکا ہے ماموں جان! کوئی پریشانی، کوئی الجھن نہیں ہے مجھے۔"

"اللہ کا شکر ہے بیٹے! ہمدان بھائی اور میری بہن کا تو انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد لوگوں کی بن آئی۔ مجھے معاف کرنا، غیبت کرنا بری بات ہے۔ لیکن کچھ حقیقتیں بھی ہوتی ہیں جن کا تذکرہ تو کیا ہی جاتا ہے۔ سب سے طاقتور طارق جمشیدی نکلے۔ کوششیں تو بہت سوں نے کیں کہ تمہارے باپ کی لاوارث جائیداد کو لوٹ لیا جائے کیونکہ تم بھی موجود نہیں تھے۔ لیکن طارق جمشیدی سب پر بازی لے گئے۔ بیٹوں کی مدد سے انہوں نے سب کے حوصلے

پست کر دیئے اور پھر ہر چیز پر قبضہ جما کر بیٹھ گئے۔ میں نے تھوڑا سا اعتراض کیا بعض معاملات میں۔ میں نے کہا ساری باتیں اپنی جگہ، خاقان زندہ ہے۔ جو کچھ کیا جائے، اسی کے نام پر کیا جائے۔ زمینیں نہ بیچی جائیں، اس کا حق انہیں نہیں پہنچتا۔ لیکن نتیجے میں مجھے مار پیٹ کر نکال دیا گیا۔ بڑی زیادتی کی گئی میرے ساتھ بیٹا! دیکھو...... میرے بدن پر اب بھی زخموں کے نشانات موجود ہیں۔ ایاز اور محمود کو مار ڈالنے کی دھمکی دی گئی۔ میں نے سوچا کہ بھیا بچوں کی زندگی سب سے زیادہ قیمتی ہے۔ انہیں کیوں مصیبت میں ڈالوں۔ بس انہیں لے کر نکل کھڑا ہوا اور یہ جھونپڑی بنا لی۔ اصل میں سیتا گڑھی چھوٹی سی جگہ ہے۔ بچوں کو کوئی کام دھندہ بھی نہیں ملا۔ پڑھایا لکھایا بھی ہے میں نے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے پڑھنے لکھنے کے بعد آدمی اور ناکارہ ہو جاتا ہے۔ پھر بھی بیچارے جو کچھ بھی بن پڑتا ہے کر لیتے ہیں۔ میں خود بھی کام دھندوں کی تلاش میں نکلتا ہوں۔ ایک دو بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔ سیتا گڑھی میں اس کی گنجائش ہی کیا ہے۔ یوں گزارا ہو رہا ہے۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ ہم ان حرام خوروں میں شامل نہیں ہوئے جو ہمدان جمشیدی کی کھال نوچ رہے ہیں۔"

"ماموں صاحب! میں ذرا ان لوگوں کے بارے میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔"

اسی وقت ممانی صاحبہ چائے لے آئیں۔ معمولی سے برتنوں میں چائے تھی۔ دونوں بھائی محمود اور ایاز بھی ہمارے ساتھ چائے میں شامل ہو گئے۔ بڑے صاف ستھرے اور سلجھی ہوئی طبیعت کے نوجوان تھے۔ میں نے کہا۔

"جی......"

"دیکھو میاں، غیبت بہت بری چیز ہوتی ہے۔ لیکن تم واپس آ گئے ہو تو تمہیں حقیقت حال سے آگاہ کرنا بھی میں اپنے فرائض میں سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمدان جمشیدی کی بے پناہ دولت تھی۔ اور تو کوئی اس قدر شاطرانہ چالیں نہیں چل سکا لیکن صورتحال کا اندازہ ہوتے ہی طارق نے سب سے پہلے تو اپنے نام کے ساتھ جمشیدی منسلک کیا اس کے بعد انہوں نے کچھ سرکاری افسروں سے سازباز کی، انہیں پیسہ کھلایا اور بس کام بن گیا۔ ظاہر یہی کیا کہ ہمدان جمشیدی کی جائیداد کے متولی ہیں اور ہمیشہ سے اس کی دیکھ بھال پر مامور رہے ہیں۔ بس اس کے بعد جو بھی ان کے آڑے آیا، بیٹوں کے ذریعے اس کی آواز اور زبان بند کر دی۔ اس کام میں احمد اور شاہنواز بڑے ماہر ہیں۔ غنڈے پال رکھے ہیں انہوں نے۔ جس کی چاہتے ہیں عزت اتروا دیتے ہیں۔ سب اپنی عزت سے ڈرتے ہیں۔

میں نے دو چار بار کچھ چیزوں پر تنقید کی تو مجھے دھمکی دی گئی کہ کیوں میں اپنے بیٹوں کی زندگی کا گاہک بنا ہوا ہوں۔ میں نے لعنت بھیجی اور حویلی سے کنارہ کشی کر لی۔ سامان بھی پھنکوا دیا انہوں نے میرا اور حکم دیا تھا کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر حویلی سے نکل جائیں۔ بس اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تھا، یہاں کچھ شناسائیاں تھیں، یہ جھونپڑی کا ٹھکانہ مل گیا۔ کچھ لوگوں نے مدد کی اور بس اب یہاں زندگی گزر رہی ہے۔''

میں چائے پیتے ہوئے بہت دیر تک ماموں حافظ سے معلومات حاصل کرتا رہا۔ پھر میں نے محمود اور ایاز سے کہا کہ وہ مجھے کچھ وقت دیں۔ ماموں حافظ سے رخصت لے کر میں محمود اور ایاز کے ساتھ باہر نکل آیا۔

''ہاں بھائیو! میں جانتا ہوں کہ آپ لوگوں کے ذہنوں میں بہت سی باتیں ہوں گی۔ ماموں زاد بھائی ہیں آپ میرے، بڑی عزت اور بڑی محبت کرتا ہوں آپ سے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔''

''ہم سمجھے نہیں خاقان بھائی؟''

''ظاہر ہے چچا جان کو میں من مانی تو نہیں کرنے دوں گا جبکہ وہ بھرپور کوششوں میں مصروف ہیں۔ میں نے ماموں جان کو صورتحال بتائی نہیں ہے، ان دونوں غنڈوں کو تو میں نے ٹھیک کر دیا ہے جو بقول ماموں حافظ کے لوگوں کی عزت اتروانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ وہ تو اب شاید غنڈہ گردی سے کان پکڑ لیں۔ مجھے پالن باغ لے گئے تھے ایک منصوبے کے تحت اور منصوبہ یہ تھا کہ وہاں کالا کنواں نامی ایک جگہ ہے، مجھے اس کی سیر کرا دیں۔ چار گھنٹے تک میں نے انہیں کالے کنوئیں میں الٹا لٹکائے رکھا ہے۔ شیخی نہیں مار رہا ہوں، جا کر پوچھو گے تو خود بھی کان پکڑ کر بتائیں گے کہ کیا بیتی ہے ان پر اور ان کے چاروں غنڈوں پر۔''

محمود اور ایاز کے چہرے چمکنے لگے تھے۔ ''کیا آپ نے واقعی ان کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے؟''

''ہاں...... میں جھوٹ نہیں بولتا۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو اب ہمیں کیا کرنا چاہئے، یہ بتائیے۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑی بے عزتی کی تھی انہوں نے ہماری۔ لیکن بہرحال ہم شرافت سے زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔''

''بے فکر رہو، شرافت سے ہی زندگی گزارو گے۔ اور ایک بات اور کہوں، ماموں حافظ تو

پرانے دور کی اقدار کے انسان ہیں، کسی بھی طرح کوئی ایسی بات قبول نہیں کریں گے جو ان کے ظرف کو متاثر کرے۔ لیکن بھائی، میرے ماموں ہیں۔ میری والدہ کے بھائی۔ مجھے اپنی ماں کو جوابدہی کرنی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ماموں حافظ کو میں اس طرح بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا۔ چنانچہ تم لوگ اپنے آپ کو تیار کر لو، میں ہر طرح سے اس ساری جائیداد اور دولت کا متولی تمہیں بنانا چاہتا ہوں۔ ذہنی طور پر تیار رہو۔''

''توبہ، توبہ، توبہ۔ خاقان بھائی! ہمیں دولت سے زیادہ عزت اور زندگی عزیز ہے۔''

''دیکھو، بہت بڑا بھروسہ کر رہا ہوں میں تم لوگوں پر۔ ایسی بات کر کے میرے اعتماد کو زخمی نہ کرو۔''

''ویسے تو آپ جو حکم دیں گے ہم وہ کریں گے۔ لیکن آپ یقین کریں یہ لوگ......''

''ایسا کرو، ان سے ملاقات کر لو۔ ان سے خود جا کر کہو کہ میں نے یہ کہا ہے۔ اگر کان پکڑ کر تمہارے سامنے سیدھے نہ ہو جائیں تو میری بات مت ماننا۔''

بہت دیر تک میں ان دونوں کو بریف کرتا رہا اور اس کے بعد حویلی چل پڑا۔

حویلی کے معمولات میں کوئی بہت بڑی تبدیلی نہیں تھی۔ یہ تبدیلی تیسرے دن نمایاں ہوئی جب اچانک ہی پولیس کی دو گاڑیاں کچھ اعلیٰ افسران کے ساتھ اندر داخل ہوئیں اور انہوں نے ایک طرح سے حویلی کی ناکہ بندی کر لی۔ اس وقت طارق جمشیدی اور ان کے دونوں بیٹے پائیں باغ میں تھے۔ دو انگریز افسران سے معلومات حاصل کرنے لگے۔ اور پھر ایک ملازم میرے پاس آ گیا اور اس نے کہا۔

''انگریز افسر کچھ تحقیقات کرنے آئے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں۔''

ایک لمحے کے لئے دل میں ہلکی سی پریشانی کا احساس ہوا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ لو، گڑبڑ ہو گئی۔ لیکن بہرحال یہ مرحلہ بھی حل کرنا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا لان پر پہنچ گیا جہاں جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ طارق جمشیدی نے مجھے دیکھا اور دانت نکال کر بولے۔

''یہ ہیں خاقان۔ خاقان! یہ ہیں رابرٹ صاحب۔ کچھ معلومات حاصل کرنے آئے ہیں۔''

انگریز افسر نے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''مسٹر خاقان جمشیدی؟''

''جی میں ہی ہوں۔''

''مسٹر خاقان! آپ نے کلکتہ میں تعلیم حاصل کی تھی؟''

''جی۔''

"ہمیں یہاں سے اطلاع دی گئی ہے کہ دورانِ تعلیم آپ نے کسی انگریز افسر کو قتل کر دیا تھا اور اس کے بعد ہندوستان سے باہر چلے گئے تھے۔"

میں نے پُروقار انداز میں افسر کو دیکھا اور اس کے بعد کہا۔ "آپ کو صرف اطلاع ہے یا آپ کے پاس اس کا حوالہ موجود ہے؟"

"نہیں، اس اطلاع کے ملنے کے بعد مکمل طور پر سارا ریکارڈ چیک کیا گیا ہے، کہیں بھی ریکارڈ میں کسی ایسے قتل کے بارے میں تفصیل نہیں ہے۔ پوری چھان بین کے بعد ہم یہاں آئے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کون ہے جس نے آپ کے خلاف یہ رپورٹ درج کرائی ہے اور حکومت کو بھٹکانے کی کوشش کی ہے۔"

"جب آپ کے ریکارڈ میں کوئی ایسی بات نہیں ہے رابرٹ صاحب! تو پھر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ کیا میں آپ کی خواہش پر آپ کے سامنے یہ اقرار کروں کہ میں نے ایسا کوئی کام کیا ہے؟"

"نہیں پلیز...... آپ لوگ تو بہت بڑی شخصیت کے مالک ہیں۔ ہمیں سیتا گڑھی کے ہمدان جمشیدی کے بارے میں مکمل تفصیلات معلوم ہیں۔ وہ بہت بڑے آدمی تھے اور ان کی جائیداد بہت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ انگریز حکومت کے پاس ان کے خلاف کوئی ایسا ریکارڈ نہیں ہے جس سے انہیں کسی بھی طرح کا مجرم قرار دیا جائے۔ ہم معافی چاہتے ہیں، لیکن یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ وہ کون ہے جس نے یہ غلط رپورٹ ہمیں دی ہے۔"

میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ میں نے غور سے طارق جمشیدی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کیا کہتے ہیں چچا جان، اس سلسلے میں کس نے میرے خلاف یہ رپورٹ حکومت کو دی ہے؟"

"مم...... میں...... مجھے...... مجھے نہیں معلوم۔"

"رابرٹ صاحب! اعلیٰ افسران کو غلط رپورٹ دینا اور انہیں راستے سے بھٹکانا بھی ایک بہت بڑا جرم ہے۔ آپ براہِ کرم باقاعدہ تحقیقات کیجئے کہ کس نے یہ مذاق حکومت کے ساتھ کیا ہے اور جب یہ پتہ چل جائے کہ یہ اطلاع دینے والا کون ہے تو آپ اسے گرفتار کیجئے اور اس پر مقدمہ چلایئے۔"

"بالکل ایسا ہی ہوگا۔ آپ بے فکر رہیں مسٹر خاقان جمشیدی!" رابرٹ صاحب نے کہا اور اس کے بعد معذرت کرتے ہوئے چلے گئے۔

چچا طارق کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ایک لفظ بھی نہ بول سکے وہ۔ دونوں

بیٹوں کا بھی یہی حال تھا۔ بہرحال اس محاذ پر بھی انہیں شکست ہوئی تھی۔ اب رابرٹ صاحب نے اس سلسلے میں کیا تحقیقات کیں، مجھے اس بارے میں علم نہیں تھا لیکن چچا صاحب نے اپنے آخری کھیل کا آغاز کر دیا تھا۔ ادھر میں نے ماموں حافظ سے مل کر ان کے بیٹے ایاز کو ایک ذمے داری سونپی اور ایاز کو خاصی رقم بھی دی اور اسے کہا کہ پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کام سرانجام دے۔

چنانچہ ایاز دہلی چلا گیا۔ پھر اس نے دہلی سے ایک بہت بڑے بیرسٹر صاحب کی خدمات حاصل کیں۔ ساری تفصیلات میں نے ایاز کو بتا دی تھیں۔ ماموں حافظ کو میں نے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

ادھر طارق جمشیدی صاحب نے نئے کھیل کا آغاز کر دیا۔ نغمانہ ان کی صاحبزادی تھیں۔ طارق جمشیدی صاحب کی صاحبزادی ہونے کی تمام صفات سے آراستہ۔ یقینی طور پر میری تاک میں لگی ہوئی تھیں اور اس دن جب میں بادلوں کی چھاؤں میں حویلی کے پائیں باغ میں خوبصورت پھولوں کا جائزہ لے رہا تھا، مجھے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا تو نغمانہ صاحبہ دھانی سوٹ میں ملبوس مجسم قیامت بنی ہوئی میرے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

"ہیلو...... آپ پلیز آ جایئے، میں چل رہا ہوں۔"

"ارے، ارے، ارے...... آپ کو دیکھ کر تو میں یہاں آئی ہوں اور آپ مجھے دیکھ کر جا رہے ہیں؟" نغمانہ نے نغمہ باری کی۔

"اوہو، کوئی کام ہے مجھ سے؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں۔ بہت ضروری کام۔"

"فرمایئے؟" میں نے کہا اور نغمانہ صاحبہ آگے بڑھیں۔ انہوں نے ایک بہت خوبصورت پھول توڑا اور اسے میری طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔

"آپ کو یہ پھول پیش کرنا چاہتی تھی۔"

"شکریہ۔" میں نے پھول لیتے ہوئے کہا۔

"اور اب اس کے بعد کچھ سوالات میرے ذہن میں ہیں جو آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"پوچھیے۔"

"کوئی غلطی ہوئی ہے ہم سے؟"

"جی......"

"میں نے پوچھا کہ کوئی غلطی ہوئی ہے ہم سے؟"

"پتہ نہیں۔"

"مطلب یہ کہ آپ ناراض ہیں۔"

"کس سے؟"

"مجھ سے۔"

"بالکل نہیں۔"

"رشتہ ہے ہمارا آپس میں۔"

"جی ہاں۔"

"کیا رشتہ ہے؟"

"آپ میری کزن ہیں۔"

"خدا کا شکر ہے آپ نے یہ الفاظ اُردو میں نہیں کہے۔"

"کیا مطلب؟"

"انگریزی کی کزن میں بڑی گنجائش ہے جبکہ اُردو میں اگر کوئی کسی کو بہن کہہ دے تو طبیعت پر خود بخود ایک بوجھ آ پڑتا ہے۔"

"بڑی اچھی توجیہہ تلاش کی ہے آپ نے۔"

"ہے تو سہی نا۔"

"آپ کہتی ہیں تو میں مان لیتا ہوں۔"

"اچھا مذاق ختم کیجئے۔ آپ مجھے یہ بتائیے کہ مجھ سے منحرف ہونے کی وجہ کیا ہے؟"

"آپ سے کس نے کہا کہ میں آپ سے منحرف ہوں؟"

"آپ کے رویے نے۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ میرے رویے میں ایسی کوئی بات تھی۔"

"ایک بار بھی آپ نے مجھے مخاطب نہیں کیا۔"

"ضرورت نہیں پیش آئی۔ چلئے اب کئے لیتا ہوں۔"

"ہاں یہ ہوئی نا بات۔ تو جناب! ہم آپ کے کزن ہیں اور اب آپ سے یہ فرمائش کرنا چاہتے ہیں کہ دنیا سے ہٹ کر آپ ہماری طرف توجہ دیں۔"

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور میں نے کہا۔ "ذرا توجہ کی قسم بھی بتا دیجئے۔ ویسے تو آپ کے ساتھ ڈنر ٹیبل پر خاص طور سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جب کبھی آپ چچا جان کے ساتھ نظر آتی ہیں تو آپ سے سلام دعا بھی ہو جاتی ہے۔"

"یہ کافی نہیں ہے۔" نغمانہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"تو پھر میری ذمہ داریاں آپ مجھے بتا دیجئے؟"

"آپ کی ذمہ داریاں؟"

"جی۔"

"ٹھیک ہے، صبح کو آپ ہوا خوری کے لئے اٹھتے ہیں؟"

"پابندی کے ساتھ نہیں۔ کبھی دل چاہتا ہے تو اٹھ جاتا ہوں۔"

"کل سے آپ کو پابندی کرنا ہوگی۔"

"وہ کیسے؟"

"صبح ساڑھے چھ بجے آپ جاگ کر یہاں پائیں باغ میں آ جائیں گے۔ میں بھی چند منٹ کے بعد پہنچ جاؤں گی۔ ہم دونوں ایک گھنٹے تک ہوا خوری کریں گے۔ کل سے اس سلسلے کا آغاز ہوگا۔ سمجھ رہے ہیں آپ؟"

"جی۔"

بس نغمانہ صاحبہ پورے دن بجلیاں گراتی رہیں۔ ابتدا میں تو کچھ سمجھ نہیں آیا لیکن جب رات کو ڈنر کے بعد انہوں نے بڑے پُر اعتماد انداز میں کہا۔

"آپ نے ہمارا بیڈ روم دیکھا ہے؟"

میں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا، سب نے سنی ان سنی کر دی تھی۔

"آئیے میں آپ کو دکھاؤں۔ میں نے بڑے نادر سکے جمع کئے ہیں۔ سکے جمع کرنے کا شوق ہے۔ آئیے نا۔"

میں بوکھلائے ہوئے سے انداز میں نغمانہ کے ساتھ آگے بڑھ گیا تھا اور جب میں آگے بڑھ رہا تھا تو میں نے پلٹ کر طارق جمشیدی صاحب کی صورت دیکھی۔ طارق جمشیدی اپنی بیگم کو مسکرا کر کچھ اشارہ کر رہے تھے اور ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ چچا جان اب اپنا آخری کارتوس استعمال کر رہے تھے۔ پہلے انہوں نے بیٹوں کے ذریعے مجھے راستے سے ہٹانا چاہا لیکن الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔ پھر اس کے بعد انہوں نے انگریز سرکار کو اطلاع دی

کہ ایک انگریز افسر کا قاتل یہاں موجود ہے۔ اطلاع ظاہر ہے گمنام حیثیت سے دی ہوگی ورنہ اب تک تھانے پہنچ چکے ہوتے۔ ذلائی لامہ کی نوازش نے انگریز محکمہ پولیس کے ریکارڈ سے اعلیٰ آفیسر کے قتل کا ریکارڈ غائب کرا دیا تھا اور مجھے ان لوگوں کے ذہن سے محو کر دیا تھا چنانچہ یہ کوشش بھی ناکام ہوگئی۔ اور اب آخری حربے کے طور پر وہ نغمانہ کو سامنے لائے تھے۔ اس بیوقوف لڑکی کے ذریعے وہ مجھے پھانسنا چاہتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے میں کھایا کھیلا آدمی تھا، یہ بیوقوف لڑکی بھلا مجھے کیا احمق بنا سکتی تھی۔ اس جیسی درجنوں کو میں خود بیوقوف بنا کر پھینک دیتا۔ بہر حال یہ ان کا آخری کھیل تھا اس کے بعد وہ کیا کریں گے۔

ادھر ایاز کو میں نے جس کام سے بھیجا تھا وہ اس نے مکمل کر دیا اور بیرسٹر صادق ہادی خود میری فرمائش پر آ گئے۔ البتہ جب انہیں ایک جھونپڑی میں مجھ سے ملاقات کرنا پڑی تو وہ بہت حیران ہوئے۔

''یہ سب کچھ مذاق تو نہیں ہے؟ یہ آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں مسٹر ایاز! آپ نے تو خاقان جمشیدی کا ذکر کیا تھا اور جمشیدی خاندان معمولی حیثیت کا مالک نہیں ہے، پوری سیتا گڑھی ہی اس کی ہے۔''

''میں خاقان جمشیدی ہوں بیرسٹر صاحب! اور آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں جھونپڑیوں کا ایک پورا شہر آباد ہے، بے شمار انسان ان جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ آپ کے خیال میں ان کی زندگی، اس کی بود و باش صرف ایک مذاق ہے؟ کیا آپ تقدیر کو مذاق کہنا پسند کریں گے؟ کیا آپ اللہ کے عمل کو ایک مذاق سے تشبیہ دینا چاہتے ہیں بیرسٹر صاحب؟''

بیرسٹر صادق ہادی ایک دم سنبھل گئے اور انہوں نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''انتہائی معذرت خواہ ہوں میں خاقان جمشیدی صاحب! سخت سرمندہ ہوں اپنے الفاظ پر۔ میرا یہ مطلب بالکل نہیں تھا۔ اصل میں دیکھئے بات صرف اتنی سی ہے کہ انسان کسی بھی شخصیت کے بارے میں ایک ذہن رکھتا ہے، ایک سوچ رکھتا ہے۔ خاقان جمشیدی جیسا کہ میں نے عرض کیا بہت بڑا نام ہے، ہم اسے کسی شاندار حویلی میں تصور کر سکتے ہیں۔ اور اگر وہ کسی ایسی جھونپڑی میں نظر آئے تو حیرت کی بات ہے۔ ان جھونپڑیوں میں رہنے والوں کو میں مذاق بالکل نہیں کہہ رہا۔ آپ میری بات کا یقین کر لیجئے گا۔''

''نہیں صادق ہادی صاحب! میں کوئی طنز نہیں کر رہا آپ پر۔ بس یوں ہی برسبیل تذکرہ

یہ بات نکل آئی تھی۔ خیر میں آپ کو تھوڑی سی تفصیل بتانا چاہتا ہوں۔ والد صاحب کی موت کے بعد مجھے ملک سے باہر جانا پڑا اور ایک طویل عرصہ میں نے یہاں کے معاملات سے لاتعلق رہ کر گزارا۔ پھر جب میں یہاں واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ شاید یہ سوچ کر میری تمام جائیداد اور دولت پر قابض ہو گئے کہ میرے والدین تو مر ہی چکے ہیں، میں بھی لاپتہ ہوں چنانچہ یہ سب کچھ ان کا ہے۔ بڑی من مانیاں کرتے رہے وہ۔ رشتے کے چچا ہیں میرے، اپنی پسند اور ناپسند کا بھی اظہار کر دیا انہوں نے۔ بہر حال اب میں واپس آ گیا ہوں۔ قانونی رو سے یہ تمام جائیداد میری ہے۔ اور ویسے بھی میرے والد نے زمینوں اور جائیداد کا بہت بڑا حصہ بچپن ہی سے میرے نام منتقل کر دیا تھا۔ یہ صرف اولاد پیدا ہونے کے شوق کے نتیجے میں کیا تھا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ تمام کاغذات کہاں محفوظ ہیں اور ویسے بھی میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں چنانچہ یہ ساری ملکیت میری ہے۔ میرے چچا صاحب اس دولت و جائیداد کے خود ساختہ متولی بن گئے ہیں اور اپنے دونوں بیٹوں کی مدد سے من مانی کر رہے ہیں۔ اب میں قانونی طور پر جائیداد کو مکمل طور پر اپنی تحویل میں لینا چاہتا ہوں اور اپنا ایک متولی مقرر کرنا چاہتا ہوں جو اس سارے نظام کو سنبھالے۔''

''جی... بآسانی ہو سکتا ہے خاقان جمشیدی صاحب! آپ وہ کاغذات مجھے مہیا کر دیں۔''

''آپ سے ملاقات ہو گئی، بڑا اچھا ہوا۔ میرا خیال ہے میں ایاز ہی کو اس سلسلے میں استعمال کروں گا۔ کیونکہ میں خود یہاں مصروف ہوں۔''

''کوئی حرج نہیں ہے۔ جیسا آپ پسند کریں۔ ویسے آپ کو دہلی آنا پڑے گا۔ بس ایک بار عدالت عالیہ میں جا کر آپ مجسٹریٹ کے سامنے اپنا بیان ریکارڈ کرا دیں، باقی سب بالکل ٹھیک ہے۔''

''میں حاضر ہو جاؤں گا جب بھی آپ حکم دیں گے۔ بیرسٹر صاحب! معافی چاہتا ہوں یہ ایک حقیر سی رقم آپ کی فیس کے طور پر۔''

میں نے ایک خاصی بھاری رقم بیرسٹر صادق ہادی کو دی اور انہوں نے شکریہ کے ساتھ وہ رقم قبول کر لی۔ بس پھر تو ان کا رویہ ہی بدل گیا۔ کچھ کاغذات انہوں نے فوری طور پر تیار کئے جو ان کی اپنی ہی اتھارٹی کے طور پر تھے اور میں نے انہیں اپنا قانونی مشیر مقرر کر دیا تھا۔ یہ کارروائی ہوئی اور صادق ہادی نے واپسی کی اجازت طلب کر لی۔ ایاز انہیں چھوڑنے چلا گیا تھا۔ ماموں حافظ نے کہا۔

''مجھے یقین کرو اس بات کی خوشی نہیں ہے کہ طارق جمشیدی کا دورِ اقتدار ختم ہو گیا اور اس کے راستے تنگ ہو گئے، مجھے بس اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے اپنا منصب سنبھال لیا۔ اب جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ ایک الگ بات ہے۔''

''جی...... میں سمجھ رہا ہوں۔ لیکن آپ بے فکر رہئے۔ بات وہی آ جاتی ہے ماموں صاحب! والد صاحب یعنی ہمدان جمشیدی تو انتہائی فراخ دل انسان تھے، اپنے خاندان کو ہر طرح کی سہولتیں باہم پہنچانا ان کی دلی خواہش ہوتی تھی، ہر ایک کو بلا کر انہوں نے اپنے پاس حویلی میں رکھا اور حویلی بھر دی تھی۔ میں بھی ان کے ان اقدامات سے منحرف نہیں ہوں۔ مگر یہ کیا کہ طارق جمشیدی صاحب نے لوگوں کے بارے میں فیصلے کرنا بھی شروع کر دیئے کہ کس کو کیا مقام دینا ہے، کس کے لئے کیا کرنا ہے۔ ویسے ماموں صاحب! آپ کو ایک دلچسپ اطلاع دوں، دینا تو نہیں چاہتا تھا لیکن آپ کو خوشی ہو گی، اس کا مجھے اندازہ ہو چکا ہے۔ طارق جمشیدی صاحب نے بہت سی چالیں چلی ہیں اور اپنی ہر چال میں ناکام رہے ہیں۔''

''کیا مطلب...کیسی چالیں؟'' ماموں حافظ نے پوچھا اور میں انہیں شروع سے ساری تفصیل بتانے لگا۔ احمد اور شاہنواز کی کالے کنوئیں پر ہنگامہ آرائی، اس کے بعد دوسری کوشش یعنی انگریز سرکار کو میرے بارے میں تفصیل بتانا اور پولیس کو بلا لینا۔ یہاں بھی انہیں ناکامی ہوئی۔ اور تیسری کوشش نعمانہ کی تھی۔ میں نے ذرا بے تکلفی سے کہا۔

''نعمانہ لڑکی ہے اور بہرحال طارق جمشیدی صاحب سے میرا ایک چھوٹا سا رشتہ بھی ہے۔ لیکن طارق جمشیدی صاحب نے جس حوالے سے اس کا آغاز کیا ہے وہ ظاہر ہے بڑا شرمناک ہے۔ ان کا مفہوم کچھ اور ہی ہے۔''

ماموں حافظ کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے کہا۔ ''خداوند عالم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے نام کے ساتھ کوئی ایسی چیز وابستہ نہیں تھی۔ خاص طور سے یہ کہ میری کوئی بیٹی ہی نہیں ہے۔ حالانکہ بیٹیاں اللہ کی نعمت ہوتی ہیں اور میں نے ہمیشہ بیٹیوں کی خواہش کی ہے۔ لیکن بہرحال اللہ کا حکم نہیں تھا۔ اور اس کا حکم تو بہرحال ہر حالت میں قبول ہوتا ہے۔ لیکن بیٹا! یہ تو بڑی شرمناک حرکت ہے۔''

میں ہنسنے لگا تھا۔

☆☆☆

نعمانہ بیچاری کوئی تربیت یافتہ لڑکی تو تھی نہیں۔ اب ان بیوقوفوں کو کیا معلوم کہ میں نے زندگی میں بڑے الٹ پھیر دیکھے تھے۔ ایسے ایسے کردار میری زندگی میں آئے تھے جو عورت کے نام سے بہت آگے نکل چکے تھے اور جن کا زندگی میں ایک تجربہ تھا۔ عالیہ آدم زمان اور اس کے بعد ایبنہ وغیرہ یہ سب بہت آگے کی چیزیں تھیں۔ اور میں جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اچھا خاصا کھایا کھلایا انسان تھا، پھر بیچاری یہ معصوم سی گھریلو لڑکی مجھے کیا بیوقوف بناتی۔ حالانکہ حیران کن بات یہ تھی کہ کم از کم ایسے معاملات میں یہ لڑکیاں خود بخود ٹرینڈ ہو جاتی ہیں۔ نعمانہ اپنی بھرپور قوتوں کے ساتھ مجھ پر حملہ آور تھی۔ موقع ملتے ہی میرے پاس آ گئی۔

''کہاں گئے تھے؟''

''ارے یہ آپ کا اندازِ تخاطب کیسا ہے نعمانہ؟''

''اتنی گاڑھی اُردو کیوں بول رہے ہیں؟''

''کیوں؟''

''آپ کا اندازِ تخاطب۔ کیا میں آپ کہلانے کے قابل ہوں؟''

''کیوں بھئی کیوں، یہ تو احترام کا لفظ ہے۔''

''احترام؟'' اس نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

''بابا، کہنا کیا چاہتی ہو؟'' میں ہنس کر بولا۔

''عزت، احترام یہ تمام رشتے تکلف کے ہوتے ہیں اور جناب خاقان صاحب! میں نہیں چاہتی کہ آپ مجھ سے تکلف برتیں۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ میری چاہت آپ کے لئے قابل قبول ہے یا نہیں۔''

میں ششدر رہ گیا تھا۔ کیا ذومعنی لفظ تھا۔ میں خاموش ہو گیا تو وہ بولی۔ ''دیکھئے...... کسی بھی بات کا جواب دیا جاتا ہے۔''

''ہاں، دیا تو جاتا ہے۔ کیا آپ نے کوئی سوال کیا مجھ سے؟''

''جی، اگر آپ سمجھیں تو۔''

''میری چاہت آپ کے لئے قابل قبول ہے یا نہیں؟'' اس نے بے تکلفی سے کہا۔

''اصل میں یہ اُردو زبان جو ہے نا، بڑی مشکل زبان ہے۔ آپ کون سی چاہت کی بات کر رہی ہیں؟'' میں نے کہا اور وہ شرمانے کی اداکاری کرنے لگی۔

"میرا مطلب ہے...... میرا مطلب ہے میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ مجھ سے بے تکلفی سے پیش آیا کریں۔"

"اس چاہت کا ذکر کر رہی ہیں آپ؟" میں نے کہا اور وہ مسکرانے لگی۔ پھر بولی۔

"آپ حرفوں سے کھیل رہے ہیں۔"

"چلئے معذرت چاہتا ہوں۔"

"چاہتا ہوں؟"

"جی، جی۔"

"اب دیکھئے نا یہاں بھی چاہت کا لفظ استعمال ہو گیا۔ کتنے معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔"

"بھئی آپ کی طرح میں لفظوں کا کھلاڑی نہیں ہوں۔ ویسے بھی زیادہ تر ملک سے باہر رہا ہوں۔"

"جناب، کلکتے میں بڑی تعلیم حاصل کی ہے آپ نے۔"

"ہاں کی تو ہے۔"

"اچھا ایک بات بتائیے، کلکتے میں جب آپ تعلیم حاصل کر رہے تھے تو کتنی عمر تھی آپ کی؟"

"مردوں سے ان کی عمر نہیں پوچھا کرتے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"جی نہیں، یہ بات خواتین کے لئے کہی جاتی ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے، کیا خواتین اپنی عمر ٹھیک نہیں بتاتیں؟"

"ارے ہم کیا باتیں کر رہے ہیں، کہیں کسی ایک جگہ ٹکتے ہی نہیں ہیں۔ میں نے آپ سے سوال کیا تھا کہ آپ کہاں گئے تھے اور بات ایک دوسرے کے کاندھے پر سوار ہو کر کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ لیکن کیا آپ اب دوبارہ اس سوال پر واپس آئیں گی؟"

"کون سے سوال پر۔"

"یہی کہ میں آپ کو بتاؤں کہ میں کہاں گیا تھا۔"

"نہیں، میرا خیال ہے کہ میں زیادتی کر رہی ہوں۔ آپ نے تو یہ تک نہیں بتایا ابھی مجھے کہ مجھے آپ سے یہ سوال کرنے کا حق ہے یا نہیں۔"

"بھئی آپ میری کزن ہیں۔"

"چھوڑیئے، ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ کزن تو آپ کے یہاں اور بھی بہت سے ہیں۔"

"پھر آپ کیا چاہتی ہیں نغمانہ صاحبہ؟"

"چاہت، چاہت، چاہت۔ دیکھا آپ نے، یہ تو بڑا خطرناک لفظ ہے بھئی۔" نغمانہ نے کہا اور ہنس پڑی، پھر بولی۔ "آیئے باہر چلیں۔ یہاں گھٹن ہو رہی ہے۔ ویسے آپ کا فرض ہے کہ آپ ہمیں اپنی زمینیں دکھانے لے جائیں، تھوڑی سی سیر و سیاحت کرائیں۔ پتہ نہیں آپ کس طرح کے کزن ہیں، گھاس ہی نہیں ڈالتے۔"

"آپ کی خدمت میں گھاس کے گٹھر کے گٹھر۔ لیکن جہاں تک زمینیں دکھانے کا تعلق ہے تو آپ کے دونوں برادران مجھے زمینیں دکھانے لے گئے تھے۔ کیا آپ کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ کیا مطلب؟" نغمانہ نے کہا اور میں اس کے چہرے پر جھوٹ اور سچ تلاش کرنے لگا۔ اندازہ یہ ہوا کہ وہ سچ ہی بول رہی ہے۔ ظاہر ہے چچا جان اب اسے ایسے معاملات میں تو شریک نہیں کر سکتے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے اسے یہ تک نہ بتایا ہو کہ اسے میری جانب پھینکنے کا مقصد کیا ہے۔ میں نے یونہی ایک سوال کر ڈالا اس سے۔

"نغمانہ، ایک بات بتایئے آپ؟"

"جی فرمایئے؟"

"یہ اچانک ہی آپ میری طرف راغب کیوں ہو گئیں؟ مجھے تو یہاں آئے ہوئے خاصے دن گزر گئے۔ آپ نے تو مجھ سے کبھی کسی خاص رغبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔"

"سچ بتاؤں آپ کو؟"

"میرا خیال ہے جھوٹ بولنے کی نہ کوئی ضرورت ہے نہ گنجائش۔ ویسے آپ کی مرضی ہے۔"

"آپ مجھے پہلی نگاہ میں اچھے لگے تھے لیکن بس ہمارا تعلق مشرق سے ہے۔ ماں باپ، بھائی یہ سب ہمارے لئے قابل احترام ہوتے ہیں اور ہم ان کی مرضی کے تابع۔ آپ مجھے اچھے لگے تھے لیکن میں نے اس بات کو اپنے دماغ میں ہی رکھا۔ پھر ایک دن امی نے مجھ

سے آپ کے بارے میں سوال کیا۔

"سوال کیا؟"

"ہاں۔"

"کیا؟"

نغمانہ کے چہرے پر پھر شرم کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ دیر تک خاموش رہی۔ جب میں نے دوبارہ اس سے کہا تو وہ بولی۔

"انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ خاقان تمہیں کیسے لگتے ہیں۔" وہ شرمائی ہوئی آواز میں بولی۔

"اچھا، پھر؟"

"ظاہر ہے میں کوئی جواب تو نہیں دے سکتی تھی انہیں۔"

"کیوں......اچھے یا برے لگنے سے کوئی برائی تو نہیں پیدا ہو جاتی۔"

"نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ اب میں ان سے کیا کہتی؟"

"کیا کہا آپ نے، مجھے یہ بتایئے۔"

"بس میں خاموش ہو گئی۔ انہوں نے کہا کہ نغمانہ، تمہارے ابو خاقان کو تمہاری زندگی میں شامل کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ تم ایسا کرو کہ خاقان سے مراسم بڑھاؤ۔ اگر تم اس کے ساتھ نظر آؤ گی تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ نہ مجھے، نہ تمہارے ابو کو اور نہ تمہارے بھائیوں کو۔ اپنا ایک معیار قائم رکھنا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ خاقان سے گہری دوستی پیدا کر لو تاکہ مستقبل میں تمہیں ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے میں کوئی اُلجھن پیش نہ آئے۔"

میرا دل چاہا کہ ایک زور کا قہقہہ لگاؤں۔ لیکن نغمانہ ان برے لوگوں میں اتنی بری نہیں تھی، جس سادگی سے اس نے یہ سب کچھ بتایا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ذہنی طور پر بہت زیادہ وسیع نہیں ہے۔ یہ سب کچھ بتانے کے بعد وہ خاصی دیر تک شرمائی شرمائی رہی تھی۔

بہرحال اگر وہ چچا طارق کی سازش نہ ہوتی تب بھی بے چاری مجھے اس حیثیت سے قبول تو نہیں تھی۔ میں خاموش ہو گیا۔ پھر کچھ ملازموں کی آمد نے یہ سلسلہ ختم کیا اور نغمانہ چلی گئی کیونکہ اسے طارق جمشیدی نے بلایا تھا۔ میں گہری سانس لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

بہرحال میرے ذہن پر کوئی بوجھ، کوئی بار نہیں تھا۔ طارق جمشیدی صاحب غلط آدمی تھے اور اب اپنی غلط کاریوں کی سزا بھگتنے جا رہے تھے۔ میں نے جو فیصلے کئے تھے وہ کافی سخت تھے۔ اس کے بعد میں نے ان کاغذات کی تلاش شروع کر دی۔

بہت ہی پرانی بات تھی، ایک دفعہ میں ہمدان جمشیدی صاحب کے ساتھ شکار پر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا اور ہمدان جمشیدی صاحب تھوڑے سے کاغذات میں مصروف تھے۔ پھر انہوں نے مجھ سے کہا کہ یہ کاغذات دولت اور جائیداد سے متعلق ہیں۔ اور انہوں نے یہ بھی مجھے بتایا کہ خاقان! ان کاغذات کی جگہ ذہن نشین کر لو۔ یہ اتنا اہم معاملہ ہے کہ میں نے تمہاری والدہ تک کو اس بارے میں نہیں بتایا۔ بات اصل میں یہ ہے بیٹا! کہ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے روگ پال رکھے ہیں۔ اب تم سے کیا چھپانا، میری بہت سی بیگمات ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کبھی کوئی ایسا وقت آئے جب جائیداد وغیرہ کے سلسلے میں کچھ پریشانیاں ہوں۔ اس لئے میں یہ کاغذات تیار کر کے وہاں رکھ رہا ہوں۔ آؤ میں تمہیں وہ جگہ دکھا دوں۔ اس کے بارے میں خبردار کسی کو معلوم نہ ہونے دینا۔

اس وقت تو بس یہ مجھے ایک کھیل لگا تھا۔ لیکن آج وہ کھیل میرے لئے کس قدر کارآمد تھا، میں ہی جانتا تھا۔

حویلی کے ایک دور دراز کمرے میں ایک الماری دیوار میں نصب تھی۔ اس میں طرح طرح کے فائل اور کاغذات دیوار میں چنے ہوئے تھے۔ لیکن اس الماری کو ایک خاص کیل کے ذریعے گھمایا جا سکتا تھا اور اس کے پیچھے ایک دوسری الماری نمودار ہو جاتی تھی جس میں یہ کاغذات تھے۔ میں نے سامنے والی الماری میں پرانے کاغذوں کے ڈھیر دیکھے لیکن ایک لمحے کے اندر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ان فائلوں اور کاغذات کو ہزاروں مرتبہ دیکھا گیا ہے۔ البتہ جب میں نے وہ کیل گھمائی تو الماری بے آواز گھوم گئی اور اس کے پیچھے مجھے ان کاغذات کا پیکٹ نظر آ گیا جو میرے لئے بڑی حیثیت کے حامل تھے، جن کی رو سے میں اپنے والد کی تمام جائیداد کا تنہا اور بلاشرکت غیرے مالک تھا۔ ہمدان جمشیدی صاحب نے بہرحال مجھ سے ساری زندگی محبت کی تھی۔ انہوں نے مجھے اپنے دوستوں کی حیثیت دی تھی اور دوست ہی کی حیثیت سے وہ مجھے شکار پر لے جاتے تھے۔ آج ان کی دوستی پھر میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ زندگی میں پہلی بار میری آنکھوں سے آنسوؤں کے کچھ قطرے بہہ گئے۔

بہرحال یہ ایسے کردار ہوتے ہیں جن سے زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور جن پر زندگی کا دارومدار ہوتا ہے۔ یہ اپنا فرض پورا کر کے دنیا چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن دنیا میں جو کچھ اپنی اولاد کے لئے چھوڑ جاتے ہیں وہ ناقابل فراموش ہوتا ہے۔ ہمدان جمشیدی صاحب کی ایک ایک بات مجھے یاد آتی رہی اور میں ان کاغذات کو دیکھتا رہا۔ پھر ان کا پیکٹ بند کر کے وہاں سے چل پڑا۔ اصل کام تو پس پشت نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس کا آغاز کر دینا ضروری تھا۔ اور میں ان لوگوں میں سے بالکل نہیں تھا جو آج کا کام کل پر چھوڑ کر مشکلات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ میں آج کا کام کل پر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

چنانچہ میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ایک بار پھر قرب و جوار پر نگاہ رکھتے ہوئے ماموں حافظ کے علاقے میں پہنچ گیا۔ اس بات کا پورا پورا خیال رکھتا تھا کہ ذرا طارق جمشیدی صاحب کی کارروائیوں پر نگاہ رکھی جائے۔ جو بڑا کام وہ کر رہے تھے اس کے لئے انہیں بھی بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ ذرا سی چوک انہیں بہت بڑے نقصان سے دوچار کر سکتی تھی۔ ظاہر ہے یہ دولت اور جائیداد کھو دینا ان کے لئے زندگی کا سب سے بڑا نقصان کہا جا سکتا تھا کیونکہ اس کے بعد ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اور پھر جو عمل انہوں نے کیا تھا وہ ایسا تھا کہ حویلی کا ایک بھی شخص ان سے ذرہ برابر ہمدردی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہمدردی کے قابل تھے ہی نہیں۔

بہرحال وہ اپنا کام کر رہے تھے اور میں اپنا۔ ایاز کو میں نے ایک اور اچھی خاصی رقم دی اور کہا۔

”تم صادق ہادی صاحب کے پاس چلے جاؤ۔ اور اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ کاغذت بڑی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں ضائع نہیں ہونا چاہئے۔“

”آپ بالکل فکر نہ کریں خاقان بھائی!“ ایاز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس مسکراہٹ میں اس کا عزم چھپا ہوا تھا کہ وہ زندگی کی قیمت پر بھی ان کاغذات کی حفاظت کرے گا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسا میں نے محسوس کیا۔ ایاز کو میں نے سب کچھ سمجھا دیا تھا اور ایک دلچسپ صورتحال پیدا ہونے جا رہی تھی۔

ایاز دہلی چلا گیا۔ اسی رات کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے میں اپنی آرام گاہ میں آرام کر رہا تھا کہ دفعتہً مجھے خیال آیا کہ ذرا اپنے چاروں مؤکلوں کی مدد سے دیکھوں تو سہی کہ چچا جان کی اب کیا کیفیت ہے۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا اور درحقیقت

ایک بار پھر میں دلائی لامہ کی اس مہربانی کا شکرگزار ہو گیا جو اس نے اپنے جادومنتر سے مجھ پر کی تھی۔ یہ بہت بڑی بات تھی کہ میں اپنے دشمنوں کے نزدیک اس طرح پہنچ جاتا تھا کہ میرے اور ان کے درمیان سانسوں کا فرق بھی نہ رہے۔ پتہ نہیں کیوں، چھٹی حس نے یہ کہا تھا کہ اس وقت مجلس مشاورت ہو رہی ہو گی اور ممکن ہے موضوع میں ہی ہوں۔ کیا عمدہ خیال تھا۔ میرے سامنے جو منظر آیا وہ یہی تھا کہ طارق جمشیدی صاحب کے دونوں سپوت گردن خم کئے بیٹھے ہوئے تھے، بیگم صاحبہ کچھ فاصلے پر ٹہلنگ کر رہی تھیں اور طارق جمشیدی صاحب نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑا ہوا تھا۔

”بات یہ ہے بیٹا، جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو دوسروں ہی کے سہارے تلاش کرنے لگتا ہے۔ لیکن افسوس اس وقت ہوتا ہے جب اس کے سہارے بالکل ہی بودے اور کمزور نکلیں۔“

”اور بزرگوں کا یہ سب سے بڑا شوق ہوتا ہے ابا جان! کہ وہ جوان اولاد کو گالیاں بکتے رہیں۔ ارے بابا! آپ نے دنیا دیکھی ہے، دنیا کو آپ ہم سے بہت زیادہ جانتے ہیں۔ آپ ہی بتائیے، ہم کیا کریں؟ ہمیں گالیاں تو آپ اس وقت دیں جب آپ کچھ کہیں اور ہم اس سے انکار کریں۔“

”یہی تو افسوس کی بات ہے۔ تم یہ بتاؤ اس وقت میری مدد کون کرتا تھا جب تم کتے کے پلوں کی طرح ٹیاؤں ٹیاؤں کرتے تھے۔ میں ہی تھا نا جس نے اپنی عقل، اپنی دانش سے تمہیں ایک مضبوط اور طاقتور جوان بنایا۔ اب وقت ہے کہ میرے مسائل میں تم اپنے دماغ سے سوچو۔ ابے تم لوگوں کے پاس دماغ ہے یا نہیں؟ اس کا مجھے جواب دے دو۔“

”اس بات کا تو ہم جواب دے دیں گے۔ مگر یہ بتائیے کہ اس ٹانگ کا کیا کریں جو ہماری ہر سوچ میں آ کر اڑ جاتی ہے۔“

”ٹانگ؟“ طارق چچا حیرت سے بولے۔

”جی ہاں، ٹانگ۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”دیکھ رہی ہو تم......؟“ طارق چچا بیگم سے بولے۔

”جو بات ہے، صاف کہو۔“ چچی جان نے بیٹوں سے کہا۔

"ہم کچھ کرتے ہیں تو والد صاحب کی ٹانگ بیچ میں آ جاتی ہے۔" شاہنواز نے کہا۔

"بیٹے...... میرے لختِ جگر! میرے نورِ نظر، کیا کرتے ہو تم...... اسے قتل کرنے چھ افراد جاتے ہو۔ چار کا وہ مار مار کر حلیہ خراب کر دیتا ہے اور تم پورے چار گھنٹے کالے کنوئیں میں الٹے لٹک کر اس سے معافیاں مانگتے گھر آ جاتے ہو۔"

"آپ کے پاس طنز کے علاوہ کچھ اور بھی ہے؟" احمد نے جل کر کہا۔

"جھوٹ بول رہا ہوں میں...... بتاؤ؟"

"آپ کو حقیقت بتائی جا چکی ہے۔"

"حقیقت؟"

"جی۔"

"وہ کیا؟"

"وہ تنہا نہیں تھا۔"

"کون تھا اس کے ساتھ؟"

"کچھ پراسرار قوتیں۔"

"جو نظر نہیں آتی تھیں؟"

"جی۔"

"بیٹے، ہم بھی بچپن میں ایسے ہی بے تکے جھوٹ بولتے تھے۔ لیکن وہ بچپن کی بات تھی۔ جوان ہو کر ہم نے ایسا جھوٹ کبھی نہیں بولا۔"

"ہم جھوٹ نہیں بول رہے۔" دونوں بیٹے چیخ کر بولے۔

"چیخو مت...... میں تم سے زیادہ چیخ سکتا ہوں۔"

"پھر ہم ایک ہی بات کہہ سکتے ہیں۔"

"وہ کیا؟"

"سب کچھ بھاڑ میں جائے۔" شاہنواز نے کہا۔

"چلا جائے گا نورِ نظر...... چلا جائے گا۔ اطمینان رکھو۔ مگر یہ جانتے ہو کہ سب کچھ بھاڑ میں جانے کے بعد ہم کہاں جائیں گے؟"

"ہمیں کیا معلوم۔"

"مجھے معلوم ہے، بتاؤں؟" طارق چچا بولے۔

"وہ بھی بتا دیجئے۔"

"چولہے میں۔" طارق چچا بولے۔

"تو آخر ہم کیا کریں؟ آپ نے تو ہماری زندگی برباد کر دی ہے۔" شاہنواز غصے سے بولا۔

"بالکل ٹھیک کہتے ہو تم...... بالکل ٹھیک کہتے ہو الو کے پٹھو۔ دو کوڑی کے نہیں ہو تم۔ بالکل ناکارہ...... حرام خور، مردود۔"

"بس ایک آسانی حاصل ہے آپ کو ابا جان! وہ یہ کہ آپ ہمارے باپ ہیں۔ ورنہ ہم آپ کو بتاتے کہ ہم کتنی کوڑیوں کے ہیں۔"

"مجھے بتاتے...... ایں...... مجھے بتاتے؟" طارق چچا کسی ہتھیار کی تلاش میں پھدکنے لگے اور چچی جان بیٹوں کو دروازے کی طرف دھکیلنے لگیں۔

ہنس ہنس کر میرے پیٹ میں بل پڑ گئے تھے۔ دونوں صاحبزادے اٹھ کر باہر نکل گئے۔ کمرے کی فضا خاصی مکدر ہو گئی تھی۔ بیگم طارق جمشیدی یعنی چچی صاحبہ منہ پھاڑے بیٹھی تھیں۔ نغمانہ پریشان تھی۔ پھر اسی نے یہ خاموشی توڑی۔

"یعنی اب یہ ہو گا گھر میں؟"

"اس سے بھی برا...... دیکھو تو سہی۔" طارق صاحب نے ہتھیلی پر گھونسہ مار کر کہا۔

"آپ ہی خود کو سنبھالیں۔ جوان بچوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتے۔" چچی جان نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ایک بات کہوں تم سے۔" چچا طارق بولے۔

"جی......"

"انہیں بدمعاش میں نے بنایا ہے۔"

"تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ یہ کام میں نے کیا ہے۔" چچی جان بولیں۔

"اور میں ہی انہیں ٹھیک بھی کر سکتا ہوں۔"

"ضرور کریں۔"

"سال سال بھر کی سزا کرا دوں گا۔ جیل میں چکی پیسیں گے تو اوقات میں آ جائیں گے۔ جب چاہوں یہ کام کر سکتا ہوں۔"

"یہ کوئی حل ہے؟" چچی جان بولیں۔

"یہی حل ہے ان کمین کے بچوں کا۔" طارق صاحب نے کہا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ کمین کے بچے تو پہلے ہی باہر نکل گئے تھے، والد صاحب بھی باہر نکل گئے۔ اب رہ گئی تھیں نغمانہ بیگم اور محترمہ چچی جان۔ اب میں نے یہ سوچا کہ ذرا ان کی بھی سنوں۔ نغمانہ بیگم سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اچانک چچی جان نے چونک کر کہا۔

"نغمانہ! تم کیا کہتی ہو اس بارے میں؟"

"امی، میں کیا کہوں گی۔ آپ لوگوں نے مجھے جس راستے پر لگایا ہے، میں کام کر رہی ہوں آپ کی ہدایت کے مطابق۔ حالانکہ آپ کو پتہ ہے میں کس طرح کی لڑکی ہوں۔ میں نے کبھی......"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! لیکن بعض اوقات مصلحت کے لئے سب کچھ کرنا ہوتا ہے۔ اب تم دیکھو نا، ہم کیسی مشکل میں آ پھنسے ہیں۔ اگر خاقان جمشیدی اپنا سب کچھ واپس لینے پر اتر آئے تو اسے سنبھالنا مشکل ہوگا۔ کون سنبھالے گا اسے؟"

"میں جانتی ہوں۔"

"اب تو تم پر ہی بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔"

"جب آپ مجھ پر بھروسہ کر رہے ہیں تو پھر مکمل بھروسہ کیوں نہیں کر لیتے؟ یہ پریشانیاں کس لئے؟"

"تمہارا مطلب ہے کہ تم......"

"میرا کوئی مطلب نہیں ہے۔ بس آپ نے جو کام میرے سپرد کیا ہے وہ میں آپ کو کر کے دکھا دوں گی۔ اپنے دونوں بیٹوں کو تو آپ نے ناکارہ بنا دیا ہے۔ لیکن میں خدا کے فضل سے ناکارہ نہیں ہوں۔"

"جی خوش کر دیا تو نے بیٹی!" چچی جان نے اپنی ہونہار بیٹی کو سینے سے لگا لیا اور میں نے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ مقصد یہ تھا کہ میرے نادیدہ محافظ میری نگاہوں کے سامنے سے ختم کر دیں۔ اور ایسا ہو گیا۔ وہ میرے ہر اشارے کو سمجھنے لگے تھے۔

بہر حال یہ ایک دلچسپ مرحلہ تھا جو اب میری زندگی سے گزر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہاں بھی اچھی خاصی دلچسپ صورتحال ہے۔ ماموں حافظ کے گھر بڑا سکون ملتا تھا۔ زندگی کہاں کہاں، کس کس عالم میں ہوتی ہے۔ جھونپڑیوں کا یہ شہر اپنے مسائل الگ رکھتا تھا اور ماموں حافظ ان لوگوں سے زیادہ مطمئن نظر آتے تھے۔ رُوکھی سوکھی میں زندگی گزر رہی

تھی۔ میں بھی اسی میں شامل ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ صادق ہادی نے اپنے سارے کام مکمل کر لئے اور اس کے بعد خود مجھ سے ملنے آ گئے۔ بہت بڑے بیرسٹر تھے اور سنا یہ گیا تھا کہ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ ایسی جھونپڑیوں میں قدم رکھنا ان کے لئے بڑی بے عزتی کی بات تھی۔ لیکن عزت اور بے عزتی کا تعین بھی دولت کے معیار پر کیا جاتا ہے۔ اب اس جھونپڑی سے انہیں بڑی رغبت تھی کیونکہ یہاں سے انہیں بہترین معاوضہ مل رہا تھا۔ تمام کاغذات انہوں نے تیار کرا لئے تھے اور پھر جب انہوں نے پوچھا کہ اب اس جائیداد کے متولی کے خانے میں کس کا نام لکھا جائے تو میں نے بڑے اطمینان سے ماموں حافظ کا نام لے دیا اور ماموں حافظ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"یہ...... یہ...... یہ بیٹا...... یہ بیٹا......"

"ماموں جان! میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میں تو آوارہ مزاج آدمی ہوں۔ آج یہاں کل وہاں۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے میرے مشاغل کیا ہیں۔ میں آپ جیسی ذمہ دار شخصیت کو یہ تمام ذمہ داریاں سونپنا چاہتا ہوں اور بلاتکلف اس سلسلے میں بھی کچھ معاملات طے کر دینا چاہتا ہوں۔ مثلاً میں نے زمینوں کے بہت سارے کاغذات، جائیداد وغیرہ کی تفصیلات دیکھی ہیں۔ ان تمام چیزوں میں سے بیس فیصد میں محمود اور ایاز کے نام کرتا ہوں۔ اس آمدنی کا بیس فیصد ان کی ملکیت ہوگا، پندرہ فیصد آپ کے متولی ہونے کا معاوضہ۔ آپ ان تمام چیزوں کی دیکھ بھال کریں گے۔ پانچ فیصد اس اسٹاف کے لئے جو آپ کے ساتھ آپ کے معاونوں کے طور پر کام کرے گا۔ یہ ہوئے چالیس فیصد۔ دس فیصد خاندان کے ان افراد کے لئے جو حویلی میں ہمارے ساتھ رہتے ہیں، ان کی فلاح و بہبود، ان کے بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال۔ باقی پچاس فیصد آپ میرے اکاؤنٹ میں رہنے دیجئے۔ صادق ہادی صاحب! آپ نے میری بتائی ہوئی تفصیلات نوٹ کر لی ہیں؟"

"بالکل...... بالکل جناب۔ نوٹ کر لی ہیں۔"

محمود اور ایاز کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ جو بیس فیصد آمدنی میں نے ان کے حوالے کی تھی، اتنی تھی کہ وہ رئیسوں کی طرح زندگی گزار سکتے تھے۔ معمولی زمینیں اور جائیدادیں نہیں تھیں۔ صادق ہادی صاحب نے کہا۔

"ایک بات اور فرمائیے جناب! طارق جمشیدی صاحب نے جو اُلٹ پلٹ کی ہے، اس

کے بارے میں کیا کرنا ہے؟"

"صرف انہیں دھمکیاں دینا ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ظاہر ہے وہ بھی میرے چچا ہی ہیں اور جو کچھ کر چکے ہیں اس کے نتیجے میں اگر میں چاہوں تو انہیں بڑا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ لیکن میں انہیں حویلی میں نہیں رہنے دینا چاہتا۔ مشرقی سیتا گڑھی میں ہمارا ابھی ایک مکان ہے اور جس میں ہماری ایک والدہ صاحبہ رہتی تھیں۔ یعنی ہمارے والد صاحب کی پتہ نہیں کون سے نمبر کی بیگم، اب جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ گھر اگر طارق جمشیدی صاحب چاہیں تو انہیں دیا جا سکتا ہے۔ ہاں ایک شق خاص طور سے قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ اگر طارق جمشیدی صاحب اور ان کے دونوں بیٹوں نے خاندان کے کسی بھی فرد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو پھر انہیں باقی عمر جیل میں ہی گزارنی پڑے گی۔"

"اس کا انتظام ہو جائے گا۔" صادق ہادی نے کہا۔ میں نے اس سلسلے میں یہ تمام فیصلے کر لئے۔ صادق ہادی نے اس کو نوٹ کر لیا، پھر انہوں نے کہا۔

"اب آپ یہ فرمائیے کہ دہلی کب آ سکتے ہیں؟ میں ان تمام کاغذات کو تین دن کے اندر تیار کر لوں گا۔ آپ براہِ کرم دہلی کا ایک چکر لگا کر عدالت میں اپنا بیان دے دیجئے گا، سارے کام ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"تو آج سے پانچویں دن میں دہلی آ جاتا ہوں۔"

"ہاں، ایسا ہی کیجئے گا۔"

میں نے صادق ہادی صاحب سے وعدہ کر لیا۔ جب صاحب ہادی چلے گئے تو ماموں جان اور ممانی جان نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"اب بتائیے کیا ہوا؟ اب یہ رونا کیا معنی رکھتا ہے؟"

"بیٹا، یہ تم نے ہمیں کس بات کا صلہ دیا ہے، یہ بتا دو۔"

"آپ کو اپنا ماموں ہونے کا۔"

"نہیں، یہ بہت زیادہ ہے۔"

"ماموں جان! آپ میری والدہ کے عزیز ہیں اور یقیناً والدہ کو بھی عزیز ہوں گے۔ میں نے یہ سب کچھ ان کی روح کی خوشی کے لئے کیا ہے۔ دیکھئے نا ویسے بھی مجھے کیا کرنا ہے۔ اب یہ دونوں حضرات میرے بھائی ہیں۔ کتنی بے کسی اور کسمپرسی کی زندگی گزاری ہے انہوں

نے۔ پڑھے لکھے ہیں۔ انہیں ان کا شایانِ شان مقام مل جائے گا تو آپ کے خیال میں ایک بھائی کو اس کی خوشی نہیں ہوگی؟"

"خدا تمہیں صدیوں تک آباد رکھے۔ اور کیا کہہ سکتے ہیں ہم نادار لوگ۔"

"بابا! اب بھی آپ نادار ہیں؟ صادق ہادی صاحب سے ذرا ملاقات کر کے دیکھئے، رویہ ہی بدل گیا ہوگا ان کا۔ کیونکہ سب سے پہلے انہیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کی شخصیت کتنی بڑی ہوگئی ہے۔"

میں ان لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کرتا رہا۔ بڑے خوش تھے سارے کے سارے۔ بہرحال یہ خوشیاں ان کا حق تھیں۔ طارق جمشیدی صاحب نے اگر یہ ساری کارروائیاں نہ کی ہوتیں تو یقینی طور پر میں انہیں بھی نظرانداز نہیں کرتا۔ لیکن مجھے مروانے کی کوششیں کر چکے تھے۔ اب اتنا تو فرشتہ صفت میں بھی نہیں تھا کہ اس کے باوجود ان کے ساتھ ایثار کرتا۔ یہ سب کچھ تو غلط ہو جاتا نا۔

بہرحال اس طرح میں نے یہ کارروائی کر دی۔ ادھر محمود اور ایاز بڑی رازداری کے ساتھ کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ نغمانہ صاحبہ بیچاری اپنے طور پر میری خاطر مدارات میں لگی رہتی تھیں۔

پانچویں دن میں نے دہلی جانے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ ظاہر ہے اس کے لئے اجازت لینا تو ضروری نہیں تھی۔ میں خاموشی سے چل پڑا۔ محمود میرے ساتھ تھا۔ ہم دونوں آخر کار دہلی پہنچ گئے۔ دہلی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ہم نے قیام کیا۔ حالانکہ صادق ہادی صاحب نے مجھے پیشکش کی تھی کہ میں ان کی کوٹھی پر رہ سکتا ہوں لیکن میں نے ہوٹل زیادہ بہتر سمجھا تھا۔ چنانچہ میں ہوٹل میں مقیم ہو گیا۔

دوسرے دن صادق ہادی صاحب نے مجھے عدالت میں پیش کر دیا۔ مجسٹریٹ کے سامنے میں نے تمام بیانات دیئے اور کاغذات پر دستخط کر دیئے۔ گواہی کے لئے صادق ہادی صاحب نے کچھ افراد کو منتخب کر لیا تھا۔ چنانچہ یہ ساری کارروائی پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اور تمام کاغذات صادق ہادی کی ہی تحویل میں دے دیئے گئے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں محمود کے ساتھ دہلی کی سیر کو نکلا اور اس وقت میرے ذہن میں کوئی خاص خیال نہیں تھا۔ بس دہلی جو انگریزوں کی تحویل میں تھا اور مغل اسے کبھی کا کھو چکے تھے، میری نگاہوں کے سامنے تھا اور میرے ذہن پر نجانے کیسے کیسے تصورات قائم تھے۔ وردان سادھانی، سیوک

سندھورتی، گاشر برم، شومندر، وہ پراسرار حالات جو ماضی میں مجھے پیش آ چکے تھے سب کے سب میرے سامنے تھے۔

شاہی قلعے کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ ایک گاڑی کے بریک میرے بالکل قریب آ کر لگے اور میں چونک پڑا...... گاڑی میں سے کسی نے میری طرف چھلانگ لگائی اور میں فوراً ہی سنبھل گیا۔ لیکن چھلانگ لگانے والے نے کسی برے ارادے سے میری جانب چھلانگ نہیں لگائی تھی بلکہ اس کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے اور وہ نجانے کیا کیا اول فول بکتا ہوا میری جانب آ رہا تھا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر اسے دیکھا اور ایک لمحے کے اندر پہچان گیا۔ یہ ستنام سنگھ تھا اور اس کے منہ سے نجانے کیا کیا باتیں نکل رہی تھیں۔

''بھبھ...... بھیا جی...... تت...... تم...... بھیا جی تم...... تم...... ارے تم یہاں...... ارے کہاں بھیا جی...... جو کچھ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں وہ سچ ہے کیا؟''

میں نے ستنام سنگھ کو گلے لگا لیا تھا۔

''ارے ستنام سنگھ تم...... معاف کرنا یار، بس تمہارے پاس آنا تھا مجھے۔ لیکن ذرا اُلجھنوں میں پھنسا ہوا تھا۔''

''بھیا جی...... بھیا جی...... کیا کہوں تم سے، بس یہ بتا دو کہ اس سسری کا کیا حال ہے۔ آؤ نا گھر چلو بھیا جی۔ ارے تم یہاں آؤ گے میں نے تو خوابوں میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ بھیا جی گھر چلو۔ میرے گھر سے زیادہ اچھی جگہ دہلی میں تمہارے لئے کیا ہو سکتی ہے۔ یہ بتاؤ دہلی میں کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟''

''ہوٹل میں ستنام سنگھ۔''

''میں نے تو تمہیں اپنا پتہ بتایا تھا بھیا جی۔''

''یہاں میں ضروری کام سے آیا تھا اور اسی کی تکمیل میں مصروف تھا۔''

''تمہارا گھر ہے بھیا جی۔ یہاں ہوٹل میں کیوں ٹھہرے؟''

''میں نے کہا نا ایسا ضروری کام تھا کہ ہوٹل میں ٹھہرنا ضروری تھا۔ یہ میرے کزن محمود ہیں۔''

''بڑی خوشی ہوئی جی آپ سے مل کر۔ یہ بھیا جی جو ہیں نا خاقان جمشیدی، بس ان کے بارے میں کچھ پوچھو مت مجھ سے۔ میرے سب کچھ ہیں یہ۔ جان بچائی ہے انہوں نے میری۔ بھیا جی، مجھے معاف کرنا۔ ارے آؤ نا، تھوڑی دیر کے لئے تو گھر چلو۔''

''ستنام! اس وقت مجھے گھر نہ لے جاؤ۔ ایک وعدہ کرتا ہوں تم سے آؤں گا ضرور۔''

''کب بھیا جی؟''

''بہت جلد...... بہت ہی جلد۔''

''بھیا جی، مجھے یہ تو بتا دو اس کا کیا ہوا؟''

''مر گئی سسری۔ ختم ہو گئی۔ رانا جیپال ہی نے اسے زندگی سے محروم کر دیا۔ تمہاری اطلاع کے مطابق وہ وہی کام کرنا چاہتی تھی جو تم نے کہا تھا۔ لیکن بس یہ سمجھ لو کہ خاتمہ ہو گیا اس کا۔''

''شکر ہے بھگوان کا۔ جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا بھیا۔ بڑی خطرناک عورت تھی۔ تو پھر بھیا جی کب آؤ گے؟''

''میں نے کہا نا ستنام......''

''میرے گھر کا پتہ ایک بار پھر لکھ لو۔''

''ہاں ایک بار پھر اپنے گھر کا پتہ مجھے دے دو۔''

پتہ وغیرہ لکھا گیا۔ ستنام کی محبت کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ بیچارہ بہت زیادہ چاہ رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ چلوں لیکن اس وقت ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ابھی تو مجھے فائل بیچ دینے تھے۔ آخر کار ستنام رخصت ہوا۔ محمود نے کہا۔

''بڑا اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔''

''ہاں، تو اب ایسا کرتے ہیں کہ واپس چلتے ہیں۔ ہوٹل جا کر بل وغیرہ چکا دو اور اس کے فوراً بعد ہم لوگ سیتا گڑھی کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام کام کر لئے جائیں، اس کے بعد ذرا سکون حاصل ہو گا۔''

''ٹھیک ہے۔ لیکن بڑا ڈرامہ ہو گا۔ طارق جمشیدی صاحب تو یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان کے ساتھ ایسا ہونے والا ہے۔''

میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

بہر حال پھر میں محمود کے ساتھ واپس آ گیا۔ سارے کے سارے بڑے بے چین تھے میرے لئے۔ پہلے تو میں ماموں حافظ کے پاس گیا اور انہیں ساری صورتحال بتائی۔ میں نے کہا کہ وہ لوگ اس وقت تک منظر عام پر نہیں آئیں گے جب تک میں سارے کام مکمل نہیں کر لوں گا۔ صادق ہادی نے مزید کچھ پروگرام ترتیب دیئے تھے اور انہی پروگراموں کے

تحت باقی سارے کام بھی ہونے تھے۔ حویلی واپس پہنچا تو طارق جمشیدی صاحب فوراً ہی مجھ پر حملہ آور ہو گئے۔

"کہاں غائب ہو گئے تھے تم بھئی۔ کہاں غائب ہو گئے تھے؟ یعنی وہ جو کہتے ہیں کہ ہم نے تو کنوئیں میں بانس ڈلوا دیئے تھے تمہاری تلاش میں بیٹا! بغیر کہے ہوئے ہی چلے گئے۔ تمہیں پتہ ہے ہم کتنے پریشان تھے تمہارے لئے۔"

"پھر میں کسی کنوئیں میں دستیاب نہیں ہوا۔ کالا کنواں بالکل بیکار جگہ ہے۔ میرا خیال ہے اسے بند کرا دیتے ہیں۔ کوئی چیز کسی کام ہی نہ آئے تو اس کے ہونے سے کیا فائدہ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"گئے کہاں تھے، یہ بتاؤ۔"

"کچھ کام تھے چچا صاحب! آپ سے اس سلسلے میں باتیں بھی کرنی تھیں۔"

"کیا کام تھے...... مجھ سے کہے ہوتے۔"

"اصل میں آپ اس قدر بزرگ ہو چکے ہیں کہ اب آپ سے کچھ کام کہتے ہوئے شرمندگی ہوتی ہے۔ یہ تو ہم بچوں کا کام ہے کہ ہم آپ کے کام کریں۔"

"بس بیٹا! بعض لوگوں کی تقدیر میں ذمہ داریاں لکھی جاتی ہیں اور وہ ذمہ داریاں پوری کرتے کرتے ہی مر جاتے ہیں۔"

"یہ تو ہے۔ آج شام کو تمام افراد کو جمع کر لیجئے، سب ساتھ کھانا کھائیں گے۔"

"بدتمیز ہیں سارے کے سارے۔ یہ نہیں جانتے کہ حویلیوں میں رہنے کے آداب کیا ہوتے ہیں۔ کہاں چکروں میں پڑو گے۔"

"چچا صاحب! میں نے آپ سے جو کہا ہے وہ آپ نے سنا۔ تمام لوگوں کو ایک جگہ جمع کر لیجئے، کھانا سب ساتھ کھائیں گے۔" میں نے کرخت لہجے میں کہا اور طارق جمشیدی میری صورت دیکھتے رہ گئے۔ انہوں نے کوئی جواب تو نہیں دیا لیکن شام کو بڑے ہال میں زمینی دستر خوان بچھا دیئے گئے تھے اور حویلی کے سارے افراد جو ایک طرح سے یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ چچا صاحب کی رعایا بن چکے تھے، وہاں پہنچ گئے۔ سارے کے سارے اچھے لوگ تھے، بس حالات کی چکی میں پس رہے تھے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے طور پر گزارہ کر لیا کرتے تھے اور حویلی سے انہیں بہت کم ملتا تھا۔ لیکن بس گزارے والی بات تھی۔ کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میں نے کہا۔

"مجھے معاف کیجئے گا، ہو سکتا ہے آپ لوگوں نے کبھی اس دوران یہ سوچا ہو کہ میں نے آپ پر کوئی توجہ نہیں دی اور بس چند ہی لوگوں میں محدود ہو کر رہ گیا ہوں۔ حالانکہ میرا آپ سب سے برابر کا رشتہ ہے۔ لیکن اس کے لئے میں آپ سے صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں کچھ مصروف تھا۔ طویل عرصے کے بعد وطن واپس آیا۔ کچھ ایسے کام کرنے تھے جو اب میرے لئے ضروری ہو گئے تھے۔ میں نے والد صاحب کے ساتھ سیر و شکار میں زندگی گزاری۔ اس کے بعد جو حالات ہوئے وہ آپ سب کے علم میں ہیں۔ ملک سے باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو میری نگاہوں نے یہاں کا جائزہ لیا۔ بہت سے تجربے کئے میں نے۔ طارق جمشیدی صاحب جو میرے چچا ہیں انہوں نے حویلی کا نظام سنبھال رکھا تھا اور زمینیں اور جائیدادیں انہوں نے اپنی تحویل میں لے لی تھیں حالانکہ انہیں اس بات کا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ زمینوں کی خرید و فروخت کرتے یا ان میں ردو بدل کرتے۔ لیکن انہوں نے چالاکی سے کچھ حکام کو اپنے قبضے میں لے کر یہ عمل بھی کر ڈالا اور لاکھوں روپے خورد برد کئے۔ سارے حسابات میرے علم میں ہیں اور اس خورد برد کے نتیجے میں چچا طارق جمشیدی صاحب اور ان کے دونوں بیٹے کم از کم دس سال کی سزا بھگتنے کے لئے جا سکتے ہیں۔ لیکن طارق صاحب نے اپنے نام کے ساتھ جمشیدی کا نام بھی لگایا ہوا ہے اور اس نام کے حوالے سے میں بالکل پسند نہیں کروں گا کہ یہ جیل کی چکی پیسیں۔ چنانچہ میں انہیں معاف کرتا ہوں۔ ہاں، آج سے آپ تمام لوگوں کے سامنے میں انہیں ان کے خود ساختہ اختیارات سے بے دخل کرتا ہوں۔ تمام لوگ حویلی میں اسی طرح رہیں گے جس طرح رہتے چلے آئے ہیں لیکن طارق جمشیدی صاحب کو اپنی بیگم اور تینوں بچوں کے ساتھ اب سے چند گھنٹے کے اندر اندر اس حویلی سے نکلنا ہو گا۔ اس سلسلے میں، میں نے حکومت سے اختیارات لے لئے ہیں۔ ایس پی حامد علی شاہ صاحب باہر آ چکے ہیں، میں انہیں طلب کرتا ہوں۔ آگے کی ہدایات وہ دیں گے۔"

طارق جمشیدی صاحب، ان کے دونوں صاحبزادے، نعمانہ اور چچی جان پتھرا کر رہ گئے تھے۔ کچھ لمحوں کے بعد طارق جمشیدی نے اپنے آپ کو سنبھالا اور غرائی آواز میں بولے۔

"کس حرام زادے کی مجال ہے کہ مجھے ان تمام اختیارات سے بے دخل کر سکے۔ کل کا لونڈا میرے مقابلے پر آیا ہے۔ ابے تو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو؟ میں نے کچی گولیاں کھیلی ہیں کیا؟"

میں ہنس پڑا۔ میں نے کہا۔ ''آیئے ایس پی صاحب۔ اندر آ جایئے۔'' صادق ہادی صاحب نے ہی یہ انتظام بھی کیا تھا۔ ایس پی حامد علی شاہ وردی میں ملبوس اندر آ گئے۔

''آپ نے سنا ایس پی صاحب؟''

''ہاں سن لیا ہے۔ اچھی طرح سن لیا ہے۔''

''آپ لوگوں کو کچھ اور بتانا بھی ضروری ہے۔ طارق جمشیدی صاحب نے اپنے دونوں صاحبزادوں کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ مجھے قتل کر دیں اور یہ دونوں گدھے مجھے لے کر پالن باغ پہنچ گئے جہاں کالا کنواں نامی ایک جگہ ہے۔ انہوں نے مجھے کالے کنوئیں میں ڈال کر ختم کرنا چاہا لیکن پورے چار گھنٹے میں نے انہیں اس کالے کنوئیں میں الٹا لٹکائے رکھا اور دوبارہ بھی ایسا ہی کر سکتا ہوں، یہ بات یہ لوگ جانتے ہیں۔ بہرحال چھوڑیئے۔ اس کے بعد طارق جمشیدی صاحب نے اور بھی بہت سی کارروائیاں کیں جن کا ابھی تذکرہ نہیں کرنا چاہتا۔ ایس صاحب! آپ ان کی دھمکی کو سن چکے ہیں۔ آپ کو تمام تفصیلات کا علم ہے۔ کم از کم تین مہینے تک انہیں لاک اپ میں رکھئے تاکہ ان کے ہوش و حواس ٹھکانے آ جائیں۔ اس کے بعد میں آپ سے رابطہ کر کے ان کے بارے میں بات کروں گا۔''

ایس پی صاحب نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا اور طارق جمشیدی صاحب کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ ان کے دونوں بیٹوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ چچی جان چیخ مار کر بے ہوش ہو گئیں۔ نغمانہ ایک دیوار سے لگی پتھرائی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ سارا کھیل ہی غلط ہو گیا تھا۔ لیکن میں نے یہ بات محسوس کی تھی کہ حویلی والوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے تھے۔ طارق جمشیدی صاحب اگر دھمکیوں بھری بات نہ کرتے تو شاید میں ان کے ساتھ یہ سلوک نہ کرتا۔ لیکن بہرحال پولیس انہیں لے کر چلی گئی۔ حویلی کے تمام مکینوں پر سکوت طاری تھا۔ تب میں نے آگے بات کی۔

''طارق جمشیدی صاحب سے آپ لوگوں کو نجات مل چکی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ انہوں نے کس کس طرح آپ لوگوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ آپ سب بالکل بے فکری سے یہاں رہیں، میں وہی کچھ کروں گا جو میرے والد کی زندگی میں ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ حویلی میری نہیں، آپ سب کی ہے۔ یہ طارق جمشیدی صاحب کی بھی ہوتی اگر وہ اس طرح اس پر غاصبانہ قبضہ نہ جما لیتے۔ ایک چھوٹی سی اطلاع آپ کو اور دینی ہے، حویلی کے متولی، جائیداد اور زمین کے مکمل طور پر نگران اب ماموں حافظ ہوں گے۔ آپ سب کو

ان سے تعاون کرنا ہوگا۔ یہ ساری کارروائیاں میں کر چکا ہوں۔''

حویلی کے مکینوں نے ماموں حافظ کے اس منصب پر انتہائی خوشی کا اظہار کیا تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ سب ماموں حافظ سے خوش ہیں اور ان کے اس منصب پر کسی کو ذرہ برابر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

چچی جان اور نغمانہ ابھی حویلی میں ہی تھیں۔ نغمانہ نے جب دوبارہ مجھ سے ملاقات کی تو میں نے اسے بہت محبت سے خوش آمدید کہا اور پیچھے سے چچی جان بھی آ گئیں۔ انہوں نے دوڑ کر میرے پاؤں پکڑ لئے تھے۔ وہ کہنے لگیں۔

''نہیں بیٹا! یہ مت کرو۔ ہمارے ساتھ ایسا مت کرو۔''

''آپ اٹھئے چچی جان! جس طرح اس حویلی کے تمام افراد میرے لئے قابل احترام ہیں، آپ بھی ان سے کم نہیں ہیں۔ لیکن آپ خود دیکھ لیجئے، جو باتیں ہیں وہ آپ کے علم میں بھی ہیں اور میں جانتا ہوں چچی جان کہ آپ بھی اس کی شریک ہیں۔''

''ہاں بیٹا، ہم شریک تھے۔ ظاہر ہے انسان جب برائی پر آمادہ ہوتا ہے یا پھر اگر تم تسلیم کرو تو یہ سمجھ لو کہ ہم تو تھے ہی ان کے رحم و کرم پر۔ جو وہ چاہتے تھے وہی ہمیں بھی کرنا ہوتا تھا۔''

''بالکل ٹھیک چچی جان! آپ سے ایک عرض اور کروں، نغمانہ جس انداز میں میری جانب بڑھی، میں نے اس انداز کی کبھی پذیرائی نہیں کی۔ وہ میرے لئے ایک بہن کی مانند ہی ہے اور میں نے اسے بہن ہی سمجھا ہے۔ بہرحال ہو سکتا ہے چچا طارق کو ہوش آ جائے۔ یہ تو میں نے ان کے لئے عارضی بندوبست کیا ہے۔ میں ان کا خیال رکھوں گا۔ بلکہ آپ چاہیں تو میں آپ کو بھی بھیج سکتا ہوں ان کے پاس۔ آپ اندازہ لگا لیجئے، حویلی میں، میں آپ لوگوں کو نہیں رکھوں گا۔ اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ کیونکہ حویلی والے آپ کو اپنے درمیان پسند نہیں کرتے۔ ہاں آپ کی رہائش گاہ اور آپ کے اخراجات کا انتظام میں کر دوں گا۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھئے اس کے بعد اگر کوئی سازش کرنے کی کوشش کی گئی تو آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ دوبارہ کسی قسم کی رعایت مجھ سے نہیں لیں گی۔''

''نہیں لوں گی بیٹا، نہیں لوں گی۔'' چچی جان نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر چچا صاحب کو پولیس کی تحویل سے نکال کر شالی سیتا گڑھی والے گھر میں پہنچا دیا جائے گا۔ آپ لوگوں کے لئے میں بندوبست کئے دیتا

ہوں۔"

چچی جان نے میرا شکریہ ادا کیا تھا۔

※☆※

حویلی کے تقریباً تمام ہی معاملات درست ہو گئے تھے۔ کافی دن تک میں یہاں کے انتظامی امور سنبھالتا رہا اور ماموں حافظ اور محمود اور ایاز کو سمجھاتا رہا۔ اس دوران طارق چچا کو پولیس کے چنگل سے رہائی دلا دی تھی۔ وہ خاصے سدھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ادھر شاہنواز اور احمد جو صحیح معنوں میں بدمعاش نہیں تھے بلکہ طارق چچا نے زبردستی انہیں بدمعاش بنا دیا تھا تاکہ حویلی والوں پر رعب قائم کریں، وہ بھی اوقات میں آ گئے تھے۔ چھتیس بار آ آ کر مجھ سے معافی مانگی تھی۔ اور بہرحال دشمنی تو میری کسی سے بھی نہیں تھی۔ یہی تو میرا اپنا خاندان تھا۔

پھر دل چاہا کہ ستنام سنگھ سے ملاقات کروں اور دل کی یہ چاہت بے مقصد نہیں تھی۔

میں ستنام کے گھر پہنچ گیا۔ خوشی سے دیوانہ ہو گیا تھا ستنام۔ اس کے پتا جی گرنام سنگھ اس سے بھی زیادہ خوش اخلاق تھے۔ حالانکہ ہندو گھرانہ تھا اور وہ جانتے تھے کہ میں مسلمان ہوں لیکن گھر کا ایک ایک فرد مجھ سے اس طرح گھل مل گیا جیسے میں ان کا بہت ہی قریبی رشتے دار ہوں۔ ستنام کی دونوں بہنیں کشوری اور پشپا ہنستی مسکراتی میرے پاس آ گئی تھیں اور مجھ سے ایک لمحے کے اندر بے تکلف ہو گئی تھیں۔ رات کو کھانے پر بھی بہت اچھا بندوبست کیا گیا تھا۔ ستنام سنگھ نے میرے لئے باقاعدہ تیتر پکوائے تھے۔ باقی لوگ گوشت نہیں کھاتے تھے لیکن ایک ہی میز پر سارا بندوبست کیا گیا تھا۔ پھر اسی میز پر ایک اور شخصیت داخل ہوئی جسے دیکھ کر میں سکتے میں رہ گیا...... مجھ پر صحیح معنوں میں ایسا شدید حملہ ہوا تھا کہ میرے ہوش و حواس گم ہو گئے تھے۔ یہ کلاڈیا تھی۔ ایک خوبصورت سوٹ میں ملبوس مدھم مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ اندر آئی تھی۔ گرنام سنگھ جی نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ رخسار ہے میری تیسری بیٹی۔ مسلمان لڑکی ہے۔ آؤ بیٹا، بیٹھ جاؤ۔"

کلاڈیا کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ میں اس کا یہ نیا روپ دیکھ رہا تھا۔ پتہ نہیں ان لوگوں نے میری یہ کیفیت محسوس کی تھی یا نہیں۔ لیکن کیا کھانا کھایا، کیا کچھ کہا، بس لمحے گزرے تھے۔ کھانے کے بعد کلاڈیا، کشوری اور پشپا کے ساتھ واپس چلی گئی۔ ستنام سنگھ مجھ سے باتیں کرتا ہوا اس کمرے میں آ گیا جو میرے لئے تیار کرایا گیا تھا۔

"اب پندرہ دن سے پہلے دِلّی سے نہیں جانے دوں گا۔ پوری دِلّی کی سیر کرانی ہے تمہیں۔ ایک بات بتاؤں یار، بے تکلفی کی معافی چاہتا ہوں، کچھ عجیب سی کیفیت ہو گئی ہے تمہاری۔ الجھے الجھے سے گھبرائے گھبرائے سے۔"

"ہاں ستنام، میں اُلجھ گیا ہوں۔ گھبرا گیا ہوں۔ تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ لیکن دوسرا لمحہ میرے لئے مزید حیرت کا باعث تھا۔ دروازہ بند نہیں تھا، ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ ہوئی، اس کے بعد دروازہ کھلا اور کلاڈیا مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔

"ہاں ستنام بھیا! ان پر جو کیفیت طاری ہوئی ہے وہ غلط نہیں ہے۔ ہم اسی کو تقدیر کہتے ہیں۔ میں ایک صاف ستھری طبیعت کی مالک لڑکی ہوں۔ جو صورتحال ہے، میں بتا دینا چاہتی ہوں۔ میں نے پتا جی کو بھی یہاں آنے کے لئے کہا ہے اور ماتا جی کو بھی۔ پشپا اور کشوری بھی آ رہی ہیں۔ سب کے سامنے میں صورتحال بتاؤں گی کیونکہ یہ انتہائی اہم مسئلہ ہے۔"

میں ایک بار پھر سکتے میں رہ گیا تھا۔ میری نگاہیں کلاڈیا پر جمی ہوئی تھیں۔ آج پہلی بار وہ مجھے اس قدر حسین نظر آئی تھی کہ صحیح معنوں میں میری پلکیں ہی جھپکنا بھول گئی تھیں۔ اس کے کہنے کے مطابق سب آ گئے تو کلاڈیا نے کہا۔

"پتا جی! اب آپ ہی میرے پتا جی اور ماتا جی ہی میری ماتا جی ہیں۔ میں آپ کو ایک اہم صورتحال بتانا چاہتی ہوں، خاصی پرانی بات ہے جب خاقان جمشیدی صاحب کلکتہ میں تعلیم حاصل کرنے آئے۔ یہ بات تو آپ کو معلوم ہے کہ میرے والد کرنل صغیر احمد نے ایک انگریز عورت سے شادی کی تھی جو میری ماں تھی، انہوں نے قبول اسلام نہیں کیا تھا۔ میں نے بھی نہیں کیا تھا کیونکہ میری ماں کی شرط تھی کہ میرے والد اور والدہ اپنے اپنے مذہبوں پر رہیں گے۔ پھر ہمارا واسطہ ایک بزرگ سے پڑا جو دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ہمیں ملے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی تحویل میں لے لیا اور انہوں نے ہی میرا مذہب تبدیل کر دیا اور مجھے مسلمان کر لیا۔ اس کے بعد وہ مجھے پراسرار علوم سکھانے لگے۔ انہوں نے مجھے ایسے وظائف بتائے جن کی مدد سے میں اپنے بے شمار مقاصد حاصل کر سکتی تھی۔ اس دوران معافی چاہتی ہوں، خاقان جمشیدی میرے سامنے آئے۔ میں ایک نوعمر اور کچے ذہن کی مالک لڑکی تھی۔ یہ میرے دل و دماغ میں اتر گئے۔ میں ان سے محبت کرنے لگی۔ میرے تمام علوم ان کے لئے وقف ہو گئے اور اس کے بعد میں نے جو کچھ سیکھا تھا وہ ان پر صرف کرتی چلی گئی۔ یہ جہاں بھی مشکل میں پڑے، جس حد تک مجھ سے ممکن ہو سکا، میں نے ان کی مدد کی اور اس

کے لئے مجھے اپنے علوم کا سہارا لے کر نجانے کہاں کہاں جانا پڑا۔ خاقان جمشیدی صاحب! اس کے بعد میں واپس آ گئی۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ گرنام سنگھ جی میرے والد کے بچپن کے دوستوں میں سے تھے۔ پشپا اور کشوری میرے ساتھ پڑھتی رہی تھیں۔ والد کے انتقال کے بعد میرا سرپرست اور کوئی نہ رہا تو گرنام سنگھ جی مجھے اپنے ساتھ لے آئے اور اب میں انہی کے ساتھ رہتی ہوں۔ یہ ہے ساری صورتحال۔ آپ لوگوں کو بلاوجہ کسی حیرت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی، سو میں نے یہ داستان آپ کے سامنے سنا دی۔ خاقان جمشیدی صاحب! معافی چاہتی ہوں، آپ کو بہت بار میری وجہ سے اُلجھنوں میں پھنسنا پڑا ہو گا۔''

یہ کہہ کر کلاڈیا اٹھی اور باہر نکل گئی۔ سب کے سب سکتے کی سی کیفیت کا شکار تھے۔ ستنام سنگھ نے مجھے دیکھا، مسکرایا اور پھر ہنس پڑا۔ کشوری اور پشپا بھی خوب دل کھول کر ہنس رہی تھیں۔ میں نے حیرت سے کہا۔

''ارے تم لوگ ہنس کیوں رہے ہو بھئی؟''

''ایک منٹ...... ایک منٹ بیٹا! ایک موقع آ گیا ہے۔ بہت بار میں نے سوچا کہ تم نے میرے بیٹے ستنام سنگھ کی زندگی بچائی ہے، میں تمہیں اس کا کیا صلہ دے سکوں گا۔ لیکن بھگوان نے میرے لئے یہ موقع فراہم کر دیا ہے۔ بیٹا، اب کہیں نہیں جا سکتے۔ جو اتنے عرصے سے تم سے محبت کر رہی ہے، تم اس کا حق بنتے ہو۔ بیٹا! ایک بات بتاؤ، بتاؤ گے اپنے زبردستی کے چاچا کو؟''

''نہیں چاچا جی! آپ میرے زبردستی کے چاچا کہاں ہیں، آپ تو میرے سچ مچ کے چاچا ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر میری ایک بات مان لو۔ وہ اپنے منہ سے کہہ چکی ہے کہ کب سے اس نے تمہیں اپنے جیون میں شامل کر لیا ہے۔ تم اسے اپنے جیون میں شامل کر لو۔''

میں نے مسکراتے ہوئے گرنام سنگھ جی کو دیکھا اور کہا۔

''جو آپ کا حکم چاچا جی۔''

(ختم شد)